خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
مئی 2013
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری
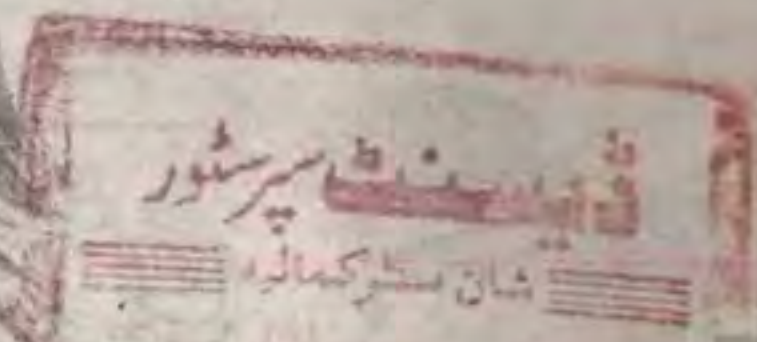
پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ایک بار پھر وقت نے فیصلے کی زمام ہمیں سونپ دی ہے۔ حالات ہمارے سامنے ہیں۔ وطن عزیز اور خصوصاً کراچی تو پچھلے دو عشروں سے بھڑکتے شعلوں کی زد میں ہے۔ ان حالات کو ہم بدل نہیں سکتے تو کم از کم بدلنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ خالق کائنات کے پاس ہر خیر و شر کا حساب موجود ہے اور روز حساب بھی مقرر ہے۔ بات صرف حسن نیت اور ہمارے امتحان کی ہے کہ خیر و شر کی جنگ میں ہم کہاں تھے۔ اہل حق کے ساتھ یا صف باطل میں۔

ہر تعصب سے بالاتر ہو کر باعمل، باکردار، دیانت دار قیادت کا انتخاب ہی ہماری اور ہمارے ملک کے بقا کی ضمانت ہے۔

محمود ریاض صاحب،

جانے والے اپنی یادیں اور محبتیں چھوڑ کر لمبے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ 9 اور 10 مئی کی درمیانی شب تھی جب ریاض صاحب اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ جو دنیا میں آتے ہیں، ان کا جانا اٹل ہے۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اپنی ذات سے وابستہ عزیز ترین ہستیوں کی جدائی سہنا آسان امر نہیں۔ زندگی کا کارواں چلتا رہتا ہے لیکن اپنے پیچھے جو خلاء چھوڑ جاتے ہیں وہ کبھی پر نہیں ہوتا اور یہ ہستی محمود ریاض جیسی مشفق اور محترم شخصیت کی ہو تو دکھ اور بھی سوا ہو جاتا ہے۔ اپنی ذات میں ایک ادارہ۔ سب کا خیال رکھنے والے پُرخلوص اور مہربان —— ایک طرف ان کی ذہانت مسلم تھی تو دوسری طرف بہت سے دنیاوی معاملات میں وہ بہت سادہ تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر انتہائی سادہ دل اور مخلص انسان تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جانے والے۔ دوسروں کی خوبیوں کو سراہنے والے، اچھے شعر اور اچھے جملے سے گھنٹوں محظوظ ہوتے۔ خود بھی بلا کے بذلہ سنج تھے۔ انشا جی کے بعد بیٹوں کی دائمی جدائی بہت بڑا سانحہ تھا۔ لیکن انہوں نے انتہائی صبر و برداشت کا مظاہرہ کیا۔ دل پر جو بھی گزری ہو، کبھی فرائض سے پہلوتہی نہ کی۔ اپنی ذمہ داریوں کو اسی طرح نبھاتے رہے۔ اپنے گھر والوں، اپنے متعلقین، اپنے دوست احباب کے لیے ہی نہیں، دفتر کے ہر فرد کے لیے ان کی حیثیت ایک شجر سایہ دار کی سی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ، کرن اور پھر شعاع تینوں پرچے ان کی صاف ستھری سوچ اور فکر کے عکاس ہیں۔

آج ہماری بے شمار قارئین اعتراف کرتی ہیں کہ ان کی شخصیت کی مثبت تعمیر میں ان پرچوں کا بہت بڑا کردار ہے۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- زمین کے آنسو۔ نگہت سیما کا مکمل ناول تکمیل کے مراحل میں،
- ہم سادہ ہی ایسے تھے۔ نزہت شبانہ حیدر کا مکمل ناول،
- بشریٰ احمد، راشدہ رفعت اور آمنہ ریاض کے ناولٹ،
- سیرا حمید، سدرۃ المنتہیٰ، فرحین اظفر اور سادہ ادریس کے افسانے،
- باتیں فیضان خواجہ سے، ، اسماء عباس سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خاموشی کو بیاں ملے، شادی مبارک ہو، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

ہمارا انتخاب آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں خط لکھ کر بتائیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

زیادہ اجر

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک لونڈی آزاد کر دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کی) اجازت نہیں لی۔ چنانچہ جب وہ دن ہوا جو ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کا دن تھا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے) تو انہوں نے کہا۔

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ نے محسوس کیا کہ میں نے اپنی لونڈی آزاد کر دی ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا (واقعی) تو نے ایسا کیا ہے؟"

انہوں نے کہا "ہاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تو وہ اپنے ماموؤں کو دے دیتی تو تیرے لیے زیادہ اجر کا باعث ہوتا۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ عورت کو اپنی مملوکہ چیز میں خاوند کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حق حاصل ہے جب کہ خاوند کی زیر ملکیت چیزوں میں اسے یہ حق نہیں۔

2۔ ضرورت مند رشتے دار پر صدقہ کرنا، غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ فضیلت والا عمل ہے کیونکہ آزادی صرف صدقہ ہے جب کہ قرابت دار کو صدقہ دینے میں صدقے کے ثواب کے ساتھ صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا۔

مشرک رشتہ دار

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میری ماں جب کہ وہ ابھی مشرکہ تھیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان ہونے والے معاہدہ حدیبیہ کے دوران) میرے پاس آئیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور مجھ سے حسن سلوک کی خواہش مند ہیں۔ کیا میں (ان کی خواہش کے مطابق) اپنی والدہ سے صلہ رحمی کروں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں، تم اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : یہ مکے سے مدینہ آئی تھیں۔ ان کا نام بعض نے قتیلہ بنت عبدالعزیٰ اور بعض نے قیلہ بیان کیا ہے۔

"معلوم ہوا کہ والدین مشرک و کافر ہوں، تب بھی ان کی خدمت اور ان سے حسن سلوک کرنا ضروری ہے، جیسے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے۔ دنیا کے کاموں میں اچھی طرح ان کا ساتھ دینا۔"

دوگنا اجر

حضرت عبداللہ بن مسعود کی اہلیہ سیدہ زینب ثقفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (عورتوں کو) وعظ فرمایا اور (اس میں) فرمایا۔

"اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ کیا کرو، چاہے تمہیں اپنے زیورات ہی میں سے کرنا پڑے۔"

حضرت زینب بیان کرتی ہیں کہ میں (اپنے خاوند) عبداللہ بن مسعود کے پاس لوٹ کر آئی اور ان سے کہا کہ "تم تھوڑی کمائی کرنے والے آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کی ترغیب دی ہے، تو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ وہ صدقہ (اگر میں تمہیں دے دوں تو) کیا وہ مجھ سے کفایت کر جائے گا، ورنہ پھر میں وہ تمہارے علاوہ کسی اور کو دے دوں۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا۔ "بلکہ تو خود ہی جا۔"

چنانچہ میں گئی تو وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ایک اور انصاری عورت بھی (کھڑی) تھی۔ میری ضرورت بھی وہی تھی جو اس کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے رعب و دبدبہ عطا کیا گیا تھا (جس کی وجہ سے ہم میں سے کسی کو اندر جانے کی جرأت نہ ہوئی) اتنے میں بلال رضی اللہ عنہ باہر نکلے۔ ہم نے ان سے کہا۔

"تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر بتلاؤ کہ دروازے پر دو عورتیں (کھڑی) ہیں اور یہ مسئلہ پوچھتی ہیں کہ اگر وہ اپنے خاوندوں پر اور ان کی گودوں میں زیر پرورش یتیموں پر صدقہ کریں تو کیا وہ (شرعاً) کافی ہو جائے گا؟ (لیکن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مت بتلانا کہ ہم کون ہیں۔"

چنانچہ بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے گئے اور جا کر آپ سے مسئلہ پوچھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ دو عورتیں کون (کون) ہیں؟"

حضرت بلال نے کہا "ایک انصاری عورت ہے اور دوسری زینب۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "کون سی زینب؟"

انہوں نے کہا۔ "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہا کی اہلیہ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(انہیں جا کر بتلا دو کہ) ان کے لیے دوگنا اجر ہے، ایک رشتے داری کا اجر اور دوسرا صدقے کا اجر۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ معلوم ہوا کہ عورت اپنے خاوند کو صدقہ اور زکوٰۃ کی رقم بھی دے سکتی ہے، اگر وہ غریب ہو، البتہ خاوند اپنی عورت کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ عورت کے نان و نفقہ کا وہ خود ذمہ دار ہے جب کہ عورت خاوند کی کفیل نہیں۔ گویا اصول یہ ہوا کہ زکوٰۃ دینے والے پر جن کا نان نفقہ واجب ہے، ان کو وہ زکوٰۃ کی رقم نہیں دے سکتا، جیسے انسان کی بیوی ہے، بچے ہیں اور والدین ہیں۔

2۔ بوقت ضرورت عورت، ستر و حجاب کی پابندی کے ساتھ گھر سے باہر جا سکتی ہے۔

3۔ دینی مسائل و معاملات میں عورتوں کو بھی، مردوں کی طرح دلچسپی لینی چاہیے اور اس میں شرم و حجاب مانع نہیں ہونا چاہیے۔

ذمہ اور رشتہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم عنقریب ایسا علاقہ فتح کرو گے جس میں قیراط کا ذکر ہوتا ہے۔"

اور ایک روایت میں ہے "تم عنقریب مصر فتح کرو گے اور یہ ایسی سرزمین ہے جس میں قیراط کا لفظ عام بولا جاتا ہے۔ چنانچہ تم اس کے باشندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، اس لیے کہ ان کا (ہمارے ساتھ) ذمہ اور رشتہ ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے "جب تم اسے فتح کر لو تو اس کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اس لیے کہ ان کے لیے ذمہ اور رشتہ ہے۔" یا فرمایا "ذمہ اور سسرالی تعلق ہے۔" (مسلم)

علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ ان کا وہ رشتہ جس کا حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، وہ حضرت اسماعیل کی والدہ ہاجرہ علیہ السلام کا ان میں سے ہونا ہے اور سسرالی تعلق کا مطلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کا ان میں سے ہونا ہے۔

فوائد :

1۔ قیراط، دینار و درہم کی طرح ایک سکہ اور ان کا ایک جز تھا۔ دانق، درہم کے چھٹے حصے کو کہا جاتا ہے۔ قیراط، دانق کا نصف ہے۔ مصر میں اس کا استعمال عام اور بول چال میں بھی اس کا چلن تھا۔

2۔ ذمہ، یہاں ذمام (حق و حرمت) کے معنی میں ہے۔ اس میں رحم اور سسرالی تعلق کی بنا پر اہل مصر سے حسن سلوک کی تاکید ہے، اس لیے اسے صلہ رحمی کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

3۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ نے جس طرح پیش گوئی فرمائی، اس طرح ہی ہوا اور آپ کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد ہی مصر پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

قرابت داری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت (ترجمہ)

"اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرائیے۔"

نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بلایا۔ چنانچہ ان کے عام و خاص سب جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے بنو عبد شمس! اے بنو کعب بن لوی! اپنے نفسوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب! اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف! اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم! اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے نفس کو آگ سے بچا، اس لیے کہ میں تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے ساتھ (میری) رشتے داری ہے جسے میں (دنیا کی حد تک) ضرور ملحوظ رکھوں گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ معلوم ہوا کہ قیامت والے دن حسب نسب کام نہیں آئے گا حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری بھی نفع نہیں دے گی۔ وہاں صرف ایمان اور عمل صالح کی بنیاد ہی پر نجات ہو گی۔ جن کے حق میں شفاعت کی اجازت ہو گی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صالحین جن کے لیے شفاعت کریں گے، وہ بھی گناہ گار اہل ایمان ہی ہوں گے نہ کہ ایمان و عمل صالح سے محروم کافر و مشرک۔ ان کے لیے نجات ہو گی نہ شفاعت۔

2۔ دعوت و تبلیغ کے اولین مستحق اپنے قریبی رشتے

دار ہیں۔ پہلے انہیں اللہ کے احکام پہنچائے جائیں۔
3۔ رشتے دار کافر و مشرک ہوں تب بھی رشتے داری کے حقوق اور صلہ رحمی کے تقاضے پورے کیے جائیں اور اس کا اولین حق اور اہم تر تقاضا یہ ہے کہ انہیں ایمانی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی جائے تاکہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار

حضرت ابو عبداللہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ فرماتے ہوئے سنا خفیہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

"بے شک بنی فلاں کی اولاد' میرے دوست نہیں ہیں' میرے دوست تو اللہ اور نیک مومن ہیں' البتہ ان سے میری رشتے داری ہے جسے میں ضرور ملحوظ رکھتا ہوں۔" (بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں)

فائدہ : حدیث میں بنی فلاں کی آل (اولاد) سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ قریبی رشتے دار ہیں جو ایمان نہیں لائے تھے۔ آپ نے وضاحت فرمادی کہ گو ان سے میری قرابت قریبہ ہے لیکن ان سے میری محبت و ولایت (دوستی) نہیں ہے کیونکہ کافر اور مومن کے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی۔ ولایت (دوستی اور محبت) کا یہ تعلق تو صرف اللہ اور اس کے بعد اللہ پر ایمان لانے والے اہل ایمان کے مابین ہی ہو سکتا ہے البتہ قرابت دار سے (بشرطیکہ وہ محارب نہ ہوں) صلہ رحمی ہو سکتی ہے۔

بہترین عمل

حضرت ابو ایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتلایئے جو مجھے جنت میں داخل اور جہنم سے دور کردے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ' نماز قائم کرو' زکوۃ دو اور صلہ رحمی کرو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حصول جنت اور جہنم سے بچنے کی حرص کا پتا چلتا ہے' نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے خود ساختہ چلوں اور وظائف کا سہارا لینے کی بجائے اہل علم سے حصول جنت کا راستہ پوچھنا چاہیے اور مسلمان کو ہر عمل علی وجہ البصیرت کرنا چاہیے۔
2۔ اس حدیث میں حج اور روزوں کا ذکر نہیں ہے حالانکہ یہ ارکان اسلام میں سے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ارکان اسلام بیان کرنا مقصود نہیں تھا کیونکہ وہ شخص مسلمان تھا' نیز حج کیونکہ زندگی میں استطاعت کے بعد ایک بار فرض ہے اور روزے بھی سال بعد آتے ہیں' اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا تاکہ سائل کو بات مختصر ہونے کی بنا پر یاد رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ سائل کے حالات و ظروف کے مطابق جواب دیتے تھے جیسا کہ آپ سے ثابت ہے کہ یہی سوال کرنے والے کئی دوسرے افراد کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مختلف جوابات دیے۔
3۔ اس میں ان اعمال کی نشان دہی کردی گئی ہے جو جنت میں جانے اور جہنم سے نجات پانے کا سبب ہیں جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جنت محض آرزوؤں اور تمناؤں سے یا ایمان و عمل کے بغیر کسی سفارش سے نہیں ملے گی۔

والدین کی اطاعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ (لیکن میرے والد) عمر رضی اللہ ؑ اسے ناپسند کرتے تھے' چنانچہ انہوں نے مجھ سے کہا "اسے طلاق دے دے۔" میں نے انکار کیا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

اور ان سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"اسے طلاق دے دے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اگر والدین کا حکم طلاق' دینی و اخلاقی بنیادوں پر ہو تو اس کی اطاعت ضروری ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ اگر اس کے اسباب کچھ اور ہوں تو پھر والدین کو ادب و احترام سے سمجھایا جائے تاکہ وہ بھی راضی ہو جائیں اور خواہ مخواہ عورت پر بھی ظلم نہ ہو۔
2۔ اولاد اگر نافرمانی کرے تو والدین حاکم وقت سے شکایت کرسکتے ہیں اور حاکم وقت کی بھی ذمہ داری ہے کہ اگر والدین کی شکایت حقیقت پر مبنی ہو تو حکماً اس پر عمل کروائے۔
3۔ اس روایت کے بعض طرق میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر والدین ظلم کریں تو ان کی شکایت بھی حاکم سے کی جا سکتی ہے اور یہ ادب کے منافی یا نافرمانی کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

ماں کا احترام

حضرت ابودردا رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور ان سے عرض کیا کہ میری ایک بیوی ہے' میری ماں مجھے اسے طلاق دینے کا حکم دیتی ہے (میں کیا کروں)؟

حضرت ابو اوردا ءؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "والد جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے۔ چنانچہ اگر تو چاہے تو اس دروازے کو ضائع کردے یا اس کی حفاظت کر۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ والد کے لغوی معنی ہیں' جننے والا' اس اعتبار سے اس کا اطلاق ماں اور باپ دونوں پر ہوتا ہے اور جس طرح والدین (بصیغہ' تثنیہ) سے مراد ماں باپ دونوں ہوتے ہیں' والد کا اطلاق بھی دونوں پر ہوجاتا ہے۔
2۔ اس میں بھی بیوی کی محبت پر والدین کی اطاعت و رضامندی کو ترجیح دینے کی تاکید ہے۔
3۔ گھریلو معاملات اگر پیچیدہ ہو جائیں تو کسی صاحب علم اور دانا آدمی سے مشورہ کرلینا چاہیے۔
4۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہہ نے اسے طلاق دینے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ معاملہ اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس سے والدہ کو اذیت ہوگی اور وہ ناراض ہوجائے گی تو پھر طلاق دے دے یا پھر کسی اور طریقے سے والدہ کو راضی کرلے۔

کچھ ٹکٹ کے، کچھ امیدوار

انشاء جی

ہم نے اس روز ریلوے کے ریٹائرڈ گارڈ میر دلدار علی سندیلوی کا ذکر کیا تھا۔ جن کو صوبائی اسمبلی کے لیے کسی اور پارٹی کا ٹکٹ نہ ملا تو ریلوے کے ٹکٹ پر ہی کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ غالباً "ریٹرن ٹکٹ ہو گا۔ جس میں فائدہ یہ ہے کہ آدمی اور کچھ نہیں تو اپنے گھر تو واپس آسکتا ہے۔ دوسرے ٹکٹ والوں کا تو یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات نہ گھر کے رہتے ہیں' نہ گھاٹ کے۔ پروگرام میر صاحب قبلہ کا یہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں گے۔ میر صاحب کے طویل تجربے کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی کریں گے۔ لیکن انہیں کچھ اور چوکسی اور مستعدی دکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتے کرتے خود اتنے لیٹ ہو جائیں کہ ؏

گاڑی نکل چکی ہو۔ پٹڑی چمک رہی ہو

میر صاحب مذکور کی الیکشن مہم آج کل چھکا چھک جا رہی ہے۔ تقریر میں ایسا فراٹا بھرتے ہیں کہ بڑے بڑے جنکشن منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بیچ میں فقط ایک آدھ جگہ رکتے ہیں۔ وہ بھی پانی لینے۔ یعنی پانی پینے کے لیے۔ ان کی ایک آدھ تقریر ہم نے بھی سنی ہے۔ فرمایا آپ نے۔

"حضرات! یہ دنیا مسافر خانہ ہے۔ ہم سب یہاں پسنجر کے موافق ہیں۔ بس جتنے دن زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ محبت اور اخوت کا سگنل ڈاؤن رکھنا چاہیے اور نفرت و عناد کو ہمیشہ لال جھنڈی دکھانی چاہیے۔"

غریب اور امیر کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب نے کہا کہ "اس وقت ہمارے معاشرے میں بڑی ابتری ہے۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے لوگ تو عیش کی سیٹیاں بجاتے ہیں۔ ہم انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس لوگ جوتیاں چٹخاتے ہیں۔"

حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ میر صاحب ترنت بولے۔

"اسلام خطرے میں نہیں ہے۔ بار بار خطرے کی زنجیر مت کھینچو۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔ جرمانہ دینا پڑے گا۔"

ریلوے کا سنا تو ایک صاحب پی آئی اے کے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے۔ آج کل اس قسم کی تقریریں کر رہے ہیں۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اسلام علیکم کیپٹن فلک آپ کو الیکشنی پرواز 1970ء پر خوش آمدید کہتا ہے۔ اپنے حفاظتی بند باندھ لیجیے اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کیجیے۔ ہم پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اور خیالی پلاؤ کھاتے ہوئے ان شاء اللہ مہینہ بھر میں اسمبلی چیمبر میں جا اتریں گے۔ راستے میں داہنی طرف اچھرہ کا موڑ آئے گا اور بائیں ہاتھ لاڑکانہ کے بھیلوں کے جھنڈ پڑیں گے۔ ہم ان کو بے نیازانہ دیکھتے ہوئے گزریں گے۔ امید ہے کہ آپ کا سفر خوش گوار گزرے گا۔ دھنیہ باد' شکریہ' تھینک یو۔"

ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کرنا ایسا آسان نہیں ریلوے کی کھڑکی پر بھی رش ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارے کرم فرما خان بنارس خان نے لانڈھی سے اومنی بس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا پسند کیا ہے۔ انہوں نے الیکشن کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے اپنے کارکنوں کو اشارہ کیا ہے کہ جانے دو استاد۔ اپنی تقریر کا آغاز وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شعر سے کرتے ہیں۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

ان کا نعرہ ہے کہ "ہارن دے کر پاس کریں" اور تقریر کا انداز یہ ہے۔

"بائیو۔ اوپر جاؤ۔ پائیدانوں پر مت کھڑے ہو۔ پاکٹ سے ہوشیار۔ آج کل ووٹ کترے بہت ہو گئے ہیں۔ ہاں تو بائیو ہم تم کو سیٹ پر بٹھاؤ۔ ام تم کو سیٹ پر بٹھائے گا۔ کسی کو کھڑا نہیں رکھے گا۔ ہمارے ہاں پارٹیاں بہت ہیں۔ لیکن سب دھواں چھوڑ رہی ہیں۔ سب کے ٹائی راڈ کھلنے والے ہیں۔ امیدواروں میں کسی کا بریک فیل ہے۔ جوں شروع کرتا ہے تو رکتے رکتے بھی آدھ گھنٹہ اور لگا دیتا ہے۔ کسی کی باڈی پرانی ہے۔ بعضوں کے تو سائلنسر بھی کام نہیں کرتے۔ جیسے ہمارے اوکاڑے والے مولوی صاحب کے۔ پس ام کو ووٹ دو۔ ارے! اٹھ کر کدھر جاتا ہے۔ ابھی ہمارا تقریر کہاں ختم ہوا ہے۔

ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہیے
جب کھڑی ہو جائے گاڑی تب اترنا چاہیے۔"

اتفاق سے ایک ٹکٹ ڈاک کا بھی ہوتا ہے۔ بابو محمد دین سابق پوسٹ ماسٹر کو اسی پر کھڑے ہونے میں سہولت نظر آئی۔ ان کی تقریر بھی ہم نے سنی ہے۔

"محترم حضرات! السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ آپ سب کو ہمارا درجہ بدرجہ سلام پہنچے۔ ہمارے تھیلے میں باتیں تو بہت ہیں۔ لیکن شارٹ کر کے فقط چند ایک آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ یہ جتنے امیدوار ہیں' سب کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی باتیں محض لفافہ ہیں۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ کسی کا پتا نہیں کہ کب بیرنگ ہو جائے یا پوری قوم کو ڈیڈ لیٹر آفس میں دھکیل دے۔ ووٹر حضرات سے التماس ہے کہ میرے خط کو تار سمجھیں۔ یعنی میری گزارشات پر توجہ فرمائیں اور پولنگ کے روز اپنے ووٹ قریب ترین لیٹر بکس میں ڈال دیں۔ باقی سب خیریت ہے' والسلام۔"

متوالا کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔ فلمی دنیا کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ الیکشن میں کھڑے ہیں اور ان کے پاس سینما کا ٹکٹ ہے۔ یہ اپنی تقریر کا مکھڑا عموماً" کسی فلمی گیت سے باندھتے ہیں۔ مثلاً

دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"حضرات! قوم کی خدمت کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن میں یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا ہوں کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا اور چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا۔ کھڑا ہونا میرا کام تھا۔ اب مجھے نمبر بنانا آپ کا کام ہے۔ یعنی اب تہاڈی عزت دا سوال اے۔

صاحبان! آپ کے پاس طرح طرح کا امیدوار آئے گا۔ طرح طرح کی ایکٹنگ کرے گا اور ڈائیلاگ بولے گا' ان سے ہوشیار۔ ان کے رونے گانے پر نہ جائیے۔ سب پلے بیک ہے۔ خاکسار کی پوری عمر قوم کی خدمت میں ریہرسل کرتے گزری ہے۔ اب تو اسے قومی ہیرو بننے کا موقع ملنا چاہیے۔ آپ اس شیراں دے پتر شیر کو ووٹ نہ دیں گے تو اور کسے دیں گے؟"

ایک روز ان کے جلسے میں ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کوئی اعتراض کرنا چاہا۔ آپ نے فوراً" آواز لگائی "کٹ" وہ وہیں بیٹھ گیا۔

خان شیر خان گاندھی گارڈن کے علاقے سے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پاس چڑیا گھر کا ٹکٹ ہے۔ ان کی تقریر بھی سننے کی ہوتی ہے۔

"صاحبان! آج کل ہر کوئی اپنی بولی بول رہا ہے۔ دھاڑ رہا ہے۔ چنگھاڑ رہا ہے۔ لیکن ہاتھی کی طرح ان کے کھانے کے دانت اور ہیں' دکھانے کے اور۔ قوم کے لیے قربانی دینے کا وقت آئے تو سب کو سانپ سونگھ جائے گا۔ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں گے۔ دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ یاد رکھیے! ان لوگوں کا آگا شیر کا ہے اور پیچھا بھیڑ کا ہے۔ بگلا بھگتوں کو ووٹ مت دیجیے۔ خاکسار کو دیجیے کہ شاہین را بلند است آشیانہ۔"

سب سے مختصر تقریر مرزا برکت اللہ بیگ کی ہوتی ہے۔ یہ لاٹری کے ٹکٹ پر کھڑے ہیں۔

"بھائی صاحبان! میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے ووٹ دیجیے اور اسمبلی میں پہنچا دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کرتا ہوں یا آپ کو دغا دیتا ہوں۔ یہ آپ کی قسمت کی بات ہے۔"

(یہ کالم 1970 میں لکھا گیا۔)

بیاد محمود ریاض

کاش،

فائزہ افتخار

شاید ہی کبھی مجھے اپنے لکھنے پر افسوس ہوا ہو... اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ لکھنے کے اس سفر میں میں نے بہت کچھ پایا ہے۔

کتھارسس... پہچان... محبت۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ کسی حوالے سے مجھے اپنے لکھنے پہ افسوس ہوتا ہے۔

اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے خواتین، شعاع اور کرن میں لکھنا کیوں شروع کیا۔ بلکہ افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ میں نے یہاں لکھنا اتنی دیر سے کیوں شروع کیا۔

اتنی دیر بعد...

محمود ریاض صاحب کے گزر جانے کے بعد...

کاش کہ میں نے کچھ عرصہ قبل لکھنے کا آغاز کیا ہوتا، تب جب خواتین، شعاع اور کرن کو محمود ریاض صاحب کی سرپرستی حاصل تھی۔ شاید اس بہانے میری ان سے شناسائی ہو جاتی۔ میں بھی علم، خلوص اور دیانت کے اس سرچشمے سے فیض یاب ہو جاتی۔ مگر یہ میرے نصیب میں نہ تھا۔

ان کی برسی کے موقع پہ ہر سال جب میں اپنی محترم اور سینئرز مصنفین کے وہ مضامین پڑھتی ہوں جس میں انہوں نے محمود ریاض صاحب کے حوالے سے اپنی یادداشتیں لکھی ہوتی ہیں تب مجھے ان پہ بے پناہ رشک آتا ہے اور ان سے براہ راست شناسائی کا شرف نہ ہونے کے باوجود میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتی ہوں۔

ایک بار فارحہ ارشد نے لکھا تھا کہ محمود ریاض صاحب نے کسی شمارے میں اپنی رائٹرز کے نام لے کے ان کے قلمی تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ خواتین ایک بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ ہر ماہ بہت سی رائٹرز لکھتی ہیں۔ غیر ارادی طور پر چند نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے جن میں فارحہ کا نام بھی تھا۔ فارحہ بتاتی ہیں کہ انہیں شدید افسوس ہوا اور برسبیل تذکرہ کہیں انہوں نے اس تاسف کا تذکرہ امتل سے کر دیا۔ امتل نے فارحہ کے جذبات محمود ریاض صاحب تک پہنچائے۔

انہوں نے انجانے میں فارحہ کو پہنچنے والے ملال کا ازالہ اس خوبصورتی سے کیا کہ اپنے ہی ادارے کے ایک اور ماہنامے میں فارحہ کی پہلے سے ہی شعاع یا خواتین میں شائع شدہ ایک تحریر منتخب تحریر کے نام سے نہ صرف شائع کی، بلکہ خود فارحہ سے معذرت بھی کی۔ حالانکہ یہ بہت معمولی سی بات تھی۔ قلم کار تو ہوتے ہی حساس ہیں۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ کوئی ان کے احساسات کا خیال بھی رکھے۔ اتنی اپنائیت اتنی انکساری۔ میں جب بھی ان کے بارے میں کچھ پڑھتی ہوں خصوصاً" امتل کی کوئی تحریر کہ وہ ایک طویل عرصہ ان کے ساتھ کام کر چکی ہیں، تو اپنی زندگی کی اس تشنگی پہ افسوس پہلے سے بڑھ کے ہوتا ہے۔

دنیا میں اچھے لوگ ہیں بھی کتنے کم۔

اور جو ہیں، ضروری تو نہیں" آپ ان سے واقف بھی ہوں۔ اگر میں کچھ عرصہ قبل اپنے قلمی سفر کا آغاز کر دیتی تو یہ شناسائی میرا نصیب بھی بنتی۔

تب یہ سطور میں اتنے ملال سے نہ لکھتی۔ بلکہ بڑے فخر سے یہ لکھتے ہوئے آغاز کرتی کہ۔

"محمود ریاض صاحب، جو کہ ادب کی دنیا کے چند نفیس ترین لوگوں میں سے ایک تھے، مجھے ان کی خوبیاں قریب سے جاننے، ان سے کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔"

تم کیوں چلے گئے

درِ ثمین سلیم

بھول جانا بھلا انسان کے بس میں کہاں ہوتا ہے۔ کسی حادثے، کسی بہت پیارے کی یاد انسان کو بار بار رلاتی ہے۔ دراصل کسی بہت پیارے کو بھولنے کی کوشش ہی ہمیشہ ان پیاروں کو ہماری یادوں میں زندہ رکھتی ہے۔ موسم گزر جاتے ہیں۔ لیکن یاد نہیں جاتی خود سے بچھڑے ہوئے پیاروں کی یاد انسان کے وجود کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لباس کی طرح نہیں، جلد کی طرح، کھال کی طرح۔

مگر یہ بھی سچ ہی کسی نے کہا تھا۔ اس کائنات میں کوئی وجود ہمیشہ کے لیے ایک جگہ پر موجود نہیں رہ سکتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنا مقام بدلتا ہے۔ سانس کی آری ہستی کے سایہ دار درخت کو کاٹتی چلی جاتی ہے اور آخر کار انسان ہر عمل سے بے گانہ ہو کر نامعلوم دنیا کی طرف رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان جانتا ہے کہ یہاں اس دنیا میں ٹھہرنا ناممکن ہے۔ قیام کا امکان نہیں۔ اس سے پہلے بھی ہزار ہا قافلے اس دشت بے اماں سے گزرے اور اپنے بعد ویرانیاں چھوڑ گئے۔ انسان جانتا ہے کہ ایک دن اسے بھی جانا ہے۔ لیکن وہ جانے سے پہلے کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے، جو اس کے نام سے منسوب رہے۔

ایک ایسا ہی معتبر نام اور شفیق ہستی، مہربان چہرہ اور پرخلوص شخصیت کے مالک محمود ریاض صاحب جن سے کبھی بات نہ ہو سکی۔ جن سے کبھی مل نہ سکی۔ مگر ڈھیروں لوگوں سے اس مہربان ہستی کے متعلق سن کر دل میں ہمیشہ اک نامعلوم سی خلش جاگی کہ کاش! میں اس شفیق ہستی، معتبر شخصیت، پرخلوص لب ولہجے

کے مالک محمود ریاض صاحب کی زندگی میں ان کے نام سے منسوب پرچوں میں لکھتی تو مجھ ناچیز کو ان کی رہنمائی ضرور ملتی۔ مگر۔۔۔

یہ بھی تو سچ ہے کہ انسان کی ہر خواہش کہاں پوری ہوتی ہے۔ مگر اس بات پہ بھی اطمینان، ہمیشہ میرے دل میں بسیرا کیے رکھتا ہے کہ وہ پودا جو کبھی محمود ریاض صاحب نے لگایا تھا، آج وہ پودا ان کی محنت کا شجر بن کے "خواتین، شعاع اور کرن" کی صورت میں لاکھوں ذہنوں کو جہاں علم کی چھاؤں فراہم کر رہا ہے، وہاں ہم جیسی کتنی ہی لفظوں اور آگہی کا بھید جاننے والی لڑکیوں کو پلیٹ فارم مہیا کر کے قلم سے رابطہ جوڑنے کے صلے میں ہزاروں محبتوں سے بھی نواز رہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے شاید یہ شعر محمود ریاض صاحب جیسی ہستی کے لیے ہی کہے ہوں گے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم ۔۔۔
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

وہ صبح جس کی کبھی رات نہیں ہوتی۔ اک ایسی ہی روشن صبح جیسی شخصیت کے مالک ریاض صاحب جن سے ہمیشہ مجھے ایک خاص قسم کی عقیدت رہی اور رہے گی۔ مئی کے مہینے میں اپنے پیاروں کو یادوں کے گرداب میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر تنہا کر گئے۔

بہت سے لوگوں سے سنا اور پڑھا کہ وہ "شفقت" کا سمندر تھے، "اپنوں، بے گانوں، دوستوں، سب کے لیے دکھ آج بھی وہی ہے، جو ان کی وفات کی خبر سن کر چپکے سے دل میں بسیرا کر بیٹھا تھا۔ مگر گزشتہ دو سالوں سے اس دکھ نے دوہری اذیت اختیار کر لی ہے۔ پہلے اس ادبی زندگی سے اس چھاؤں جیسی ہستی، محمود صاحب کے بچھڑ جانے کا غم مئی کے مہینے کو اداس رکھتا تھا اب اس "اداس" مہینے میں اپنی زندگی کی شفیق ہستی "ماں" کی یاد بھی رلاتی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ پاک محمود ریاض صاحب اور تمام مرحومین کو جنت میں اعلا مقام سے نوازے اور ان کی روشن کی ہوئی شمعیں یوں ہی تابناکی سے فروزاں رہیں اور دوسروں کو بھی کریں۔ (آمین)

تازہ تمام زخم بہاروں نے کر دیے
ہر پھول کا سوال ہے ہم کیوں چلے گئے؟
ہنسنا تو خیر اپنا مقدر نہ تھا کبھی
رونا بھی اب محال ہے تم کیوں چلے گئے؟
تم نے تو جاتے جاتے ملاقات تک نہ کی
اب تک یہی ملال ہے تم کیوں چلے گئے؟
واثق میں کس طرح سے اٹھاؤں دکھوں کے بوجھ
سارا بدن نڈھال ہے تم کیوں چلے گئے؟

اسماء عباس سے ملاقات

شاہین رشید

☆ ”کیسی ہیں اسماء... اور کیا مصروفیات ہیں؟“

”جی الحمدللہ! ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اور ”ننھی“ چل رہا ہے اور مزید تین پروجیکٹ ہیں‘ ان میں دو ” 7th Sky “ کے ہیں ایک کی ڈائریکشن سکینہ سموں نے دی ہے اور دوسرے کی سراج الحق نے۔ اور تیسرا ”اے اینڈ بی“ کا ہے جس کے ڈائریکٹر ندیم صدیقی ہیں۔ سکینہ سموں کی ڈائریکشن کے سیریل کا نام ”گوہر نایاب“ ہے۔ اے این بی کا ”من کے موتی“ اور تیسرے کا نام ”ساری بھول ہماری تھی۔“

☆ ”اور رول تو وہی ہوں گے جو سب میں ہوتے ہیں آپ کے یعنی ماں کے رول؟“

”میں ماں ہوں تو ظاہر ہے کہ مجھے ماں کے رول ہی ملیں گے۔ لیکن مجھے تھوڑا سا افسوس بھی ہوتا ہے کہ ہر سیریل میں ایک ہی طرح کا کردار ہوتا ہے۔ ان تینوں میں بھی ایک ہی طرح کا کردار ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ کسی میں اچھے کپڑے پہن کر اچھی ماں بن جاتی ہوں اور کسی میں برے کپڑے پہن کر بری ماں یا بری عورت بن جاتی ہوں... اب خواہ وہ ماں کا رول ہو‘ تائی کا رول ہو یا پھوپھی کا رول ہو۔ بس ملتے جلتے ہیں۔ نگیٹو‘ پوزیٹو ہیں... تو چونکہ یہی ٹرینڈ چل رہا ہے تو کرنے پڑتے ہیں۔ نہیں کریں گے تو کہیں گے کہ بڑے نخرے ہیں ویسے اب میں ایک جیسی چیزیں کر کے بور ہو گئی ہوں تو کچھ عرصہ نہیں کروں گی جب تک کوئی بہت اچھا رول نہیں ملے گا۔“

☆ ”ننھی“ میں تو آپ کا رول بہت ہی اچھا ہے۔ بالکل مختلف؟“

”ننھی کا رول تو اتنا اچھا ہے کہ اس رول کے بعد ہی تو میں سوچنے لگی ہوں کہ مجھے ذرا مختلف رول کرنے چاہئیں۔ زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ جب آپ کو ایسا رول ملتا ہے جو آپ کے تمام کاموں پر بھاری ہوتا ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے یہ رول کرنے کو ملا ہے اور پتا نہیں آئندہ مجھے ایسا اچھا رول ملے نہ ملے۔ لیکن میرے دل کو یہ تسلی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک بہترین رول کیا ہے۔ اور اس کے لیے میں حسیب حسن اور ان کی بیگم مونا جو کہ اس کی رائٹر بھی ہیں ان کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس رول کے لیے منتخب کیا۔ اور میں ہر قسط کے بعد ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

☆ ”نظر انتخاب آپ ہی تھیں یا کوئی اور بھی تھیں؟“

”اس رول کے لیے ان کے پاس ایک لمبی فہرست تھی۔ لیکن چونکہ یہ میرے گھر کی بات تھی۔ اقبال انصاری بھائی (بہنوئی) اس کے پروجیکٹ ہیڈ ہیں۔ تو جب یہ آئیڈیا آیا تو گھر میں ڈسکس ہوتا تھا کہ فلاں کو لے لیتے ہیں۔ فلاں اس کو زیادہ بہتر طریقے سے کر لیں گی تو میں خاموش بیٹھی رہتی تھی۔ لیکن میرے دل میں خواہش ضرور پیدا ہوئی کہ اس کو میں کروں مگر میں نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا اور پھر اقبال بھائی تو ایسے ڈائریکٹر ہیں جنہوں نے کبھی بلاوجہ اپنی فیملی کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی کرنا چاہتے ہیں ہمیشہ ٹیلنٹ ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن میری خوش قسمتی دیکھیے کہ حسیب اور مونا نے میرا سیریل ”بہکاوا“ دیکھا ہوا تھا۔ اس میں بھی میرا رول کافی مختلف اور مشکل تھا تو اس رول کو مدنظر رکھ کر انہوں نے کہا کہ ”ننھی“ میں اگر ”شمودائی“ کا رول کراتا ہے تو وہ ان ہی سے کراتا ہے۔ حالانکہ میری تو حسیب حسن اور مونا سے صرف ہیلو ہائے تھی۔ انہوں نے میرا انتخاب کیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے میرا انتخاب کیوں کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے ”بہکاوا“ میں آپ کی پرفارمنس دیکھی تھی تو مجھے لگا کہ آپ کی آنکھیں اور آپ کی تھوڑی کا تل‘ ان سے میں کچھ کام لے سکتا ہوں... تو کافی مشکل پروجیکٹ تھا اور مجھے کام کرنے کا بہت مزا آیا۔“

☆ ”شوٹ کے دوران کیا مشکلات پیش آئیں؟ کیونکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں جانا‘ چھوٹے چھوٹے گھروں میں جانا... مشکل تو ہوئی ہوگی؟“

”بہت مشکل ہوئی‘ اسے لفظوں میں بتا نہیں سکتی۔ گھر کے اندر سارے سین تھے اور سب اسموک (Smoke) کے تھے‘ آج کل اسموک (دھواں) ڈال کر شوٹ کرتے ہیں جس کی وجہ سے سانس بند ہونے لگتا ہے‘ آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔ اقبال بھائی ایک مرتبہ شوٹ پہ آئے تو کہنے لگے کہ مجھ سے تو پانچ منٹ کھڑا نہیں ہوا جا رہا... میری طبیعت خراب ہو رہی ہے اور آپ خود سوچیں کہ بیس‘ پچیس دن کا ہمارا اسپیل (Spell) تھا جو کہ ہم نے کیا۔ لیکن میرے اندر تو ایک خوشی تھی کہ میں کچھ اچھا کرنے جا رہی ہوں... میں بچپن سے سمیتا پاٹل‘ شبانہ اعظمی کو دیکھتی آرہی ہوں اور ان کو پسند کرتی آرہی ہوں تو دل میں خواہش تھی کہ کبھی مجھے بھی ایسی کوئی چیز ملے گی کرنے کو۔ کبھی ایسا اچھا کردار مجھے بھی ملے گا۔“

☆ ”نہ کوئی میک اپ نہ کوئی گلیمر... ایک عام عورت کا کردار۔ بڑی بات ہے؟“

”مجھے گلیمر کا کوئی شوق نہیں ہے اور اگر مجھے گلیمر کا شوق ہوتا تو میں کبھی ”ننھی“ کا کردار نہ لیتی۔ مجھے تو کردار چاہیے۔ اس کردار میں پختگی ہو‘ سچائی پر مبنی ہو فیک (Fake) نہ ہو۔“

☆ ”اسماء! آپ یہ بات نوٹ کرتی ہیں کہ ہمارے آج کے ڈراموں میں ماؤں کو بھی بہت برا دکھایا جاتا ہے اور اولاد اپنے ماں باپ پر تنقید کر رہی ہوتی ہے‘ ان کو برا بھلا کہہ رہی ہوتی ہے۔ جبکہ پہلے ڈراموں میں والدین کا احترام دکھایا جاتا تھا؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ آج کل ماؤں کے کردار نگیٹو دکھائے جا رہے ہیں اگر دادی دکھائی گئی ہے تو وہ اپنے پوتے پوتیوں کو مار مار کر گھر سے نکال

رہی ہوتی ہے۔ بہنوں کو بھی بہت برا بنا کر دکھایا جارہا ہے اور جب اس پر اعتراض کرو یا تنقید کرو تو کہتے ہیں کہ اس قسم کے کرداروں سے ہماری ریٹنگ (Rating) بڑھتی ہے۔"

☆ "تو پھر ڈرامے اصلاح کا ذریعہ تو نہ رہے نا؟ ہم تو ڈراموں کے ذریعے نوجوان نسل کو بدتمیزی سکھا رہے ہیں؟"

"میں کہتی ہوں کہ آپ نگیٹو کردار بھی رکھیں۔ لیکن اگر آپ چالیس فیصد نگیٹو رکھیں تو ساٹھ فیصد پوزیٹو بھی رکھیں۔ جیسے گھاؤ میں میرا کردار ایک بہت ہی اچھی ماں کا کردار ہے کہ جس کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے۔ اب جو میرے تین سیریلز آنے والے ہیں ان میں میرا نگیٹو رول ہی ہے۔ تو اس میں اب چینج آنا چاہیے ورنہ معاشرے میں تو بہت بگاڑ آجائے گا۔"

☆ "پہلے سڑکیں سنسان ہوجایا کرتی تھیں اب نہیں۔۔۔ تو کیا اب بالکل بھی اچھے ڈرامے نہیں بن رہے؟"

"ایسا نہیں ہے اب بھی اچھے ڈرامے بن رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں میں ڈراما سیریل "خاموشیاں" دیکھ رہی تھی۔ بہترین سیریل تھا۔ اب اسے بنے ہوئے چار پانچ سال ہی ہوئے ہوں گے۔ منھی تو آج کل آن ایر ہے۔ "گھاؤ" بھی بہترین سیریل تھا جو حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ بشریٰ کا "کچھ دل نے کہا" "مکان" سب وہ ڈرامے تھے کہ جن کے لیے دل چاہتا تھا کہ ختم ہی نہ ہوں جو بھی ڈراما کسی کہانی پہ بیس (Base) کرے گا وہ بہت مقبول ہوگا۔ اب تو عورت کے ساتھ وہ برا سلوک دکھایا جاتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ یا عورت خود دوسروں پر ظلم کررہی ہوتی ہے۔ یہ سب کیا ہے میں تو بہت حیران ہوں۔"

☆ "آپ نے یہ بات بھی نوٹ کی ہوگی کہ اب ڈراموں کے موضوعات بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بہنوں کا موضوع ہے یا بھائیوں کا موضوع ہے سوکنوں کا موضوع ہے تو بس سب اس پہ لکھے چلے جارہے ہیں۔ موضوعات بولڈ بھی ہوگئے ہیں اور سین بھی بولڈ ہوگئے ہیں؟"

"ہاں! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بہنوں کا موضوع تو بہت ہی چل رہا ہے اور جو آپ دکھا رہے ہیں وہ اگر حقیقت بھی ہے تو آپ اسے چھپائیں۔ یہ اتنی غلیظ بات ہے کہ بہنوئی کے اوپر آپ نظر رکھیں یا بہنوئی سالی پر نظر رکھے بجائے اس کو چھپانے کے اس کو بار بار دکھا رہے ہیں۔۔۔ بولڈ کی بات کررہی ہیں تو ڈراما سیریل "سات پردوں میں" بھی بولڈ تھا مگر اس کی کہانی حقیقت پر مبنی تھی اور اس سے لڑکیوں کو سبق بھی ملا ہوگا۔۔۔ اب یہ بھی بہت دکھایا جارہا ہے کہ بڑی عمر کی عورت چھوٹی عمر کے لڑکے سے محبت کررہی ہے یہ بھی بہت شرم ناک بات ہے۔ مان لیا کہ ہماری سوسائٹی میں ایسی باتیں ہوجاتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کو تسلسل کے ساتھ دکھائیں۔ اب ریپ کا سین ہے تو ہمارے یہاں باقاعدہ دکھایا جاتا ہے تو کیوں دکھاتے ہیں؟ ضروری ہے کہ سب کچھ دکھائیں؟ دو نمبر عورتیں بھی بہت دکھائی جاتی ہیں کہ سگریٹ پی رہی ہیں۔ شرابیں پی رہی ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں ضرورت ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھپائیں۔"

☆ "تو کیا ڈرامے حقیقت سے دور ہوتے ہیں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ڈرامے حقیقت سے دور ہوتے ہیں میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ بری چیزیں ہماری سوسائٹی میں ہوتی ہیں لیکن ان کو زیادہ نہ دکھائیں یا اس طرح کھول کر نہ دکھائیں۔ جو چھپا سکتے ہیں ان کو چھپالیں۔ عورت کو ذلیل نہ کریں۔ عورت کا جو مقام ہے۔ وہ دکھائیں۔ عورتوں نے جو قربانیاں دی ہیں۔ وہ دکھائیں بری بھی دکھائیں۔ لیکن اچھی زیادہ دکھائیں تاکہ لوگوں پر اچھا اثر پڑے۔ ایک اور پانچ کا ریشو ہو۔۔۔ ایک میں عورت بری ہو تو پانچ میں اچھی ہو۔ جیز سیریل اور "ہم سفر" کے بعد ساس بری ہوئی ہے تو ہوتی ہی چلی جارہی ہے۔"

☆ "نئی لڑکیاں بتاتی ہیں کہ اب تو کوئی ریہرسل ہی نہیں ہوتی سیٹ پر جاکر اسکرپٹ دیکھتے ہیں لائنیں پڑھتے ہیں اور شوٹ کروا دیتے ہیں۔۔۔ کیا ایسا ہی ہے؟"

"بالکل بالکل۔۔۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب کوئی ایسا اسکرپٹ بھی نہیں ہوتا کہ جس کی ریہرسل کرنی چاہیے۔ ہاں میں ایک رائٹر سے ڈر جاتی ہوں جس کا نام فصیح باری خان ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان کا اسکرپٹ مجھے پہلے مل جائے۔ ان کے لیے میں سیٹ پر جاکر نہیں بول سکتی کہ لائنیں دکھاؤ ان سے مجھے خوف آتا ہے کہ ان کے اسکرپٹ میں مشکل لفظ ہوتے ہیں۔ مشکل بات ہوتی ہے جس کو کنسیو کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اسکرپٹ کی عزت کی جائے۔ باقی کے ڈائیلاگ ایسے نہیں ہوتے کہ بندہ سوچے کہ یہ کیسے یاد ہوں گے۔ عام باتیں ہوتی ہیں جو بولنی ہوتی ہیں۔ اس طرح منھی کا اسکرپٹ بھی میں لاہور لے گئی۔ پہلے پڑھا سمجھا پھر کیا۔"

☆ "آپ نے جن لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے ان ہی کے ساتھ کرنا چاہیں گی یا آپ چاہیں گی کہ کچھ نئے لوگوں کے ساتھ بھی کروں؟"

"میں تو سب کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ لیکن فصیح باری خان اور مظفر معین کی تو میں دل سے فین ہوں۔ ان سے تو اب میری دوستی نہیں بلکہ پیار والا رشتہ ہوگیا ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اور میں نے فصیح کے ساتھ کافی کام کیا ہے۔ ان کا "بہکاوا" سیریل کیا۔ ٹیلی فلم "چابک" ایک اور عورت "کڑکتی بجلیاں" جو بہت بار آن ایر آچکی ہے۔ ان کا کام تو آؤٹ اسٹینڈنگ ہے۔ اب میں حسیب کے ساتھ کام کرنا چاہوں گی۔ ندیم صدیقی بہت سمجھ دار ڈائریکٹر ہے۔ تو بات ساری یہ ہے کہ خواہ ڈائجسٹ کی رائٹرز ہوں یا کوئی ہو ان کی کہانی میں ان کی بات میں وزن ہونا چاہیے۔۔۔ اور عورت عورت کے بارے میں جتنا اچھا لکھ سکتی ہے کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔"

☆ "آپ کافی گیپ کے بعد آئی ہیں وجہ؟ اور تنقید ہوتی ہے آپ پر یا سینئر سمجھ کر رعایت کردیتے ہیں؟"

"شادی سے پہلے میں نے کام کیا تھا۔ پھر شادی ہوگئی تو گھریلو ذمہ داریوں میں مصروف ہوگئی اور تقریباً بیس سال میں نے کام نہیں کیا اور جب سے آئی ہوں تو بہت زیادہ کام نہیں کیا کہ اپنے آپ کو سینئر کہلواؤں۔۔۔ کام کے لحاظ سے میں سینئر نہیں ہوں اس لیے تنقید یا تعریف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"آپ کی اور بشریٰ انصاری کی شکلیں بہت ملتی ہیں۔ کبھی کنفیوژن ہوا؟"

"ہاں جی بہ بہت ملتی ہیں اور مزے کی بات یہ کہ جو کام میں نے کیا اس پر سب کہتے تھے کہ بشریٰ آپا آپ فلاں ڈرامے میں بہت اچھی لگ رہی تھیں تو میرا کریڈٹ بھی ان ہی کو جاتا تھا۔ مگر اب بہکاوا منھی اور گھاؤ کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آگیا ہے کہ بشریٰ کون ہے اور اسماء کون ہے۔"

☆ "اللہ تعالیٰ نے آپ کی پوری فیملی کو عزت شہرت سے نوازا ہے آپ کے والد پھر آپ بہنیں۔۔۔ تو کبھی غرور ہوا؟"

"اللہ معاف کرے کبھی غرور کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ ہم سب تو اللہ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ اس نے اتنی عزت دی ہے اور شکر الحمدللہ ایک ہی بھائی ہے اور بڑا پیارا بھائی ہے۔ اس کا مزاج بھی ہماری طرح ہی ہے اور میں عنقریب اس کے پاس رہنے کے لیے جارہی ہوں امریکا۔ اسے بڑی ایکسائٹمنٹ ہے کہ تم آؤگی تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے یہاں گھومنے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ بس کیا کرتے۔ وہ ڈالر کمانے امریکا چلا گیا تو وہیں کا ہو رہا۔"

☆ "آپ بتارہی تھیں کہ آپ شوٹ کے لیے صبح نو بجے گھر سے نکل جاتی ہیں تو کیا آپ کا گھر ڈسٹرب نہیں ہوتا؟"

"صبح نو بجے نکلتی ہوں اور رات گیارہ بجے واپس آتی ہوں اور گھر کا نہ پوچھو میرا گھر بہت متاثر ہوتا ہے۔ اب میں نے زیادہ کام کرلیا ہے اس لیے تین چار مہینے کی بریک لوں گی۔ گھر میں مٹی بھری پڑی ہے،

کھڑیوں میں سیل ختم ہوگئے ہیں۔ بچے اداس ہیں ٹپ ٹپ آنسو ادھر سے بھی جاتے ہیں اور ادھر سے بھی آتے ہیں۔ تو اب ان شاء اللہ اپنے گھر جاؤں گی۔ آرام کروں گی اپنے بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے امریکا جاؤں گی۔ اور ان شاء اللہ عید کے بعد کام شروع کروں گی۔"

☆ "اپنے بچوں کے بارے میں بتائیں؟"

"میرے ماشاء اللہ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور بڑے بیٹے وقاص عباس کی شادی کردی ہے اور میری ایک پیاری سی پوتی بھی ہے اس میں میری جان ہے اور اس کا خیال ہے کہ دنیا میں دو ہی پروفیشن ہیں ایک شوٹنگ اور دوسرا ٹیچنگ... کیونکہ دادی شوٹنگ پہ جاتی ہے اور ماں ٹیچنگ کرتی ہے اسکول میں۔ وقاص دنیا ٹی وی میں اہم عہدے پر فائز ہے۔ دوسرے بیٹے اسد عباس نے ایم بی اے کیا ہے۔ بیٹی زارا عباس فلم میکنگ تھیٹر کے بارے میں پڑھ رہی ہے اور جو چھوٹا بیٹا احمد عباس ہے' وہ تو پورا ایکٹر اور سنگر ہے مگر میں نے اسے روک دیا ہے کہ پہلے تعلیم مکمل کرو پھر اس فیلڈ میں آنا۔"

☆ "گھریلو معاملات اور امور خانہ داری سے کتنی دلچسپی ہے؟"

"بڑی سخت دلچسپی ہے۔ شدید دلچسپی ہے۔ گھر کے اندر گھس جاؤں' کچن میں گھس جاؤں' الماریاں صاف کرنے لگ جاؤں تو مجھے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے' گھر سجانے کا' کھانا پکانے کا' نئی نئی چیزیں گھر میں لانے کا بہت زیادہ شوق ہے۔ بس دل چاہتا ہے کہ دو دن کا ایک دن ہو' ایک دن گھر پہ لگاؤں اور ایک دن کام کروں۔"

☆ "آپ کے میاں صاحب کیا کرتے ہیں؟"

"میرے میاں ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں۔ اب وہ جاب بھی کرتے ہیں اور بزنس بھی۔ بہت ہی پیار کرنے والے انسان ہیں اور ان کو مجھ سے بہت محبت ہے تب ہی انہوں نے مجھے کام کرنے کی اجازت بھی دی ہے اور یہ ازدواجی لائف بہت خوب صورت ہوتی ہے اور میں سب لڑکیوں سے کہتی ہوں کہ دیکھو! شادی ضرور کرنا' بچے ضرور پیدا کرنا... کیونکہ یہ بہت حسین زندگی ہوتی ہے۔"

☆ "آپ کے کام کو پسند کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ یہاں ٹھیک نہیں کیا' یوں نہیں یوں ہونا چاہیے تھا؟"

"وہ ٹی وی زیادہ دیکھتے نہیں ہیں... بس "نغمی" دیکھ لیتے ہیں تو وہ انہیں پسند آیا اور میرا کام بھی پسند آرہا ہے۔ حوصلہ افزائی کرتے ہیں بس نغمی میں ان کو ایک بات پر اعتراض ہے کہ میں پیاری نہیں لگ رہی' کچھ زیادہ ہی سمپل رول میں نے کرلیا ہے..."

☆ "مطلب ان کا دل چاہتا ہے کہ آپ بجی بنی ٹپ ٹاپ میں رہیں؟"

"ہاں... بالکل... وہ کہتے ہیں کہ اس رول میں تو لوگ آپ کو گالیاں دیں گے لوگ آپ کو پتھر ماریں گے... تو میں نے کہا کہ کیا ہوا۔ یہی تو کامیابی ہے فنکار کی... تو کہتے ہیں کہ کراچی کا ماحول ٹھیک نہیں ہے' مشکل ہو جائے گی۔ مگر اب جب وہ اپنی دوستوں کی بیویوں سے میری تعریف سنتے ہیں تو پھر خوش ہوتے ہیں۔ اصل میں میرے میاں اس معاملے میں بہت سمپل ہیں۔"

☆ "کبھی کسی ڈرامے میں ڈیتھ سین کیا؟"

"ایک میرے بھائی بنے ہوئے ہیں مختار احمد۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپا ایک دن کا کام ہے "آپ کو ایک سین میں مرنا ہے..." میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اب جو پورا دن میں بستر پر لاش بن کے پڑی رہی' لوگ رو رہے تھے... کبھی کوئی کہے' ہائے لاش تھک گئی ہوگی۔ اسے پانی پلاؤ' کبھی کوئی کھانے کی آفر کررہا تھا۔ تو بس ہنستے مسکراتے یہ سین ہوگیا..."

اسماء عباس سے اور بھی مزے مزے کی باتیں ہوئیں جو ان شاء اللہ پھر کبھی آپ کی نذر کریں گے۔

باتیں فیضان خواجہ سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟

"فیضان خواجہ۔"

2 پیار کا نام؟

"فیضان ہی کہتے ہیں۔"

3 تاریخ پیدائش / شہر؟

"7 جنوری 1986ء / ٹیکساس (امریکا)"

4 پاکستان میں رہنے کی وجہ؟

"اپنے وطن کی خدمت کرنا۔"

5 قد / ستارہ؟

"چھ فٹ ایک انچ / کیپری کورن۔"

6 تعلیمی قابلیت؟

"بیچلران فلم میکنگ' ٹیلی ویژن اینڈ تھیٹر کیا ہوا ہے۔"

7 شادی؟

"ابھی شادی نہیں کرنی۔ ابھی اپنے کام پہ فوکس ہوں۔"

8 پہلا ڈراما؟

"سہیل افتخار صاحب کی ڈائریکشن میں پہلا ڈراما "سورج مکھی" تھا' جو اے ٹی وی سے آن ایئر ہوا تھا۔"

9 وجہ شہرت؟

"تین چار ہیں۔ "ایک نئی سنڈریلا' میری سہیلی میری ہمجولی" اور "عکس" بہت پاپولر ہوئے تھے۔"

10 پہلی کمائی / کہاں خرچ کی؟

"اب یہ تو یاد نہیں ہے۔ انڈیا میں پہلا پروجیکٹ کیا تھا اور شاید پندرہ ہزار انڈین کمائے تھے۔ خرچ تو شاید کپڑوں پر ہی کیے ہوں گے۔"

11 آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟

"اگر شوٹ ہو تو نو دس بجے اور شوٹ نہ ہو تو بارہ ایک بجے۔"

12 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟

"سیل فون چیک کرتا ہوں' پانی پیتا ہوں' چائے پیتا ہوں۔"

13 گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟

"کوئی بات بری نہیں لگتی۔"

14 اپنے ملک میں کون سا قانون برا لگتا ہے؟

"ہمارے ملک میں سب قوانین ہیں۔ مگر ان پر عمل نہیں ہوتا تو قانون کوئی برا نہیں ہوتا۔ اچھائی کے لیے ہی قوانین بنائے جاتے ہیں۔"

15 قومی تہوار کس طرح مناتے ہیں؟

"بچپن میں بہت جوش و خروش کے ساتھ مناتے تھے۔ اب تو عموماً "کام" پر ہی ہوتے ہیں۔"

16 اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟

"آج کل بہت پتلا ہو رہا ہوں۔ تھوڑا —— Healthy ہونا چاہتا ہوں۔"

17 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟

"بھوک برداشت کر لیتا ہوں۔"

18 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟

"لاء کا نافذ ہونا بہت ضروری ہے، تب ہی تبدیلی آئے گی۔"

19 کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟

"چھٹی کا۔"

20 خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟

"یہ تو سچویشن پر منحصر ہے۔"

21 شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟

"میں شدید تھکن میں کہیں نہیں جاتا۔ ہاں! کوئی فورس کرے تو چلا جاتا ہوں۔"

22 طبیعت میں ضد ہے یا بات کو آسانی سے مان لیتے ہیں؟

"کبھی کبھی بہت ضدی ہو جاتا ہوں اور کبھی کبھی چپ کر کے سن لیتا ہوں۔"

23 دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟

"دماغ کا میٹر کم ہی گھومتا ہے۔ جب کوئی مجھ سے بدتمیزی کرے تب۔"

24 غصے میں آپ کی کیفیت؟

"ڈراما سیریل "سسرال کے رنگ انوکھے" میں دیکھ ہی لی ہو گی۔"

25 خواتین میں کیا بات بری لگتی ہے؟

"جن میں ایگو ہوتی ہے، غرور ہوتا ہے۔ مجھے ڈاؤن ٹو ارتھ (منکسر المزاج) لوگ پسند ہیں۔"

26 کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟

"تو میں شرما جاتا ہوں۔"

27 پرائز بانڈ نکلنے کے منتظر رہتے ہیں یا شوق ہی نہیں ہے؟

"نہیں! مجھے شوق ہی نہیں ہے۔ اگر لوں تو کیا پتا نکل ہی آئے۔"

28 گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟

"اباجی کے۔"

29 کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟

"کار چلانے کا موقع۔"

30 جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟

"سنگل ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے۔"

31 محبت کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟

"میں تو صرف ٹیلی وژن پر ہی کرتا ہوں۔ اصلی زندگی میں تو کسی سے نہیں کیا۔"

32 شاپنگ پہ جاتے ہیں تو سب سے پہلے کیا خریدتے ہیں؟

"عموماً" کپڑے ہی خریدتا ہوں۔"

33 آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟

"میرے دنیا میں آنے کا مقصد یہ ہے کہ میں انٹرٹینمنٹ کی دنیا کو بہت آگے تک لے جاؤں۔"

34 پیسہ خرچ کرتے وقت سوچتے ہیں؟

"کبھی.... کبھی ویسے عموماً" نہیں سوچتا۔ پیسے کم ہوں تو سوچتا ہوں۔"

35 کوئی برا وقت جو آپ نے گزارا؟

"اس کے بارے میں کیا کہوں۔"

36 بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟

"کلون، چاکلیٹ، فلاورز۔"

37 کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟

"کوئی کام کی بات کرے تو۔"

38 پسندیدہ پروفیشن؟

"ایکٹنگ۔"

39 اپنے لیے تعریفی جملے جو یاد ہیں؟

"اکثر لوگ تعریف کرتے ہیں کہ آپ بہت کیوٹ ہیں۔ آپ اچھے ہیں۔ اداکاری اچھی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

40 چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟

"گھر پر بھی اور دوستوں کے ساتھ بھی۔"

41 مخلص اپنے ہوتے ہیں یا پرائے؟

"میرا خیال ہے اپنے۔"

42 اپنی شخصیت کے لیے کوئی ایک لفظ؟

"کچھ معاملوں میں بہت تیز ہوں۔"

43 گھر کے کس گوشے میں سکون ملتا ہے؟

"اپنے بستر پر۔"

44 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟

"ٹی وی اور دیگر الیکٹرانک چیزیں۔"

45 ایک کردار جو کرنا چاہتے ہیں؟

"میں ایکشن فلم کرنا چاہتا ہوں۔"

46 کوئی کردار جو کر کے پچھتائے؟

"بڑے کردار کیے ہیں۔ ایک کیا بتاؤں۔"

47 ایک کردار جو بہت ہٹ گیا ہو؟

"سسرال کے رنگ انوکھے" کا۔ تین چار اور بھی ہیں۔"

48 کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟

"بالکل..... بڑی دفعہ ایسا ہوا ہے۔ اب احتیاط کرتا ہوں۔"

49 مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟

"اچھی لگتی ہے اور ایک نئی انرجی آتی ہے۔"

50 اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گے؟

"ملک کو سدھارنے کی کوشش کروں گا۔"

51 کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟

"کپڑے۔"

52 نصیحت جو بری لگتی ہے؟

"مجھے نصیحتیں بری نہیں لگتیں۔ ہمیشہ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

53 کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟

"جو اچھا لگ جائے۔"

54 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

"میں جو چیزیں خریدتا ہوں، وہ میرے پروفیشن کے مطابق ہوتی ہیں جیسے وارڈ روب۔ جس میں کافی ساری چیزیں آجاتی ہیں۔"

55 کھانے کے لیے بہترین جگہ، چٹائی یا ٹیبل؟

"دونوں کا اپنا مزا ہے۔"

56 کوئی ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا اچھا لگتا ہے؟

"کوئی ایک جگہ نہیں ہے۔ مجھے مختلف جگہوں پہ کھانا اچھا لگتا ہے۔"

57 اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گے؟

"یعنی میں کچھ بھی اٹھا سکتا ہوں۔ اف یہ تو بڑا مشکل سوال ہے۔ بہت ساری چیزیں دماغ میں آرہی ہیں۔ ویسے جو چیز سب سے پہلے نظر آئے گی، اٹھا لوں گا۔"

58 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟

"انٹرنیٹ سے دلچسپی ہے۔ مگر فیس بک سے خاص نہیں۔ صرف میسج چیک کرنے کے لیے فیس بک استعمال کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ لوگ فیس بک پہ اپنے آپ کو ڈسپلے کرتے ہیں اور مجھے یہ بات پسند نہیں۔"

59 عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟

"عورت۔"

60 کن جانوروں سے ڈر لگتا ہے؟

"چھپکلی۔"

61 خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟

"بزدل۔"

62 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟

"اگر کوئی بدتمیزی کرے یعنی عزت نہ کرے۔"

63 شادی کی رسومات میں آپ کی پسندیدہ رسم؟

"مہندی۔"

64 ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟

"کک کے ہاتھ کا۔"

65 کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟

"ذوالفقار علی بھٹو۔"

66 اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکے ہیں؟

"ابھی تک تو نہیں کیا۔"

67 کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

"فون، والٹ اور گاڑی کی چابیاں۔"

68 اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟

"بالکل کر لیتا ہوں۔"

69 آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟

"اچھی عادت تو یہ ہے کہ میں صاف گو ہوں جھوٹ بالکل نہیں بولتا اور بری عادت یہ ہے کہ میں کسی کام کے پیچھے پڑ جاؤں تو اسے انجام دے کر ہی چین سے بیٹھتا ہوں۔"

70 ہاتھ میں پین آجائے تو کیا لکھتے ہیں؟
"پین کا استعمال تو تقریباً" ختم ہی ہو گیا ہے' جب سے کمپیوٹر آیا ہے۔ پھر بھی پین سے اپنے آئیڈیاز لکھتا ہوں۔"

71 کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟
"کم ہی نکلتی ہیں۔ عموماً" نہیں نکلتیں۔"

72 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
"ہاں جی! کئی مرتبہ۔"

73 مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟
"بڑے مزے کے ہوتے ہیں۔ میں ایک دو پروگرامز میں گیا ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگا۔"

74 بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟
"مجھے ٹائم لگتا ہے سونے میں۔"

75 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتے ہیں؟
"فون' والٹ' ہیڈ فونز' چارجر' اگلی صبح جو چیزیں لے جانی ہوتی ہیں' وہ۔"

76 خدا کی حسین تخلیق؟
"نیچر... سسٹم جو زبردست ہے۔ دن رات کا۔ درخت' پہاڑ' آبشاریں سب کچھ۔"

77 زندگی کب بری لگتی ہے؟
" جب رک جاتی ہے۔ جب کوئی پروگریس (Progress) نہیں کر رہی ہوتی۔"

78 کون سے تہوار شوق سے مناتے ہیں؟
"سارے ہی جو ہماری ثقافت کا حصہ ہیں۔"

79 80 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟
"تو اٹھ جاتا ہوں۔ غصہ نہیں دکھاتا۔"

81 جھوٹ کب بولتے ہیں؟
"تب ہی بولتا ہوں۔ جب کہیں پھنس جاتا ہوں اور جھوٹ کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہوتا۔"

82 اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟
"بہت سی چیزیں۔ (لمبا سانس) اپنے آپ کو بہتر کرنا چاہتا ہوں۔"

83 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتے ہیں؟
"صبح اٹھ جاؤں تو پھر سارا دن فریش ہوتا ہے۔"

84 گھر آکر پہلی خواہش؟
"کھانا مل جائے۔"

85 کون سے چینل شوق سے دیکھتے ہیں؟
"جب سے میں اس فیلڈ میں آیا ہوں' میں نے پاکستانی چینلز شوق سے دیکھنا شروع کیے ہیں۔ تاکہ اپنے آپ کو اپ ڈیٹ رکھ سکوں۔"

86 جس دن موبائل سروس بند ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟
"برا لگتا ہے اور سوچتا ہوں کہ دیکھو اپاکستان کے کیا حالات ہو گئے ہیں۔"

87 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟
"یہ منحصر ہے کہ فقیر کیسا ہے۔"

88 لائٹ چلی جائے پر بے ساختہ جملہ؟
"اویار! یہ کیا ہو رہا ہے۔"

89 اچانک چوٹ لگنے پر منہ سے کیا نکلتا ہے؟
"آوچ۔"

90 کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش! یہ ہمارا ہوتا؟
"امریکا۔"

91 ہم عموماً" کن باتوں پر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟
"فالتو چیزوں پر... لوگوں کی زندگی میں مداخلت کر کے۔"

92 شاپنگ کے لیے آپ کی پسندیدہ جگہ؟
"دبئی' امریکا۔"

93 گھر سے باہر کہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟
"کسی بھی اچھی جگہ پر' جہاں کا کھانا اچھا ہو۔"

94 شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟
"کبھی نہیں۔ پہچان اچھی لگتی ہے۔"

95 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
"ایک بار پھر ٹرائی کروں گا۔"

☆

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بدر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا' جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ' ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے' سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے' سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا' وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کرگیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور' سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

فلزا ظہور' سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور' فاطمہ اور خدیجہ کو فلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کرکے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کررہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا تو لگا' مگر اس نے سعد کو منع کردیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے ہی اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے تنگ کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہوگیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے فلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں' جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر اسے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر رہ گئی۔

آپا رابعہ' سعدیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ اسے آگے نہیں پڑھا سکتیں۔ سعدیہ کے مزاج میں مستقل برہمی آجاتی ہے۔

ماہ نور' سعد کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ فائزہ کا سرد اور دوٹوک انداز سعد کو کچھ اچھا نہیں لگتا' مگر کھاری اور ماہ نور کے تایا' تائی سے مل کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کھاری اور رضوان الحق کی بہت اچھی دوستی ہوجاتی ہے۔ سارہ کے ہاتھوں میں مشاقی آتی جارہی ہے۔ یمی آنٹی اسے سراہتی ہیں اور باتوں باتوں میں اسے کرید تی ہیں کہ وہ رکو کو پسند کرتی تھی۔ سارہ انہیں مبہم سا جواب دیتی ہے۔ جس میں یہ بات نہایت واضح ہوتی ہے کہ سعد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔

سعد' ماہ نور کے ساتھ خدیجہ اور فاطمہ خالہ سے ملنے جاتا ہے۔ ادھر شہناز کا ذکر نکل آتا ہے۔ سعد اس گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے جسے فاطمہ محسوس کرلیتی ہیں۔ پرانا البم دیکھتے ہوئے سعد' فلزا ظہور کی تصویر فوراً" پہچان لیتا ہے۔

چوہدری صاحب نے کھاری کا سعدیہ کلثوم سے رشتہ طے کردیا۔ آپا رابعہ اور مولوی صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ سعدیہ اس گھر سے جان چھوٹنے پر مطمئن ہوتی ہے' جبکہ کھاری حیران اور پریشان ہے۔ وہ بہت انکار کرتا ہے' مگر کوئی اس کی بات نہیں سمجھ پاتا۔ کھاری' رضوان کو اور ماہ نور' سعد کو کھاری کی شادی کی دعوت دیتی ہے۔ سعد' ماہ نور کے علم میں لائے بغیر فاطمہ سے ملنے جاتا ہے اور چند باتیں پوچھتا ہے۔ آپا رابعہ فارم ہاؤس میں داخل ہوتی ہیں۔ سعد پر نظر پڑتے ہی وہ چونک جاتی ہیں۔

—١٤—
چودھویں قسط

وہ غور کرتا بھی تو سمجھ نہیں سکتا تھا کہ کھاری کی ساس اس سے کیوں ملنا چاہتی تھیں' لیکن اس نے یہ بات سوچی ہی نہیں' البتہ وہ اس بات پر اپنے دل میں حیران ضرور ہو رہا تھا کہ وہ ان خاتون کے چہرے سے اپنی نظریں کیوں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ کیسا عام سا چہرہ تھا' بالکل ویسا ہی جیسا عام سی گھریلو خواتین کا ہوتا تھا' پھر کیا تھا جو اسے اپنا دھیان کسی دوسری طرف کرلینے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا میرے بیٹے؟" کچھ دیر بعد اسے ان کی آواز سنائی دی۔

"سعد!" اس نے چونک کر اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا، مگر وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نہیں نکل پایا تھا جو کھاری کی ساس کو دیکھنے پر اس پر طاری ہوئی تھی۔

"میرا نام سعد سلطان ہے۔" اس نے دونوں بازو کمر کے پیچھے باندھتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ شاید پورے جسم کو سہارا دے کر کھڑے رکھنا چاہ رہا تھا۔

"سعد سلطان!" خاتون نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دہراتے ہوئے سامنے دیکھا۔ نجانے کیوں سعد کو لگا کہ وہ اس کا نام سن کر مایوس ہوئی تھیں۔

"میں کتنے دن سے تمہیں یہاں دیکھ رہی تھی۔" وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ کم کرتے ہوئے بولیں۔

"جی!" سعد نے سر کو تعظیماً" ذرا سا جھکا کر کہا۔

"پتا نہیں کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ تم کسی بہت نیک ماں کی اولاد ہو۔" یہ ان کا جملہ انتہائی غیر متوقع تھا، کسی کو محض دیکھنے سے یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ وہ نیک ماں کی اولاد ہے۔ سعد نے سوچا اور لاشعوری طور پر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"بہت پڑھی لکھی، سمجھ دار، نیک طبیعت، نیک دل خاتون ہوں گی تمہاری والدہ... ہیں نا؟" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے یوں سر ہلا دیا جیسے جواب میں صرف وہ سننے کی خواہش مند ہوں جو ان کا سننے کو دل چاہ رہا تھا۔

"جی!" سعد نے ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر دیکھا، کیا اس کے ذہن میں اس سوال کا کوئی مناسب جواب تھا؟

"وہ ویسی ہی ہیں جیسی ستر فیصد مائیں ہوتی ہیں۔" اس کی زبان سے پھسلا وہ سامنے دیکھ رہا تھا جہاں ایک عورت اپلے تھاپنے سے فارغ ہو کر نل کے شفاف اور تیز دھار پانی سے ہاتھ منہ دھو رہی تھی۔ اس وقت وہ خود بھی جان نہیں پا رہا تھا کہ وہ ان کے سوال کا یہ جواب کیوں دے رہا تھا۔ اس کے جواب کے رد عمل میں کھاری کی ساس کے چہرے کے تمام نقوش ذرا دیر کے لیے کھنچ سے گئے یوں کہ وہ خفیف جھریاں جو ویسے بالکل بھی نمایاں نہیں تھیں نظر آنے لگیں۔

"اچھا!" اس بار بولنے کے قابل ہونے میں انہوں نے کچھ وقت لگایا تھا "کہاں رہتی ہیں وہ؟" اب ان کی آواز یوں لگ رہی تھی جیسے کسی اندھے کنویں سے نکل رہی ہو۔

"وہ۔" اس سوال کا جواب دینے کے لیے بھی سعد کو کچھ دیر سوچنا تھا۔ "دراصل ہم لوگ مستقل ایک جگہ پر نہیں رہ پائے۔" اب کے اس نے صاف ان کو ٹالنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا "والد صاحب کے کام کے سلسلے میں ــــــ کبھی ایک شہر کبھی دوسرے شہر اور اکثر ملک سے باہر، میں اب آپ کو کس جگہ کا بتاؤں"۔

"اچھا اچھا!" ان کے چہرے کے نقوش اپنی جگہوں پر واپس آ گئے "جیتے رہو۔ "اللہ بھاگ لگائے رکھے تمہیں بھی اور تمہاری ماں کو بھی، اللہ اونچی حویلیاں، اونچے دروازے عطا کرے، اللہ اتنا دے کہ سمیٹتے تھکو۔ خوش رہو، سدا سلامت رہو۔"

انہوں نے اپنا بازو قدرے بلند کر کے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر اسی ہاتھ کو ہلاتے ہوئے وہ اس ملازمہ کے ساتھ باہر نکلنے کے اس راستے پر مڑ گئیں جس پر چل کے یہاں تک پہنچی تھیں۔

سعد انہیں دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ یکایک اسے ایسا لگا جیسے فضا میں چہار سو سناٹا چھا گیا ہو ایوں کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ اس کے ارد گرد مختلف جگہوں پر ٹولیوں کی صورت بیٹھی اپلے تھاپتی عورتیں جیسے منظر سے ایک دم غائب ہو گئی تھیں، ان کی آوازیں، قہقہے، اپلے تھاپنے اور دیوار پر لگانے کی چٹاخ پٹاخ سب بند ہو گیا تھا اور فضا میں ایک ہی آواز ابھرتی سنائی دے رہی تھی۔

"تم کسی بہت نیک ماں کی اولاد ہو۔" ایک غیر متوقع اور غیر معمولی سوال۔

"نیک والدین کے بجائے صرف نیک ماں کا لفظ کیوں بولا گیا؟"

اس کے دماغ نے سوال کیا۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہی اس نے فوری رد عمل کے طور پر اس راستے کی طرف دیکھا جس پر چل کر وہ خاتون واپس جا رہی تھیں۔ اس کا جسم ایک لمحے کے لیے حرکت میں آیا جیسے اسی راستے پر خاتون کے پیچھے جانا چاہ رہا ہو لیکن پھر وہ وہیں رک گیا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہر کسی کو بتایا جائے کہ جی میری والدہ کا تو میرے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور تب سے اب تک میں بن ماں کے ہی زندگی گزار رہا ہوں۔" دل نے سمجھایا تھا۔

کھاری کی ساس سے تو شاید یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، ان سے کون سا مستقل تعلق رہنے والا تھا جو بعد میں اپنی غلط بیانی پر پکڑے جانے کا امکان ہو۔ ان کا سوال بھی تو سنو "نیک ماں کی اولاد" انہوں نے یہ سوال کیا کیوں بھلا۔ شاید یہ دیہاتی عورتیں جو ہوتی ہیں، وہ اسی طرح سوچتی ہوں، انسان اچھا لگا تو قیافہ لگا لیا کہ نیک ماں کی اولاد ہو گا، نیک دودھ پیا ہو گا وغیرہ وغیرہ...... سو سعد صاحب! اس ایک معمولی سے واقعے پر غیر معمولی سوچ بچار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کو فضول سی عادت ہے اپنا دماغ تھکانے کی"۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر بیڈ پر لیٹنے کے بعد کھاری کی ساس کی غیر متوقع آمد اور بغیر کسی تمہید کے غیر متوقع سوال پر غور کرتے ہوئے اس نے تجزیہ کیا اور اس واقعے کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

"نیک ماں، نیک دودھ" وہ اس روز سہ پہر تک کمبل میں منہ چھپا کے سونے کی کوشش کرتا رہا مگر سو نہیں پایا۔ چار الفاظ پر مشتمل بغیر سوالیہ نشان کے یہ سوال اس کے دماغ پر مسلسل گرز بجاتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آنکھوں کی سوئیاں نکلیں تو وہ چہرہ نظر آ گیا جو اتنا مانوس ہے کہ بے اختیار دل چاہتا ہے، نظریں اس کی بلائیں لے لیں، مگر اس کے ساتھ تو کوئی بلائیں موجود محسوس نہیں ہوتیں، پھر نظریں واری صدقے ہونے سے آگے کوئی دوسرا کام کر ہی نہیں سکتیں، مگر وہ ہونٹ اور وہ زبان کہتی ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو سمجھ کر تمہارے دل کو بے چینی لگی تھی، وہ رویہ کہتا رہا کہ فاصلہ رکھو، فاصلہ رکھو، اپنی اوقات پہچانو۔"

آپا رابعہ نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلی۔

"مگر میں کیسے مان لوں کہ دنیا میں واقعی ایک طرح کے دو چہرے ہوتے ہیں، اور اگر ہوتے ہی ہیں تو میں وہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے دونوں ہی چہرے زندگی میں دیکھنا نصیب ہو گئے۔"

"یا اللہ!" انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا "یہ کیسی بے بسی ہے اور، یہ کیسی بے اختیاری ہے۔ نہ آگے جانے کا کوئی راستہ ہے نہ پیچھے ہٹنے کو دل چاہتا ہے، اس اضطراب کا اس بے چینی کا کیا کروں جو کسی کل سکون نہیں آنے دے رہی۔" انہوں نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے سر کو دبایا۔

"وہ ویسی ہی ہیں جیسی ستر فیصد مائیں ہوتی ہیں۔" ایک جملہ بازگشت کی صورت ان کے گرد پھیلتا تھا سمٹتا تھا اور پھر پھیل جاتا تھا۔

"صبر اور توکل' غنا اور فقر۔" انہیں بار بار کی دہرائی بات یاد آئی۔ "یہ انجام اور ایسا انجام!" انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا' ویرانی اور فاقہ مستی در و دیوار سے لپٹی بے بسی سے مسکرا رہی تھی۔ "عمر بھر صرف محرومی' صرف تلخی' صرف احساس زیاں" ان کے دل میں ایک تلخ احساس جاگا۔

"شاید سعدیہ ٹھیک سوچتی ہے' عمر بھر چور اور سادھ کا کھیل کھیلتے رہنے سے بہتر ہوتا ہے کہ انسان نظراندازی کی ضمانت کروا کر اس قید تنہائی سے جان چھڑا لے' جیسے سعدیہ نے چھڑالی۔۔۔ لیکن کون جانے۔۔۔

"مسائل کے عقوبت خانے میں ایک بار نام کسی کھاتے میں چڑھ جائے تو مستقبل میں کسی موڑ پر پچھلے کھاتے دوبارہ نہ کھل جائیں گے اس کی ضمانت ہے کسی کے پاس۔"

ان کا منتشر ذہن ایک کے بعد ایک سوچ سوچے چلا جا رہا تھا۔ سعدیہ کی شادی کے بعد اس روز وہ کئی دن بعد اپنے گھر واپس آئی تھیں۔ کئی دن تک گھر بند رہنے کی وجہ سے انہیں اندر باہر ہر جگہ ایک عجیب سی وحشت پھیلی نظر آرہی تھی' صحن کی کچی زمین میں دراڑیں پڑ رہی تھیں' یہ ہی حال چھت کا بھی ہوگا انہیں خیال آرہا تھا لپائی کون کرے گا؟ انہوں نے سوچا۔

صحن میں گڑا مٹی کا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا' جانے سے پہلے آخری دن کے بنائے کھانے کے بعد ایندھن کی بچ جانے والی راکھ چولہے کی کوکھ میں دبکی پڑی تھی۔ انہوں نے چولہے کے قریب رکھے راکھ دان کو دیکھا "چولہے سے کرید کرید کر راکھ کون نکالے گا"

سوچتے سوچتے ان کی نظر اس چھوٹے اور عارضی باورچی خانے پر پڑی جسے سعدیہ نے زندگی میں اپنی اولین عملی کاوش سے منظم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی اس باورچی خانے میں داخل ہوئیں' دیوار سے ذرا آگے کو بڑھی مٹی کی شیلف پر قطار در قطار سستے نائیلون کے ڈبے رکھے تھے' نمک' مرچ' ہلدی' پسا دھنیا' گرم مسالہ' انہوں نے ہاتھ لگانے پر پچک جانے والے نائیلون کے ڈبوں کو احتیاط سے کھول کھول کر ان کے اندر جھانکا۔ سب مسالے سیلن زدہ ہوئے پڑے تھے۔

گھر سے غیر حاضری کے دوران ایک دن بارش بھی آئی تھی اور اس عارضی باورچی خانے کی چھت ٹپکتی تھی' بارش کا پانی ان ڈبوں پر پڑا ہوگا' مسالے غارت ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں نجانے کیوں آنسو بھر آئے۔

"یہ سامان زندگی' انسان ذرا سی لاپروائی برتے تو غارت ہو جاتا ہے۔" اس سامان زندگی کا تعاقب کرتا انسان اپنی دونوں ٹانگوں کی طاقت کیسے صرف کرتا ہے' اور یہ طاقت صرف کرتے وقت نہیں جانتا ہوتا کہ جب جان نکلنے پر آتی ہے تو سب سے پہلے ان ہی ٹانگوں سے ہی نکلتی ہے۔" انہوں نے سوچا اور وحشت زدہ ہو کر باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

"دراڑیں پڑتا فرش' ٹھنڈا چولہا' گرد آلود کمرا اور سامان' سیلن زدہ مسالے" انہوں نے وحشت زدہ آنکھیں چاروں طرف گھمائیں۔ "کیا مزید جینے کا' مزید زندگی کا کوئی جواز ہے میرے پاس اب" ایک نیا سوال ذہن سے ٹکرایا۔

"ایک قرض تھا جو ادا ہو گیا' اب کس کے لیے جینا' کس کے لیے جینے کا سامان کرنا؟"

"آب زم زم میں بھگوئی تسبیح اور عجوہ کھجوریں۔" اسی دم ان کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی "اس مولا کے گھر سے لائی ہوں بی بی جی! جس کے در پر اپنی عاقبت سنوارنے کی خاطر گئی تھی۔"

"عاقبت!" ان کے جسم نے یکایک جھرجھری لی "جینے کا جواز پوچھتی ہو رابعہ بی بی! ذرا یہ تو بتاؤ" آگے اپنے ساتھ کیا لے جانے کی سعی کی" ایک سوال ذہن نے کیا۔

"عمر کا آدھا حصہ کھیل تماشے میں گزار دیا' اور باقی کا چھپن چھپائی کھیلتے۔۔۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا سے بچنے کی خاطر چوروں کی طرح کبھی یہاں چھپ کبھی وہاں چھپ۔۔۔ تمہارے ہاتھ پر لہو تھا نہ خنجر۔۔۔ پھر کس ڈر سے دستانے کہنیوں تک چڑھا لیے۔۔۔ نہ صرف چڑھا لیے بلکہ ان کو چڑھائے رکھنے کی خاطر جھوٹ' غلط بیانیوں' دردر کی ٹھوکروں میں بھی پڑی رہیں۔۔۔ اور اب پوچھتی ہو' جینے کا جواز کیا ہے۔۔۔ یہ تو بتاؤ' مرنے کا سامان کتنا اور کیسا کیا؟"

ان کا پورا جسم خوف کے مارے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

"فقر' توکل اور بے نیازی کا جو راگ ایک عرصے سے تم الاپتی اپنے تئیں درویش صفتی اختیار کر رہی تھیں' خود سے ایک بار تو پوچھو کیا اس میں اس شاطرانہ چال کی گنجائش تھی جس کے ذریعے تم نے سعدیہ کا عذاب معصوم کھاری کے سر پر ڈال دیا۔ اور اپنی جان چھڑالی۔۔۔ واہ بھولی معصوم' خدا شناس' درویش بی بی ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تمہارے پس منظر کے یکسوئے جگہ جگہ ادھڑے لپٹے گریبان کی کھونچیں پکڑے نظر آرہے ہیں' لاکھ گریبان کو ظاہر کی چادر سے ڈھانپو' اس کے نیچے کا منظر تو وہی رہے گا۔ کیا اس منظر کو بدلنے کی کوشش نہیں کر سکتی تھیں تم؟"

وہ لرزتی ٹانگوں پر کھڑے رہنے سے قاصر تھیں' صحن کے کونے میں رکھی لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔

"بزدل تھیں' بزدل ہی رہیں' حقیقت سے نظریں چرائے' بس زندگی گزارے جانے کو ترجیح دیتی رہیں' زندگی کی نظروں میں نظریں ڈال لینے کی جرات کرتیں تو درویشی کی اس چادر کی کھونچیں بھی بھری جاتیں اور سعدیہ بھی یوں راہ سے بے راہ نہ ہوتی۔"

"یا اللہ!" سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا "تو جانتا ہے' تو تو جانتا ہے نا' صرف تو ہی تو جانتا ہے۔" آنسو ان کی آنکھوں سے بھل بھل نکلے تھے "ایک میری اکیلی جان اور سوچیں ہیں کہ ان گنت ہیں' یادیں ہیں تو بے شمار ہیں' پچھتاوے ہیں تو بے حساب ہیں۔"

ہلکے نیلے آسمان پر کہیں کہیں اڑتی مہین سی بدلیاں ان کی طرف دیکھ کر جیسے طنزاً" مسکرائی تھیں۔

"جب سر پر پڑتی ہے تو یوں ہی اوپر والے کی طرف رجوع کرنے کا خیال آتا ہے۔" ایک شوخ بدلی نے جیسے اٹھلا کر ان کو مخاطب کیا تھا اور ہوا کے سنگ آگے سرکتی کسی اور مقام پر جا تجی تھی۔

"دیکھا' ذرا سی پریشانی ذہن سے ٹکرائی نہیں اور تم ہو گئیں آپے سے باہر۔" ایک مانوس آواز جسے وہ برسوں قبل کھو چکی تھیں ان کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

"کتنی بار کہا ہے کہ صبر کرنا سیکھو' صبر دنوں کا نہیں سالوں کا چکر ہے بی بی! اور کبھی کبھی تو صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے' دس نسلیں صبر کرتی ہیں تب جا کر ایک نسل کو اس کا میٹھا پھل ملتا ہے' مگر تم ان باتوں کو کیا جانو۔۔۔ دنیا کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی تو جانتیں نا" اس مانوس آواز کی سرگوشی نے ایک بار پھر انہیں حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

"وہ ویسی ہی ہیں جیسی ستر فیصد مائیں ہوتی ہیں۔"

وہ ناقابل یقین' تلخ جملہ ایک بار پھر کان سے ٹکرایا۔ وہ گھبرا کر اٹھیں اور کمرے کے اندر داخل ہو گئیں۔ اب وہ کمرے کے کونے میں رکھے جستی ٹرنک کا تالا بے صبری سے کھول رہی تھیں اس ٹرنک کے تالے کی چابی ان کے بالوں میں پڑے پراندے سے بندھی تھی۔ ٹرنک کا تالا کھلنے پر انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا ڈھکن اٹھایا اور قرینے سے اوپر نیچے رکھے کپڑوں کی تہہ سے ایک خاکی لفافہ نکال کر ٹرنک کا ڈھکن بند کر دیا۔ اس لفافے میں ماضی کی چند تصویریں تھیں۔ پہلی بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں وہ چہرہ نمایاں تھا جس کو وہ لاکھوں کے ہجوم میں بھی

پہچان سکتی تھیں۔ پھر ان کو غلط گمان کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کے دل پر ایک بار پھر سے وہی بے چینی سوار ہونے لگی۔ کیسا فاصلہ رکھنے کا سا انداز تھا' لیے دیے' اپنے خول میں سمٹا ہوا۔ انہیں یاد آیا۔

"نہیں۔" انہوں نے جیسے خود کو سمجھایا۔ "ایک کوشش اور کرنی ہوگی' ایک بار پھر سے سوال کرنا ہوگا۔۔۔ وہ دل جو برسوں سے کھنڈر کی صورت سینے میں رکھا ہے' ایسے ہی تو نہیں جاگا' بلاوجہ تو نہیں کھنچا۔ یونہی تو گواہی نہیں دے رہا۔"

وہ خود کو سمجھاتے ہوئے سر ہلا رہی تھیں۔

اگلے ہی لمحے وہ سعدیہ سے ملاقات کے لیے اس کے پاس جانے کا پروگرام اپنے دل میں طے کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ضروری تو نہیں کہ ہر کسی کے سامنے اپنے ذاتی معاملات کھول کھول کر رکھ دیے جائیں' میں کیوں کھاری کی ساس کو بتاتا کہ مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے اور یہ کہ نیک صفتی تو دور کی بات ان کی تو شہرت اور ذکر ہی بڑا مشکوک ہے" وہ کئی پہر روٹھے بچوں کی طرح کمبل میں منہ دیے سوچتا رہا تھا۔

"نگران خاتون نے واحد یہ ہی سوال کیوں کیا' وہ کہاں بیٹھ کر مجھے آبزرو کرتی رہی تھیں جو انہیں خیال آیا کہ میری ماں بہت نیک خاتون ہوگی۔ میرا خیال ہے' مجھے یہاں سے اب بھاگ لینا چاہیے۔ بہت رہ لیا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اس معاملے کے پیچھے اتنی بری طرح لگا ہوا ہوں شاید اسی لیے ایسی کوئی بھی بات مجھے باقی باتوں سے زیادہ ہانٹ کرتی ہے۔"

سر جھکا کر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا تجزیہ کرتے ہوئے سوچا پھر سیل فون پر بجتی گھنٹی نے اس کے دھیان کو توڑ دیا۔

"السلام علیکم" اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

"وعلیکم السلام۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔ "کیا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ چھٹی کے دن ختم ہونے میں صرف دو دن باقی ہیں۔"

"آپ یاد نہ دلاتے تو بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"اس بار لگتا ہے بن میں جا بسیرا کیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ آپ کے جاسوس تو خاصے کائیاں نکلے خوب پتا چلا لیا۔"

"میری چھٹی حس میری سب سے بڑی جاسوس ہے اگر مانو تو۔۔۔"

"نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں نے اس چھٹی حس کے ہاتھوں بڑے بڑے ٹھگ پکڑے جاتے دیکھے ہیں۔"

"فکر نہیں کرو' اس بار میرا ٹھگوں کے بادشاہ کو پکڑنے کا ارادہ ہے۔"

"واہ واہ۔۔۔ لیکن میں کیوں فکر کرنے لگا' فکر آپ کو ہونا چاہیے یا اس کو جو ٹھگوں کا بادشاہ ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو' بس ذرا فیصلہ ہو لینے دو کہ ٹھگوں کا بادشاہ ہے کون؟"

"جب فیصلہ ہو جائے تو مجھے ضرور مطلع کر دیجیے گا' میں دیکھنا چاہوں گا کہ ٹھگوں کا بادشاہ بنارس سے تعلق رکھتا ہے یا بنگلور سے۔"

"ضرور۔۔۔ ٹھگ پکڑنا میرا کام اس کی بائیولوجیکل ہسٹری جاننا تمہارا کام۔"

"ہاں اس کام میں مجھے یقیناً مہارت ہوتی جا رہی ہے' ہو سکتا ہے آئندہ آنے والے وقت میں' میں بغیر پڑھے

ماہر ٹھگولوجی اور ماہر ارکیالوجی کا درجہ پا جاؤں۔"

"ہو سکتا ہے اگرچہ مجھے اس بیان پر تھوڑا شک ہے' البتہ یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے وقت میں تم بھی گنتی کے اندازے کے بغیر کسی شام چوراسی گھرانے کے فرد بغیر تصدیقی سند کے قرار دیے جا سکتے ہو' کیونکہ تمہاری لائن آف انٹرسٹ کے فل مارکس ادھر ہی کو جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ہاہاہا۔۔۔ گنتی کا اندازہ میں بتا دیتا ہوں۔۔۔ یہ گھرانہ شام چار سو بیس گھرانے کے نام سے مشہور ہوگا' اپنی ڈائری پر نوٹ کر کے رکھ لیجے۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تم نے پتا تو مجھے بھی تھا' ہاں منہ سے یہ عدد نکالتے لاج آتی تھی۔"

"آپ کو بھی لاج آتی ہے۔۔۔ معلومات میں اس اضافے کا شکریہ۔"

"باتوں میں اڑانے کی نہیں ہو رہی۔۔۔ یہ بتاؤ بن میں بیٹھے ہو یا صحرا میں' منگلز کا مسئلہ آ رہا ہے۔"

"یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے میرا نہیں' کہاں ہیں آپ کے سارے تین نمبری جاسوس جو مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں اور آپ کو غلط اطلاعات دیتے ہیں۔"

"رعایت لے جاتے ہو بچو' جاسوسی تین نمبری نہیں ہیں۔"

"اوہو۔۔۔ تو پھر پال کیوں رکھے ہیں' رعایت ہی کی بات ہے تو چلنے دیں یہ رعایتی کھاتہ' محض تیس دنوں کی تو بات ہوتی ہے' آپ نے تیس لاکھ کا خرچا بلاوجہ باندھ رکھا ہے۔"

"وہ اس لیے کہ روکڑا بہت ہے اللہ کے فضل سے' ڈالرز' پاؤنڈز' یوروز' درہم' دینار' ریال اور بیچارا روپیہ الحمد اللہ سب میں کھیلتے ہیں' جب سمجھ میں نہیں آتا کہ مزید کہاں خرچ کریں تو مفت خورے پال لینے کا سودا سر میں سما جاتا ہے۔"

"ارے آپ بنگالی ٹکے کو بھول گئے ہیں' جو کبھی ٹکے کے بھاؤ بکتا تھا۔ آج ٹکے کے مضبوط کرنسی ہونے کے سبب بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ میں آپ کو تب امیر مانوں گا جو آپ ٹکوں میں بھی کھیلنا شروع کر دیں۔"

"تمہاری خواہش سر آنکھوں پر۔۔۔ بس اب کے تم واپس آتے ہو تو اس آئیڈیا پر بھی کام شروع کر دیتے ہیں۔"

"مجھے پتا تھا آپ یہ ہی کہیں گے' آپ کا پسندیدہ ترین موضوع جو ٹھہرا۔ چلیں دیکھتے دو جمع چار ٹکے کرنے کی کوشش میں رات تک کتنے ٹکے جمع ہوتے ہیں' ان کی گنتی کے بعد ہم ان لوگوں سے رجوع کریں گے جن کو ٹکے کے لوگ کہا جاتا ہے۔"

"تمہیں رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے' تمہارا اٹھنا بیٹھنا تو ویسے بھی اکثر ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔"

"آپ سے تعارف نہیں ہے نا میرے ایسے کسی مصاحب کا' آپ سے ملوانے میں آسانی رہے گی' ٹکوں کے متلاشی لوگوں کو۔"

"ہوں۔۔۔ خیر فی الحال تو ایک بار پھر سے یاد کر لو' دو حد سے زیادہ تین دن باقی رہ گئے ہیں۔"

"حد سے زیادہ تین نہیں حد کے اندر ہی تین دن' یہ اکتیس دنوں کا مہینہ ہے' کیلنڈر پر نشان لگا لیں۔"

"چلو میں انتظار کروں گا۔"

"ایک منٹ رکیے۔۔۔"

"ہاں بولو۔"

"یہ بتائیے کہ کسی دیہات کی چھوٹی سی مسجد سے وابستہ کسی مولوی صاحب کے ذکر سے ذہن کے گوشے میں کوئی خیال آتا ہے آپ کو؟"

"خیال نہیں ہے۔۔۔ خیالات ایک نہیں کئی۔"

"واہ۔۔۔ونڈر فل۔۔۔۔ پوچھ سکتا ہوں کیا؟"

"میرا مشورہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص تمہارے اردگرد پایا جارہا ہے تو اس سے دور رہو۔"

"میں آپ کے خیالات جاننا چاہ رہا تھا۔"

"خیالات کے نچوڑ کی روشنی میں ہی یہ رائے دے رہا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن یہ بھی بتایئے کہ صرف کسی ایسے شخص ہی سے دور رہا جائے یا اس کی بی بی سے بھی۔"

"بی بیاں تو مار افسا (فسوں گر) ہوتی ہیں' ان سے اور بھی دور رہنا چاہیے مگر تمہارا کیا علاج کہ بی بیوں میں بیٹھ کر خود کو ڈان ژوان سمجھنے لگتے ہو۔"

"ہاہا۔۔۔ کیا کیا جائے' بیٹا بھی تو آپ کا ہی ہوں۔"

"ہماری کیا کہتے ہو۔۔۔ جوانی میں لوگ وحید مراد سے تشبیہ دیتے تھے ہمیں۔"

"جوانی ہی کیا' ابھی بھی آپ چاکلیٹی امیج رکھتے ہیں۔"

"چلو پھر اپنا خیال رکھو' میں تمہارا منتظر ہوں' اس بار ٹکا ٹکا کھیلیں گے۔"

"ارے وہ مولوی صاحب کی بی بی اور مولوی صاحب تو بیچ میں ہی رہ گئے۔"

"ٹوں ٹوں" لائن منقطع ہو چکی تھی۔

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر سامنے دیکھتے ہوئے سوچنے کے بعد اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا' صبح سے اب تک یونہی سستی میں پڑا تھا' شیو بھی نہیں کی اور کپڑے بھی نہیں بدلے۔

خالی کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتا وہ کھڑکی کے قریب گیا' کھڑکی کھول کر باہر جھانکتے ہوئے اسے ماہ نور کا خیال آیا۔ نجانے اس وقت وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اس کا کمرا بالائی منزل پر تھا۔ کمرے کی مشرقی کھڑکی سے گالف کورس اور سوئمنگ پول صاف نظر آرہے تھے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ سرو کے درخت قطار میں سر اٹھائے کھڑے تھے' باسکٹ بال کورٹ کے ساتھ کنکریٹ کی دیوار کے پار جامن اور آم کے پیڑوں کے جھنڈ تھے' سہ پہر کے وقت شاید ادھر کوئی خاص گہما گہمی نہ ہونے کے باعث درختوں کے جھنڈ پر ہو کا عالم طاری تھا۔ فضا کے سکوت کو کبھی کبھی ابھرنے والی کوئل کی آواز توڑتی تھی اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی تھی۔

اس نے دلچسپی سے آموں کے بور سے لدی شاخوں کو دیکھا جن کی مخصوص مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

کیسی سست مگر کتنی دلچسپ ہے یہاں کی زندگی۔

اس نے سوچا اور کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

☼ ☼ ☼

"ایک' دو' تین' اس نے دائیں پاؤں کے پنجے کو فرش پر ٹکتے ہوئے گنا' ایک دو' تین' وہ اس پنجے کے بل پر ذرا آگے چلی' تین' چار' پانچ' بائیں پاؤں کو حرکت دینے کے لیے گنتی گنتے ہوئے اس کے دل نے مسرت سے اچھلنا کودنا شروع کیا ہی تھا کہ اس کا نصف قدم ڈگمگایا اور اس کا کمزور وجود ہوا میں لہرا کر فرش پر جا پڑا۔

"اوہ" اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا وہ پیٹ کے بل گری تھی' اس کی ہتھیلیاں اس کے وزن کے نیچے اس طرح دب گئی تھیں کہ اس نے گرتے ہوئے وجود کو ان پر تھام لیا تھا۔ سر اٹھانے کے بعد اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے وجود کے نیچے سے نکال کر نظروں کے سامنے کیا' اس پر ہلکا سا نشان پڑ گیا تھا اور وہ سرخ بھی ہو رہی تھی۔

"اور جو چند لمحے پہلے یمی آنٹی نے یہ میز اپنی جگہ سے نہ اٹھائی ہوتی تو میرا سر ضرور ہی اس سے جا ٹکراتا۔" کچھ دیر بعد اس نے اس میز کی ٹانگوں پر ہاتھ ڈال کر اپنے گرے ہوئے وجود کو فرش سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ اس کے چہرے پر اتنی سی مشقت کے نتیجے ہی میں پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ ایک' دو' تین' اس نے اپنے گرنے کی چوٹ سے دکھتے وجود کو کرسی پر گراتے ہوئے ایک بار پھر گنا۔

"You Can Count on me
Like One Two three
Ill be There"

اس کے دماغ میں ایک مختلف زبان میں سنائی گنتی گونجنے لگی۔ تم کو صرف ایک' دو' تین تک گنتی گننے کی ضرورت ہے' اس کے بعد میں تمہارے پاس ہوں گا اس نے انگریزی زبان میں گائے ان لفظوں کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے یاد کیا۔

"میں نے تو تین سے آگے گنتی ہی بھلا دی' مگر جتنی بار یہ تین عدد گن لوں' تم آ کر ہی نہیں دیتے۔" وہ جس سوچ سے فرار حاصل کرنا چاہ رہی تھی' وہ زبردستی اس کے ذہن میں در آئی تھی۔

"نجانے تم کہاں ہو۔۔۔ جبکہ تم نے کہا تھا کہ تم میرے لیے ہر وقت' ہر جگہ موجود ہوتے ہو۔۔۔ دیکھو اب کتنے دن ہو گئے مجھے اس چھوٹے سے فلیٹ میں کبھی پنجوں کے بل کبھی پاؤں پاؤں چلنے کی کوشش کرتے ہوئے' میں تو اس فلیٹ کے کونے کونے تک یونہی گرتے' اٹھتے' پھر سے کوشش کرتے پہنچی ہوں مگر تم کہیں نہیں ہو' نہ خود کہیں نظر آتے ہو نہ گنتی گننے پر سامنے آتے ہو۔" اس نے اپنی اکڑی ہوئی ہتھیلیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے سوچا۔

"ہاں تم اس لڑکی کے ساتھ اس کے گاؤں جو گئے ہو جس کے ساتھ تمہاری ذہنی ہم آہنگی ہے' جو تمہارے ساتھ چل پھر سکتی ہے' تمہاری باتوں پر کھل کر مسکرا سکتی ہے' ہنس سکتی ہے' جو زندگی سے بھرپور ہے' اس لیے کہ اس کے اندر کوئی غم نہیں ہے' اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہے۔ زندگی۔ زندگی کی طرف ہی کھنچتی ہے' زندگی' موت کے سائے سے گھبراتی اور دور بھاگتی ہے' اسے خاموشی اور جمود سے بیزاری ہوتی ہے' اسی لیے' اسی لیے۔" مایوس سوچوں نے یکدم اس پر یلغار کی تھی۔

"ہاں ہاں' سب ٹھیک ہے' سارہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اب تو وہ وہیل چیئر سے اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش بھی کرنے لگی ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کب سے تو وہ چلنے کے تصور سے بھی ڈر رہی تھی' اس لیے عادت نہ رہ جانے کے سبب لڑکھڑا جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم' یونہی اٹھتے' لڑکھڑاتے' گرتے' سنبھلتے۔ ایک دن ضرور آئے گا۔"

"موسم ہاں بھئی موسم یہاں کا بہت سہانا ہو رہا ہے' ہر سو خود رو بوٹیوں پر رنگ برنگ ننھے ننھے پھولوں کے ڈھیر بجے ہیں' پیڑ پورے سب ہرے بھرے ہیں' پہاڑوں کی برف اسی طرح انہیں سفید پوش کیے ہوئے ہے مگر پہاڑوں کا پیش منظر بدل گیا ہے کیونکہ دھوپ کا رخ بدل رہا ہے۔"

"تم بتاؤ' تم کیسے ہو' کہاں ہو' اتنے دن سے غائب کیوں ہو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ رکو میں سارہ کو فون دیتی ہوں۔"

کچن سے آتی یمی آنٹی کی آواز کو اس نے پورے دھیان سے سنا تھا' ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے کان میں پڑا تھا' وہ جانتی تھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ یمی آنٹی کا مخاطب کون تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے تھے۔" اس نے کچن سے باہر نکل کر اپنی جانب آتی یمی آنٹی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یمی

آنٹی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا فون اس کی طرف بڑھایا۔
سارہ نے یمی آنٹی سے فون لیتے ہوئے دانستہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا "سعد ہے۔" یمی آنٹی نے مسکرا کر کہا۔
"ہیلو!" فون کان سے لگا کر وہ سنجیدہ سے لہجے میں بولی۔
"او ہیلو کیا حال اینڈ چال ہے گورجیس؟" دوسری جانب وہ جان دار آواز تھی جس نے ایک پل میں گرنے کے بعد محسوس ہونے والے درد کو رفع کردیا تھا۔
"میں گورجیس نہیں ہوں۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
"نہیں ہو تو کیا ہوا، مجھے تو لگتی ہو نا۔"
"میں ایک بالکل معمولی، بے کار اور ادھوری لڑکی ہوں۔"
"مجھے ڈارک موڈز بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔" دوسری طرف لہجہ سخت ہوا۔
"جب ہی تو تم ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کرنے لگے ہو جہاں کے موڈز اور شیڈز ڈارک ہوتے ہیں۔"
"میری پاس اتنی قسموں کے رنگ اور شیڈز ہیں کہ میں ڈارک رنگوں اور موڈز کو اپنے رنگوں میں اپنی مرضی کے مطابق رنگ سکوں۔"
"ضرور ہوں گے، لیکن ان کا استعمال تم صرف وہیں کرتے ہو جہاں تمہارا دل چاہتا ہے۔"
"آئی ایم سوری میڈم..... لیکن مجھے یہ گفتگو ہرگز اچھی نہیں لگ رہی۔"
"مجھے بھی افسوس ہے، مگر کیا کروں، میرا انداز گفتگو ایسا ہی ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولی۔
"اچھا!" اس نے ٹھہر کر غور کیا "نخرے دکھانے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔
"نخرے تو وہ دکھاتے ہیں جو نخرے دکھانے کے قابل ہوتے ہیں۔"
"ہوں!" وہ ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے رکا "سچ سچ بتانا کہ میری کال آنے سے ذرا دیر پہلے کیا تم میرے بارے میں سوچ کر اداس نہیں ہو رہی تھیں۔"
اس سوال کا جواب اثبات میں تھا، سارہ کو فوری طور پر کوئی دوسرا جواب بن نہیں پڑا۔
"دیکھا۔" وہ زور سے ہنسا "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ صرف تین تک گنتی گننا میں کسی جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔"
"یہ گنتی تو میں پچھلے کئی دن سے گن رہی ہوں..... تم اتنے دن بعد حاضر ہوتے ہو۔"
"تم نے یقین کے ساتھ نہیں گنی ہو گی، دل سے۔"
"پتا نہیں۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔
"ہاں میں جانتا ہوں کہ میں بہت دنوں سے تمہارے پاس نہیں آسکا، دراصل میں یہاں بغیر ارادے کے آیا تھا مگر ارادتاً رک گیا۔"
"میں جانتی ہوں۔" سارہ نے اسی روٹھے لہجے میں کہا۔
"اچھا!" وہ ہنسا "تم تو پھر ماہر علم نجوم ہونے لگی ہو۔"
"میں نے کبھی ستاروں کو نہیں دیکھا، مجھے علم نہیں وہ کس کی چال پہ چلتے ہیں۔"
"دیکھا کرو..... تمہیں اندازہ ہو گا کہ وہ جن کے پاس خود اپنی روشنی نہیں ہوتی وہ کسی دوسرے سے روشنی مستعار لے کر کیسی ٹھنڈی اور خوبصورت روشنی دیتے ہیں۔"
"ہاں ستارے ہی ہوتے ہیں جو ٹوٹتے ہیں اور گرتے بجھتے ہیں۔" سارہ کا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ جیسے چونک کر بولا "چلو میں جلد تمہارے پاس آتا ہوں اور تمہیں اس ستارے کا قصہ سناتا ہوں جو ستاروں کے جھرمٹ میں سب سے روشن اور بڑا ہوتا ہے اور جو نہ کبھی ٹوٹتا ہے نہ گرتا ہے۔"
"تو تم آؤ گے؟" سارہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
"تو اور کیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھ سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"
"تم کب آؤ گے؟" سارہ نے شاید اس کی یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔
"بہت جلد، اسی ہفتے میں کسی دن۔"
"پتا ہے کیا میں نے کروشیے کی سلائی کی نوک سے دھاگے میں پھندے ڈالنے بھی سیکھ لیے ہیں" سارہ کے لہجے میں یکایک مسرت کی پہلی جھلک ابھری۔
"او گڈ..... ڈیٹس ونڈر فل۔"
"اور اب میں ہیٹر سے انڈا بھی پھینٹ سکتی ہوں۔"
"اس سے آگے اس انڈے کا آملیٹ بنانا بھی شروع کردو۔"
"اور جو میں چلتی ہوں نا، جتنا بھی چلتی ہوں، اسی طرح چلتی ہوں جیسے نٹس تاروں پر چلتے ہیں۔"
"کمال کا ہنر ہے یہ تو میں بھی سیکھوں گا۔"
"ہاں ہاں۔ میں تمہیں ضرور سکھاؤں گی۔"
"یار! مجھے جگلنگ سکھانا، مجھے ہوا میں کئی ایک گیند ایک ساتھ اچھال کر انہیں مہارت سے ایک ایک کر کے دبوچنے کا فن سیکھنے کا جنون ہے۔"
"ارے وہ تو کوئی مشکل نہیں، میں یوں سکھا دوں گی ایک دو دن میں۔"
"تمہیں آتا ہے ابھی بھی یہ فن، اتنے عرصے سے اس کی پریکٹس کیے بغیر۔"
"پریکٹس تو نہیں کی کب سے، مگر مجھے یقین ہے ذرا میرے ہاتھ ساتھ دینے لگیں تو میں کرلوں گی مینیج"
"اچھا اچھا" یہ جو رضوان الحق تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کیونکہ اسے جگلنگ اور جوکری چھوڑے عرصہ ہو گیا، اس لیے اسے پریکٹس رہی ہے نہ ہی اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ دوبارہ اسے ٹھیک طرح سے کر سکے گا۔"
"کوئی اناڑی جوکر اور جگلر ہو گا، جو ہاتھ ہی اٹھا بیٹھا، ہمارے بلیو ہیون میں تو ایک سے ایک ماہر تھا اپنے اپنے کام کا....."
"جیسے سارہ خان ماہر تھی ماہر ٹریپز آرٹسٹ، ماہر ایکروبیٹ۔"
"ماہر ہوتی تو یوں گرتی......" اس نے منہ بنا کر کہا۔
"گرتے تو شہسوار ہی ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھنا۔"
"بہت دفعہ سن چکی ہوں کہ شہ سوار ہی گرتے ہیں۔"
"صرف سنا ہی نہ کرو، کان بھی دھرا کرو بیوٹی فل!"
"دیکھا پھر تم مجھے لفظوں میں پھنسانے لگے۔" وہ خوش ہوتے دل پر قابو پاتے بولی۔
"تم مت پھنسو، کچھ باتیں صرف سنا کرو۔" وہ ہنسا۔
"میں جانتی ہوں کہ میں بیوٹی فل نہیں ہوں۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔
"بیوٹی فل لفظ کی مختلف کیٹگریز ہیں میرے نزدیک، میری کیٹیگری کے مطابق تمہارے لیے یہ لفظ بہت مناسب ہے۔"
"تم واقعی اسی ہفتے آرہے ہو نا۔" وہ سب کچھ بھلا کر خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"ہاں واقعی ان شاء اللہ۔"

"چلو پھر میں انتظار کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور سامنے دیکھا تاحدِ نظر اگا سبزہ اچانک ہی اچھا اور تازگی بخش نظر آنے لگا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے' اپنا خیال رکھنا" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"شاید تمہارے لیے سب لوگ ایک سے ہی ہیں۔" اس نے فون میز پر رکھتے ہوئے سوچا میں ہوں یا وہ لڑکی ماہ نور یا کوئی اور۔۔۔ بات اتنی ہے کہ تم خود بہت اچھے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے بلند پہاڑوں پر نظر ڈالی اور کرسی کے بازوؤں پر ہاتھوں سے زور ڈال کر ایک بار پھر کھڑی ہو کر گریہ پائی کے لیے تیار ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیسے خانہ بدوش ہیں' اگر یہ وہی لوگ ہیں جو پچھلے سال بھی تمہیں یہیں ملے تھے تو یہ خانہ بدوش تو نہ ہوئے نا۔" ماہ نور نے آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔

"خانہ بدوشوں میں بھی موبیلٹی کم ہو گئی ہے شاید۔" سعد نے مسکرا کر کہا اور کھلے میدان میں گڑے ان گندے' میلے' ٹوٹے' پھٹے خیموں کی طرف چل دیا' جو یہاں کے مکینوں کے مکان تھے۔ ماہ نور نے لمحہ بھر کے لیے جھجک کر اس بستی کی طرف دیکھا جس کے مکینوں کے ننگ دھڑنگ بچے مکھیوں کی یلغار کے درمیان کھیل رہے تھے۔ سعد نے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا' ماہ نور کو اپنی جگہ ساکت کھڑے دیکھ کر وہ مڑ کر واپس آیا۔

"کیا ہوا رک کیوں گئیں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ماہ نور نے ایک نظر سعد کو دیکھا' بلیک جینز' میرون پولو شرٹ اور بلیک سن گلاسز میں بلاشبہ وہ خاصا ہینڈسم لگ رہا تھا' پھر اس نے ایک نظر ان جھونپڑیوں پر ڈالی۔ "اس کا دل کیسے چاہتا ہے ان لوگوں سے ملنے' ان میں بیٹھنے کو۔" وہ سوچ رہی تھی۔

"چلو گی یا یہیں رک کے رہنا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ماہ نور نے چونک کر اسے دیکھا' پھر گلے کو ہلکا سا کھنکھارنے کے بعد آگے چل دی' سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا اور تیز قدموں سے چلتا جھونپڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ ماہ نور اس کے پیچھے تھی' سائبانوں کے سائے میں زمین پر کپڑا بچھا کر لوڈو کی گوٹیوں کی طرح کی گوٹیاں پھیلائے تین چار مرد کوئی کھیل کھیلنے میں مگن تھے۔

"یہ پانسا کھیل رہے ہیں' پانسا سمجھتی ہو؟" سعد نے رک کر ماہ نور کے کان میں سرگوشی کی۔ ماہ نور نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"السلام علیکم!" ماہ نور کی طرف مسکرا کر دیکھنے کے بعد اس نے ان آدمیوں کو مخاطب کیا۔ وہ سب کھیل چھوڑ کر ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

"اتنی جلدی بھول گئے بھائی نیامت! جو یوں منہ اٹھا کر دیکھ رہے ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اوئے بسم اللہ' اوئے بسم اللہ' خیر ہوئے تمہاری' جی آیاں نوں باؤ جی' جی آیاں نو۔" ان میں سے ایک مرد جس نے شانوں تک بال بڑھا رکھے تھے اور آنکھوں میں سلائیاں بھر بھر کے سرمہ ڈال رکھا تھا' اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو شکر ہے' کسی نے تو پہچانا۔" سعد اس سے گلے ملتے ہوئے بولا۔ میلے' بدبودار کپڑے اور تیل سے چپڑے بال جو شاید کئی دنوں سے دھلے نہ تھے اور چپکے ہوئے لگ رہے تھے' ماہ نور نے سعد سے گلے ملنے والے شخص کو دیکھ کر جھرجھری سی لی۔

"او پہچانا کیوں نئیں باؤ جی! تسی تو اپنے بھائی ہو جی۔" اس شخص نے سعد کی کمر پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"سے خیراں۔ نیامت کا تپاک دیکھتے ہوئے قریب بیٹھا سب سفید بالوں والا ایک بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "باپو (بابا جی) میں نے باندر نچانا اے۔"

"میں وی تماشا دکھانا اے" بوڑھا شخص بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سیدھی کھڑی کر کے اسے ہلاتے ہوئے بولا' غالباً" اسے سعد کی گزشتہ خواہشات یاد آ رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد سعد ان لوگوں میں گھل مل کر زمین پر بچھے کپڑے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ماہ نور ذرا فاصلے پر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں میں آ کر جیسے سعد کو بھول ہی گیا تھا کہ وہ ماہ نور کو بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔

"او مائی۔۔۔ باؤ صاحب آیا ہے' کوئی شربت' کوئی پانی!" وہ شخص جسے سعد نے نیامت کہہ کر بلایا تھا۔ اٹھ کر ایک قریبی جھونپڑی کے اندر جھانک کر بولا' اندر سے نجانے کیا جواب ملا تھا۔

"باؤ باندر والا۔" جس کے جواب میں نیامت نے غالباً" وضاحت کی تھی۔

"بسم اللہ' بسم اللہ۔" جواب میں ایک بوڑھی عورت جھونپڑی کے اندر سے نکلی جس نے سرخ چھینٹ کے کپڑے پہن رکھے تھے' اس نے انگلیوں میں مختلف طرح کے چھلے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں رنگ برنگ چوڑیاں' اس کی ناک میں چھوٹی سی نتھنی بھی موجود تھی۔ سیاہ رنگت والی اس عورت نے باہر آ کر چٹ پٹ سعد کی بلائیں لینا شروع کیں۔

"ویرے (بھائی) پار (پچھلے سال) جدھوں توں گیا میں رج کے روٹی نا ئیں کھاری" (جب سے تم یہاں سے گئے ہو میں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا) وہ عورت سعد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی۔

"میں باؤ کو بتا رہا تھا کہ اس بار نادرے (نادر) کے پاس ودھیا (عمدہ) جوڑی ہے' بندر اور بندریا کی۔" نیامت بلند آواز میں بولا۔

جواب میں سعد مسکرایا۔ نہیں بھائی نیامت! میں اس دفعہ بندر کا تماشا دکھانے نہیں آپ لوگوں سے ملنے آیا ہوں صرف۔" ماہ نور کو محسوس ہوا اس کی اس بات سے اس کے اردگرد موجود لوگوں میں قدرے مایوسی سی پھیل گئی تھی۔

"میرا خالی کنستر وجدا اے (میرا خالی کنستر بجتا ہے) اس نوں آٹا لوری دا اے آٹا چاہیے۔" ایک درمیانے عمر کی عورت جس کا حلیہ کم و بیش بوڑھی عورت جیسا تھا نجانے کہاں سے نکل کر سعد کی سمت بڑھی تھی۔

"او جا اوئے تسی زنانیاں بس آٹے چول توں اگے نہ جائیو" (او جاؤ۔ تم عورتیں بس آٹے چاول سے آگے مت سوچنا) سعد کے قریب بیٹھے ایک ادھیڑ عمر شخص نے حقارت سے اس عورت کی طرف دیکھا اور حقے سے کش لگانے لگا۔

"اے اے ہی کون اے!" اس عورت نے ادھیڑ عمر آدمی کی بات پر سر جھٹک کر ــــ کچھ فاصلے پر کھڑی ماہ نور کو دیکھا۔ سعد نے گردن موڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"کھڑی رہو گی۔" وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ "بیٹھ جاؤ نا!"

"کہاں بیٹھوں!" ماہ نور قدرے ناگواری سے بولی۔

"یہ ایک چارپائی تو بالکل تمہارے قریب رکھی ہے۔" سعد نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس پر۔" ماہ نور نے بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا اور پھر چارپائی پر نظر ڈالی' میل سے جس کے نائیلون کا رنگ چھپ چکا تھا اور جس پر مکھیاں ایک دبیز چادر کی صورت بھنک رہی تھیں۔

"باؤ صیب! اے تیری عورت اے نا؟" وہ عورت جس نے ماہ نور کی موجودگی کو نوٹ کیا تھا آگے بڑھ کر ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ماہ نور کا منہ اس جملے پر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"منہ بند کرلو' مکھیاں نہ اندر چلی جائیں۔" سعد یقیناً" اس عورت کی بات پر محظوظ ہو رہا تھا جب ہی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"نہیں سکینہ! یہ میری عورت ہے نہ میں اس کا مرد ہوں' ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں بس۔" اس نے عورت کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا تھا' ماہ نور کو لگا محض الفاظ سے ملنے والا لمحاتی خوش کن احساس سعد کی وضاحت کے اندر دم گھٹنے سے فوراً" ہی مر گیا تھا۔

"وڈے لوکاں وچ کڑیاں منڈے آپس وچ دوست ہوندے نیں' ٹھیک آخدے او۔" (بڑے لوگوں میں لڑکیاں اور لڑکے آپس میں دوست ہوتے ہیں' ٹھیک کہہ رہے ہو) عورت نے دانش مندانہ انداز میں سر ہلایا جیسے سعد کی وضاحت سمجھ گئی ہو۔

"آؤ بی بی! بیٹھو' کوئی شربت پانی پیو' اساں غریباں دے ڈیرے تے مٹھے والے پانی نوں ہی شربت آخدے' جا او کاکا' ہٹی توں برف پھڑ لیا (آؤ بی بی بیٹھو' شربت پیو' ہم غریبوں کے ڈیرے پر تو شکر والے پانی ہی کو شربت کہتے ہیں' جاؤ بچے جا کر دکان سے برف لے آؤ۔" عورت نے ماہ نور کے سامنے ایک نسبتاً" صاف نیچا مونڈھا رکھتے ہوئے ایک بچے کو برف لینے دوڑایا۔

"اور سکینہ! تم؟" سعد نے دوبارہ زمین پر بچھے کپڑے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "غلام حسین کمائی کر کے لاتا ہے یا ابھی بھی نشہ کر کے پڑا رہتا ہے۔" جواب میں سکینہ اسے کوئی لمبی کتھا سنانے لگی۔ ماہ نور مونڈھے کے کنارے پر ٹکی سعد کی گفتگو ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی سعد کے قریب ادھورے' پورے کپڑوں میں ملبوس بچے آتے اسے ہاتھ لگاتے اور کھلکھلا کر واپس بھاگ جاتے' ان میں سے کچھ بچے بالکل ننگ دھڑنگ بھی تھے' سعد ان بچوں کی حرکتوں اور شرارتوں کا ذرا بھی برا مانے بغیر انہیں اپنے قریب بلا بھی رہا تھا اور ان کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کر رہا تھا۔ سکینہ کا پیش کردہ میٹھا شربت جو وہ سلور کے گلاس میں لائی تھی اس نے غٹاغٹ پی لیا تھا' جبکہ ماہ نور نے ویسا ہی گلاس جو اسے پیش کیا گیا تھا اپنے پاؤں کے قریب زمین پر رکھ دیا تھا' چند ہی لمحوں میں اس گلاس میں مکھیاں گرنے کے بعد اس کی سطح پر تیرنے لگی تھیں۔

"بی بی نے شربت نئیں پیتا (بی بی نے شربت نہیں پیا)" باتیں کرتے کرتے سکینہ کی نظر ماہ نور کے پاؤں کے قریب رکھے گلاس پر پڑی' ماہ نور نے دیکھا' سعد کے چہرے پر ناگواری کا ایک موہوم سا سایہ لہرایا اور غائب ہو گیا۔

"لے کاکا۔ تو پی لے۔" سکینہ نے گلاس ماہ نور کے قدموں سے اٹھایا اور قریب سے گزرتے ایک بچے کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا اور گلاس کی سطح سے چھنگلی کی مدد سے تیرتی مکھیاں نکال کر باہر پھینکنے لگی۔ ماہ نور کو ابکائی آ گئی۔

"یہ مت پلاؤ بچے کو' انفیکشن ہو جائے گا اسے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے سکینہ کو منع کرتے ہوئے کہا مگر اس کے منع کرتے کرتے ہی سکینہ مکھیوں سے خلاصی حاصل کر کے گلاس بچے کو پکڑا چکی تھی' ماہ نور کے نہیں نہیں کرنے کے دوران بچہ گلاس منہ سے لگا کر اسے پی بھی چکا تھا۔ ماہ نور نے مایوسی' حیرت اور پریشانی کے عالم میں سعد کی طرف دیکھا۔

"اس کو انفیکشن ہو جائے گا' تم دیکھ لینا۔" اس نے جیسے سعد کو خطرے سے آگاہ کیا۔

"فکر مت کرو' یہ لکڑ ہضم پتھر ہضم قسم کے بچے ہیں' انہیں کچھ نہیں ہوتا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ اسی دم کندھے پر جھولا لٹکائے' بندر اور بندریا کی ڈوری انگلی میں پھنسائے' ایک ریچھ کے پیچھے چلتا ایک شخص اس سمت آیا۔

"او خیر ہو باؤ جی کی۔" اس نے سعد کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ اور اپنا سامان ایک طرف رکھ کر گرمجوشی سے سعد کے گلے ملنے لگا۔ ماہ نور' اس شخص کے دھول سے اٹے کپڑے اور جوتے دیکھ رہی تھی' اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی' اس نے اپنے میلے تیل سے چپڑے بالوں پر جو تقریباً" اس کے شانوں تک آئے ہوئے تھے سفید کپڑا باندھا ہوا تھا۔ اس کی انگلیوں میں موٹے موٹے نگوں والی انگوٹھیاں تھیں اور دائیں بازو میں کالے رنگ کا دھاگا رسٹ بینڈ کی شکل میں بندھا تھا۔

"ذرا بھی اس کو اپنے کپڑے خراب ہونے کی پروا نہیں' کیسے اس کے گلے مل رہا ہے۔" ماہ نور نے بے ساختہ دوپٹے کا کونا ناک پر رکھتے ہوئے سوچا۔ سعد اب اس نووارد سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اب دوپہر ڈھل رہی تھی اور جھونپڑی کے باہر رکھے اینٹوں کے عارضی چولہوں میں آگ جلائی جا رہی تھی۔ ماہ نور نے صفائی کا ذرا سا بھی خیال رکھے بغیر ترکاری بناتی' چاول بینتی' مسالا بھونتی خانہ بدوش عورتوں کو غور سے دیکھا اور ان کے معیار زندگی کا اندازہ لگاتے اوبھ کر دوسری سمت دیکھنے لگی جہاں طویل' صاف سڑک تھی اور اس پر رواں دواں ٹریفک۔

"تم اب یہاں سے واپس چلنا پسند کرو گے یا ان لوگوں کے ساتھ رات کا کھانا تناول فرمانے کا بھی ارادہ ہے؟" سڑک سے نظریں ہٹا کر اس نے سعد کو انگریزی زبان میں مخاطب کیا۔

"اگر مجھے تمہارے چہرے پر اتنی بیزاری اور ناگواری صاف نظر نہ آ رہی ہوتی تو یقیناً" میں ایسا ہی کرتا۔" اس نے ایک چھوٹی بچی کی مٹھی سے کچے چاول نکال کر پھانکتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔ ماہ نور نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اوکے' اوکے۔" اسے سعد کی آواز سنائی دی۔ "چلو واپس چلتے ہیں۔" ماہ نور نے دیکھا وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی تک جا کر اس میں سے ایک چھوٹا سا بیگ نکال لایا۔ اس بیگ میں کافی سارے سکے تھے جو اس نے مٹھیاں بھر بھر کے ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے بچوں میں بانٹنا شروع کیے' اب بچے شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے ارد گرد جمع تھے۔

عورتیں اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس چھوٹے سے ہجوم کی طرح متوجہ ہو گئیں۔ مرد اس منظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ بچوں سے نمٹنے کے بعد اس نے چند عورتوں کو کچھ رقوم تھمائیں اور چھوٹا سا خالی بیگ بندر والے کو تھما دیا' سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے میں اس نے مزید پندرہ بیس منٹ لگا دیے' ماہ نور آہستہ قدموں سے چلتی گاڑی تک آئی اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو کر سعد کے ان لوگوں سے رخصت ہونے کا منظر دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے میں نے تمہیں اپنے ساتھ لا کر غلط کیا۔" گاڑی میں بیٹھ کر اسے سڑک پر لانے کے بعد وہ نیچی آواز میں ماہ نور سے مخاطب ہوا۔ "تم بہت بور ہوئیں یہاں آ کر۔"

"بور ہونے کا تو مجھے پتا نہیں' ہاں حیران ضرور ہوئی۔" ماہ نور نے سامنے سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں اس سارے میں حیران ہونے والی کون سی بات تھی؟" اس نے کہا' ماہ نور نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا' پہلی بار اس نے سعد کے لہجے میں برہمی جھلکتی محسوس کی تھی۔

"حیران ہونے کی بات ہی تو تھی۔" اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ اس کا اپنا لہجہ کیوں درشت ہو گیا تھا۔ "تم ان میلے کچیلے' ان پڑھ اور جاہل لوگوں میں کیسے گھل مل کر بیٹھے تھے' تمہیں نہ تو وہاں کی گندگی بری لگ رہی تھی نہ وہاں موجود جراثیموں کے انبار سے بچنے کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تم تھے' تمہارا دل کیسے چاہ رہا تھا اتنی گندگی میں یوں بے تکلفی سے بیٹھنے کو' انسان کا کوئی اپنا معیار بھی ہوتا ہے' کوئی اصول اور ضابطہ بھی ہوتا ہے زندگی گزارنے کا۔"

وہ بغیر رکے بولے چلی جا رہی تھی۔ "انسانی ہمدردی اچھی چیز ہے' مگر اس کو جتانے کے لیے کچھ اور طریقے بھی

استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ان لوگوں میں بیٹھ کر ان جیسے ہی ہو کر ہمدردی جتائی جائے۔"
بولتے بولتے وہ سانس لینے کو رکی' اس نے دیکھا' سعد کے چہرے پر عجیب سا تناؤ تھا' اس کے جبڑے بھچے ہوئے تھے اور آپس میں یوں جڑے ہوئے تھے کہ اس کے چہرے کی جلد بھی کھنچی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہو گئی' وہ سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔ کچھ دیر ماہ نور کے مزید بولنے کا انتظار کرنے کے بعد اس کی خاموشی محسوس کرکے اس نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالی۔
"بس یا کچھ اور بھی!" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا اور گردن سیدھی کرکے سامنے دیکھنے لگی۔
"میں معذرت خواہ ہوں میں نے واقعی تمہارے ساتھ برا کیا جو تمہیں وہاں لے گیا' کسی اچھے اینٹی جرمز بیکوبیڈ (جراثیم کش محلول) کو اپنے غسل کے پانی میں ملا کر اچھی طرح نہا لینا واپس جاکر اور یہ جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں ان کو آگ لگا دینا تاکہ جراثیم مزید پھیلنے کا خدشہ نہ رہے۔"
اس کے لہجے میں طنز کی واضح آمیزش تھی' ماہ نور نے ہلکے سے سر جھٹکا اور جواب دینے کے بجائے خاموش رہی۔
"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے کپڑوں' ہاتھوں اور چہرے سے چمٹے جراثیم کہیں اس ایئر کنڈیشنڈ بند گاڑی میں اڑ اڑ کر تمہیں نہ چمٹ جائیں لیکن میں معذرت خواہ ہوں' فی الحال میں اس کا کوئی بندوبست نہیں کر سکتا۔ مجبوراً" تمہیں میرے ساتھ ہی واپس جانا ہوگا۔" وہ مزید بولا۔
"ہاں' جہاں تک میرے ان لوگوں میں یوں گھل مل کر بیٹھنے کا سوال ہے تو بتاتا چلوں کہ یہ میں ہوں جسے ان لوگوں کے پاس جانے اور ان سے ملنے کا شوق ہے' قصور تو میرا ہے ان کا نہیں کیونکہ ان کا تو طرز زندگی ہی یہی ہے' مجھے علم ہے کہ وہاں گندگی ہے' جراثیم ہیں سوچنا تو مجھے چاہیے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں' ان کی زندگیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے مجھے براہ راست ان میں اٹھنا بیٹھنا پڑے گا' یہاں کوئی سائبر سرچ یا ضخیم کتاب میری وہ مدد نہیں کر سکتی جو میرا اپنا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں جاکر اجنبیت محسوس نہیں ہوتی' کیونکہ ان لوگوں کی خواہشات کے دائرے' بہت محدود اور معصوم ہیں' خصوصاً" ان کی عورتوں اور بچوں کے۔ مجھے ان سے مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی خواہشات کو محدود کیسے رکھا جاسکتا ہے' اپنے قد سے اونچی چھلانگیں مارنے سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ ان کے اور اپنے اخلاقیات کے فرق کو جانچ کر مجھے صحیح اور غلط کا مزید اندازا" ہو جاتا ہے' تو پھر لالچ تو سارا میرا ہے' خواہش تو میری ہے ان سے ملنے کی۔ برا اور غلط بھی پھر میں ہی ہوا نا۔ معیار تو میرا کم ہوا نا۔ ان کو کیوں حقارت سے دیکھ رہی تھیں' مجھے حقارت سے دیکھنا چاہیے تھا تمہیں۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ماہ نور نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔
"اور یہ تو بتاؤ تمہیں ان سے گھن کیوں آرہی تھی؟" اس نے درشتی سے سوال کیا۔ "ان کے میلے کپڑے' گرد آلود جوتے' تیل سے چپڑے بالوں کو دیکھ کر تمہیں ابکائی کیوں آرہی تھی؟" جبکہ یہ وہی حلیہ تھا جس میں پہلی بار تم نے مجھے دیکھا تھا' بندر کے تماشے والا' میلے کا سائیں' سید پور کا کمہار۔ کیا عطر میں بسا ہوا اور جیکوزی ہاتھ لیے ہوئے تھا۔" اس کا لہجہ تیز ہوا۔ "ان سب نے تمہیں اتنا کیوں اٹریکٹ کیا کہ تم نے ہر جگہ ان کا پیچھا کیا اور اپنے Self Esteem کی پروا کیے بغیر کون ہو' کون ہو تم کا نعرہ لگاتے کیوں بھاگتی پھری تھیں؟"
ماہ نور کا دماغ گھوم رہا تھا۔ نرمی سے بات کرنے والا' شرارت سے چھیڑنے اور تنگ کرنے والا' سنجیدگی سے سمجھانے والا' اداسی سے اپنا ذاتی دکھ سنانے والا' باتوں باتوں میں معنی خیز جملے کہنے والا سعد' اس وقت اس کے ساتھ کیسا تلخ اور بدلحاظ ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن اس کے اس روپ کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر غور کیا اور

پھر اسے لگا کہ اس تلخ اندازی میں سعد نے گویا اس کا اپنا آپ اس کے اپنے سامنے ظاہر کر دیا تھا۔
"بڑی بڑی باتیں کرنا' اونچے آدرشوں کو گفتگو کا حصہ بنانا' سلمز اور لوانکم ایریا کو موضوع بنا کر فلمیں ڈرامے بنانا اور کتابیں' مضمون لکھنا بہت آسان ہے' کچھ وقت ان حالات میں گزار کر ان کے مسائل کا اندازہ لگانا' ان کے کلچر اور طرز زندگی کے رنگ سمجھنا دوسری بات۔" اب سعد نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا' شاید اسے اپنے لہجے کی تلخی اور آواز کی تیزی کا احساس ہو گیا تھا۔
"میرا طریقہ یہ نہیں ہے' میں نے ہمیشہ خود کو ایسے لوگوں سے متعلق کرکے ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شاید میں لاشعوری طور پر ان لوگوں میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی جڑیں مجھے ملیں یا نہ ملیں' ان لوگوں اور ایسے لوگوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اللہ کے خالق تقدیر ہونے پر میرا ایمان زیادہ پختہ ہو گیا ہے۔" اس نے کہا اور ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔
"کبھی وقت ملے تو سوچنا کہ کیا ہوتا جو تم کسی ایسی بستی میں پیدا ہوئی ہوتیں' تمہارے والدین ان ہی میں سے ہوتے اور ایسا ہی تمہارا لائف اسٹائل ہوتا۔ پھر تم کیا کرتیں' تمہیں تو کبھی پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ زندگی کیا اور کیسی ہوتی ہے' جو تم اب گزار رہی ہو۔" ماہ نور کو لگا اس کے چہرے پر کسی نے زناٹے کا طمانچہ مارا ہو۔
"ہم جو بھی ہیں' جیسے بھی ہیں اس میں میرا اور تمہارا کوئی کمال نہیں' یہ سب اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں' وہ انسانوں کو رنگ' نسل' قبیلے' خطے' ملک' خاندان' مرتبے' مقام عطا کرنے والا ہے۔ یہ بھی سوچنا کہ ہم کتنا شکر ادا کرتے ہیں اپنی زندگی میں' جو کچھ ہمیں عطا کیا گیا ہے۔" سعد کا لہجہ نصیحت آمیز ہونے لگا تھا۔
"شاید میں غلط سوچتی ہوں' شاید میری عقل اور میرا شعور بہت محدود ہے۔" کافی دیر بعد ماہ نور کی آواز گاڑی میں ابھری۔ "شاید میری نظر کوتاہ ہے' جب ہی میں حقیقت کو تہہ تک جاننے سے محروم رہتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ناراض کر دیا۔" اس نے گردن موڑ کر سعد کی طرف دیکھا اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔
"نہیں' میں ناراض نہیں ہوں۔" اس نے اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے ہاتھوں کی انگلیاں اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی۔
"But Let me say you have disappointed me a little."
(لیکن تم نے مجھے تھوڑا سا مایوس کر دیا)۔
ماہ نور استعجاب بھری نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی' وہ اتنا ہی صاف گو تھا کہ اسے اپنی بات صاف صاف کہہ دینے میں کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ سیدھا کیا اور سڑک کو دیکھنے لگی۔ باقی کا راستہ خاموشی میں ہی کٹ گیا۔ فارم ہاؤس پہنچ کر سعد نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے اپنا سیل فون اور والٹ اٹھایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ ماہ نور اسی طرح اپنی سیٹ پر جامد بیٹھی تھی۔
"آج سردار انکل نے خصوصی ڈنر کا انتظام کیا ہوا ہے۔" ماہ نور کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی پر بازو ٹکا کر اندر جھانکا "لیکن وہاں شاید صرف جینٹس مدعو ہیں۔"
ماہ نور اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے بازو میں پڑے واحد کڑے سے کھیلتی رہی۔
"ٹھیک ہے' پھر کل ملیں گے۔" وہ ماہ نور کی خاموشی سے شاید اندازہ لگا چکا تھا کہ فی الحال وہ کچھ نہیں بولے گی۔ ماہ نور نے چند لمحوں بعد اسے اندرونی عمارت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼
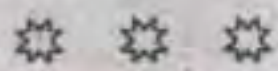
کمہاری زندگی کے خوبصورت رنگوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انہیں برتنے کا سلیقہ سیکھ رہا تھا' کس

خانے میں کون سا رنگ، کس رنگ کا جوڑ کون سے رنگ کے ساتھ بنتا ہے، اسے یہ فن سیکھنے میں مزا آرہا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں بجتی چوڑیوں کی آواز، ہنسی اور سرگوشی کی جھنکار اور خوشبو کا چھڑکاؤ سب اچھے لگتے تھے۔ سعدیہ، جسے خود زندگی برتنے کا سلیقہ نہیں تھا، راتوں رات کھاری کی استاد بن گئی تھی۔ اسکول میں گزرے آخری ایک سال کے تجربے سعدیہ کے ساتھ ساتھ کھاری کے بھی رہنما بن رہے تھے۔ وہ کھاری کو اسکول کی ان لڑکیوں کے قصے سناتی جن کے اپنے کسی کزن، کسی محلے دار، کسی رشتہ دار سے معاشقے چل رہے تھے، کھاری کی آنکھیں ایسے قصے سن کر پھیلتی جاتیں۔

"سعدیہ باؤ! ایہہ تے گناہ ہوناہے۔" وہ بے ساختہ کہتا۔

"لوگوں کو کوئی نہیں لگتا گناہ شناہ!" وہ ایسے کہتی جسے کوئی بہت بڑی عمر کی سیانی خاتون تبصرہ کررہی ہو۔

"مجھے پورا فارم ہاؤس تو دکھاؤ، ایک ایک کمرا، ایک ایک حصہ۔" وہ اٹھلا کر فرمائش کرتی۔ اور وہ یوں سہلاتا جیسے کہہ رہا ہو سب دکھاؤں گا مگر کچھ دن بعد۔

"یہ کتنی بھولی اور معصوم ہے، اس کو یہ نہیں سمجھ لگ رہی میں فارم ہاؤس کا مالک نہیں ہوں میں تو ادھر چاکری کرتا ہوں۔" وہ دل میں سوچتا "سارا قصور ہی چوہدری صیب کا ہے، انہوں نے بڑھ چڑھ کر شادی میں خرچہ کیتا شادی کے دھوم دھڑکے کو دیکھ کر اس بے چاری کا دماغ آسمان پر چڑھنا ہی ہے خیر میں اس کو ہولے ہولے سمجھادوں گا کہ ہم نے ادھر چاکری کرنی ہے مالکی نئیں۔ پر ابھی نہیں سمجھاؤں گا ابھی بتایا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" اس کے دل میں سعدیہ کے لیے محبت امڈتی۔

"یار ایہہ محبت بھی کیا شے ہے!" کبھی وہ ڈیری فارم پر کھڑا اپنی پسندیدہ ولایتی بھوری بھینس کو مخاطب کرکے کہتا "کیسے تیرے ساتھ محبت کے درجے سے اٹھ کر سعدیہ سے محبت کے درجے تک چھلانگ لگادی افتخار احمد نے ہوتی تو یہ اچھی چیز ہے لیکن ہوتی بہت سخت ہے۔" وہ بھوری بھینس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتا۔

"پہلے میں ادھر آتا تھا تو سارا دن کام میں لگا رہتا تھا۔ کبھی کہیں اور جانے کا خیال نہیں آتا تھا لیکن اب ادھر آتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ جلدی سے کام ختم کروں اور واپس سعدیہ کے پاس اڑ کر چلا جاؤں" وہ سوچتا اور پھر اپنی ہی سوچ پر سر جھٹک کر ہنس دیتا۔

زندگی کی جہت بدل گئی تھی۔ جانوروں کا چارہ کترتے ہوئے، ان کو چارہ ڈالتے ہوئے، دودھ دوہتے ہوئے، سبزیوں اور پھلوں کی چھنائی کراتے ہوئے انہیں ٹرکوں پر لوڈ کرواتے ہوئے اس کا دماغ اور دھیان سعدیہ کی طرف ہی رہتا۔

"وہ کیا کررہی ہوگی، نجانے اس نے کچھ کھایا کہ نہیں، کہیں وہ اداس نہ ہورہی ہو، کہیں میری عدم موجودگی میں اسے کوئی کچھ کہہ نہ دے، میں نے ہر حال میں سعدیہ کو دودھ، مکھن اور گھی کھانے پینے کی عادت ڈالنی ہے، یہ کیا بات ہوئی کہ چیزوں کی اتنی فراوانی ہو اور سعدیہ انہیں استعمال نہ کرے، چوہدری صاحب نے تو کبھی پلٹ کے پوچھا بھی نہیں کہ کہاں اور کتنا گا، جب یہ سارے ملازم عیش کرسکتے ہیں ان چیزوں پر تو سعدیہ کیوں نہیں۔"

وہ دن بھر الٹی سیدھی باتیں سوچتا، بے دلی سے اپنا کام نمٹاتے میں مصروف رہتا اور جیسے ہی ذرا فرصت ملتی شہر بھجوائے جانے والے پھولوں کے ڈھیر میں سے ایک خوشنما، خوشبودار پھول ٹہنی سمیت چنتا اور خلقت سے چھپاتا، چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتا اپنے کمرے کی طرف کھسک آتا۔ سعدیہ کے لیے ہر روز نئے رنگ نئی شکل اور نئی طرح کی خوشبو۔ الا پھول لے جانا اس کی عادت بنتی جارہی تھی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کے ساتھ سچے اور مضبوط تعلق کے احساس نے کھاری کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا تھا۔

ان ہی مشغلوں میں مشغول قریب تھا کہ کھاری اپنی زندگی میں موجود ہر دوسرے شخص سے لاتعلق اور بے نیاز ہو جاتا کہ اسے آپا رابعہ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اس بلاوے نے کئی دن پیچھے کھاری کو سعدیہ کی علاوہ کسی اور کی یاد دلائی تھی، اپنی فطری سادہ لوحی اور مروت کے زیر اثر وہ دل میں شرمندہ ہوگیا۔ کیا کہتی ہوں گی بھین جی! کھاری کا ظرف کتنا چھوٹا نکلا، مولوی صاحب اور بھین جی کی اتنے دنوں سے خبر تک نہیں لی۔

لیکن عجیب بات ہے کہ میں نے کبھی سعدیہ کی زبان سے اس کے ماں باپ کا نام تک نہیں سنا، مجھے شک ہے کہ اس کے اندر کوئی بڑی گہری بات ہے، چلو جو بھی بات ہے، سعدیہ جانے اور اس کے والدین جانیں، بھین جی میری استاد ہیں۔ میں نے ان کی بات سن آؤں نالے (ساتھ) ان کو سلام کر آؤں۔

اس نے فیصلہ کیا اور دودھ والی گاڑی کو رخصت کرتے ہی سیدھا آپا رابعہ کی طرف چلا آیا۔

"میں آپ کو کس طرح بھول سکتا ہوں بھین جی!" آپا رابعہ کے گلہ پر شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے سر جھکا کر کہا "آپ تو میری استاد ہو، سیدھی راہ پر ڈالنے والی ہو، مجھے میرا اور آپ کا تعلق ماں پتر والا ہے، یہ جو نیا رشتہ بن گیا ہے یہ بعد کی بات ہے، ماں پتر کا استاد شاگرد کا رشتہ پرانا ہے اور اس نئے رشتے سے کہیں اوپر ہے۔"

اس نے شرمندگی کے گہرے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔

آپا رابعہ کے گھر آکر بہت دنوں بعد اسے لگ رہا تھا کہ وہ پہلے جیسا کھاری بن گیا تھا، ذہن و دل جو ہر وقت سعدیہ کے خیال میں غرق رہتے تھے، اس خیال سے وقتی طور پر آزاد ہوگئے تھے۔

"اصولاً تو مجھے تمہیں اور سعدیہ کو ادھر رہنے کے لیے بلانا چاہیے تھا۔" آپا رابعہ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا لیکن تم دیکھ رہے ہو گھر کی کیا حالت ہورہی ہے، مجھ میں اب اتنا دم نہیں رہا کہ پلک جھپک سب کچھ ٹھیک کردوں، آہستہ آہستہ لگی ہوئی ہوں گھر کو ٹھیک کرنے میں، جب سب چیزیں درست اور اپنے ٹھکانے پر آجائیں گی تو تم دونوں کو بلاؤں گی اور یہاں رکھوں گی چند دن، ابھی تم جانو کہاں یہ ہمارا گھر اور کہاں تم لوگوں کی رہائش، تم دونوں یہاں آکر تنگی محسوس کروگے۔" آپا رابعہ نے سادگی سے کہا۔

"کیسی باتیں کررہے ہو بھین جی، ہم کون سے لاٹ صاحب کی اولاد ہیں جو یہاں تنگ ہوں گے، ایک حساب سے تو یہ ہی اپنا گھر ہے، جو مولوی سیب کے کام کے بدلے ملا ہے، باقی ہم جہاں رہتے ہیں وہ تو مالکوں کی مرضی کا ٹھکانہ ہے، جب تک ان کو راضی رکھا وہاں رہے جاؤ، جب وہ ناراض ہوگئے تو چلو جی اپنا بستر بوریا باندھ لو۔" کھاری نے اداس ہوتی آپا رابعہ کو اپنے تئیں خوش کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں کہیں گے کبھی بھی، تم فکر مت کرو۔" آپا رابعہ نے اسے تسلی دی "یہ بتاؤ تم خوش ہو؟" انہوں نے غور سے کھاری کی طرف دیکھا، خوشی جس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"بھین جی! اچی گل تو یہ ہے کہ میں تو خوش ہونا ابھی سیکھا ہوں، پہلے مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ خوش ہونا کیسا ہوتا ہے، میں تو بہت کم عقل اور بے وقوف تھا۔"

"زندگی کا محور بہت محدود ہے، نا تمہارا! اس لیے اتنی جلدی خوش ہوگئے ہو۔" آپا رابعہ نے کہا "میری دعا ہے کہ تمہاری یہ خوشی ہمیشہ قائم رہے۔"

"میں نئیں جانتا بھین جی کہ کل کیا ہونا ہے" میں نے کہا نا۔ میری عقل کم ہے اور میری نظر زیادہ دور تک نہیں جاتی" کھاری نے سادگی سے اعتراف کیا۔

"میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کھاری! تم نے زندگی میں حقیقی خوشی کبھی دیکھی نہیں اس لیے اس خوشی کے جو بے دان کے قابو آگئے ہو، جو بے دان کی گھٹن محسوس ہونے اور بڑھنے لگی تو پھر تمہارے جیسا بندہ کیا کرے گا، مجھے یہ سوچ سوچ کر ہول اٹھتے ہیں۔" آپا رابعہ نے یہ بات سوچی مگر کہی نہیں۔

"سعدیہ کیسی ہے؟" ان کی زبان پر یہ سوال کئی بار آیا، مگر انہوں نے اسے لفظوں میں نہیں پوچھا۔ عجیب سی

بات تھی' وہ اور کھاری ادھر ادھر کی باتوں میں شعوری کوشش کرتے ہوئے سعدیہ کا ذکر نہیں آنے دے رہے تھے۔

"سعدیہ نے بھین جی سے جو باغیانہ گفتگو کی' ان کے لیے جیسا اس کا حقارت آمیز لہجہ ہوتا ہے' میرا نہیں خیال مجھے آج سعدیہ کے بارے میں کوئی بات کرنی چاہیے۔" کھاری نے اپنے تئیں سوچا تھا۔

"میں نے اس سے سعدیہ کے متعلق پوچھا تو نجانے کیوں مجھے لگتا ہے میرا بھرا دل بہہ نکلے گا اور میرے منہ سے ایسی باتیں ادا ہو جائیں گی جو اس کی چند روز پہلے شروع ہوئی خوشیوں میں زہر گھول دیں گی۔ مجھے سعدیہ کے موضوع پر بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔"

آپا رابعہ نے فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس لیے کھاری اور آپا رابعہ کی اس دن کی گفتگو کے دوران سعدیہ کا ذکر نہیں آیا۔ آپا رابعہ اس کو سپارہ باقاعدگی سے پڑھنے کی تلقین کرتی رہیں اور اپنے کام میں دل لگانے کی نصیحت بھی۔ کھاری نے آپا رابعہ کی نصیحتوں پر ہوں ہاں کرتے ہوئے ایک دوبار انہیں غور سے دیکھا۔ وہ صاف پریشان اور وحشت زدہ نظر آرہی تھیں۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ' تمہارے کام رکے ہوئے ہوں گے۔" تقریباً" ایک گھنٹے کے بعد آپا رابعہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھین جی!" کھاری نے آپا رابعہ کا ہاتھ اپنے سر سے اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا جو بات ہے وہ آپ کہہ کیوں نہیں دیتیں' آپ کے دل پر جو بوجھ ہے تم سے دل میں کیوں رکھے بیٹھی ہیں" آپا رابعہ نے ردعمل میں اپنا ہاتھ تیزی سے کھاری کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"بیٹا بنایا ہے تو بیٹا سمجھیں بھی۔" کھاری نے ان کا ہاتھ دوبارہ پکڑتے ہوئے کہا۔ آپا رابعہ نے نظریں اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ کیا میں تمہاری بات کا یقین کرلوں۔

"آپ آزما کے تو دیکھو ایک بار!" کھاری نے ان کو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

آپا رابعہ نے عادتاً" دوپٹے کا پلو اپنے چہرے پر پھیرا اور سر پر اوڑھا دوپٹا ایک بار اتار کر دوبارہ سر پر اوڑھا۔

"بات بتائیں بھین جی؟" کھاری نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"کھاری تمہاری شادی پر باہر سے جو مہمان آئے تھے' وہ کون تھے؟" آپا رابعہ کی سمجھ میں آرہا تھا کہ بات شروع کہاں سے کریں۔

"وہ جو جاپان سے آئے تھے؟" کھاری کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہوئے بولا۔

"جاپان سے آئے تھے!" آپا رابعہ نے حیرت سے کہا۔

"کون سے مہمان بھین جی؟" کھاری نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جو میرا یار دوست آیا تھا' جاپانی خرگوش وہ؟"

"نہیں۔ جو چوہدری صاحب کا مہمان تھا' وہ جو بعد میں بھی ادھر ہی تھا۔"

"چوہدری صیب کا مہمان۔" کھاری نے سر کھجاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"مہ نور باجی دا بھائی؟" کچھ یاد آنے پر اس نے آپا رابعہ کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ماہ نور کا بھائی تھا؟" آپا رابعہ کو جیسے شاک لگا تھا۔

"باؤ سلمان!" کھاری نے سوچتے اور غور کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی اور بھی مہمان تھا' ان لوگوں کے علاوہ؟"

"نہوں۔" کھاری کو فوری طور پر یاد نہیں آرہا تھا۔ "او ہوئے" پھر اس نے سر پر چت لگاتے ہوئے ہنس کر کہا

"سعد صیب' باؤ سعد..... ان کی بات کر رہی ہیں نا آپ؟" اس نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"وہ کون ہے سعد؟" آپا رابعہ نے پوچھا۔

"او' او مہ نور باجی کے فرینڈ ہیں۔"

"ماہ نور کا فرینڈ!" آپا رابعہ کو دوسرا شاک لگا۔

"اوئے بھین جی! بڑے لوگوں میں لڑکیاں اور لڑکے آپس میں دوست ہوتے ہیں۔" کھاری آپا رابعہ کے چونکنے پر ہنس کر بولا۔

"اچھا!" آپا رابعہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا" کچھ پتا ہے' یہ لڑکا کون ہے' اس کا آگا پیچھا کیا ہے؟"

"بڑے کوئی امیر لوگ ہیں جناب!" کھاری نے سنجیدہ سا چہرہ بنا کر کہا' اس کے چہرے پر جیسے سعد کی امارت کی ہیبت طاری تھی "پر بندہ بڑا عاجز اے اس کے ساتھ بیٹھے بندے کو احساس ہی نئیں ہوتا کہ یہ کوئی بڑا بندہ ہے۔" کھاری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یوں سرگوشی کی جیسے کسی کے سن لینے کا ڈر ہو۔ "اس کی آواز بھی کمال ہے' اتنا پیارا اور دل سے گاتا ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"کھاری!" کھاری کی یہ بات سن کر آپا رابعہ کا جسم جیسے جھٹکوں کی زد میں آگیا تھا۔ "اس کا پتا لگاؤ' وہ کون ہے۔ اس کا باپ کون ہے وہ کہاں سے آیا ہے۔" وہ شدت جذبات سے رونے لگی تھیں "تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔" انہوں نے کھاری کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "مجھے اس کے آگے پیچھے کی کوئی خبر لادو"

"او بس بھین جی بس!" کھاری نے تیزی سے آپا رابعہ کے جڑے ہوئے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "تسی حکم کرو میں سب پتا کر دیتا ہوں' مگر یہ تو بتائیں بات کیا ہے؟"

آپا رابعہ نے متورم آنکھوں سے کھاری کو دیکھا' روتے ہوئے ان کا دوپٹا سر سے اتر گیا تھا' ان کے کھچڑی بال بکھرے ہوئے تھے' صاف لگ رہا تھا' انہوں نے کئی دن سے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔

"میرے دل پر بڑا بوجھ ہے کھاری! برسوں کا جمع کیا ہوا بھاری بوجھ۔" انہوں نے بدقت الفاظ ادا کیے تھے۔

"اتار دیو بوجھ۔ مجھے دے دیں اپنے بوجھ بیٹا بنا ہوں تو بن کر دکھاؤں گا۔"

"کیا تمہارے سینے میں اتنی وسعت ہے کہ میرے دل کا بوجھ اس میں یوں سما سکے کہ کسی دوسرے کان کو خبر نہ ہو' کیا تمہارے شانوں میں اتنی ہمت ہے کہ اس بوجھ کو ساتھ لیے پھرو اور کسی دوسرے کو پتا نہ چلے۔" آپا رابعہ نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

"الحمد اللہ!" کھاری نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے سر جھکا کر کہا تھا۔

آپا رابعہ نے ایک بار کھاری کو بے یقینی سے دیکھا' وہ ابھی تک سینے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ آپا رابعہ نے اس سے آگے مزید سوچے اور دیکھے بغیر بولنا شروع کیا' ان کا سامع افتخار احمد عرف کھاری مبہوت بیٹھا ان کی داستان طلسم ہوش ربا سن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ نے ٹاٹ کی بوری کا سلا ہوا منہ قینچی سے کاٹ کر کھولا' اور بوری کے اندر جھانک کر دیکھا۔ بوری ان گنت پرانے جرائد سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے سب سے اوپر رکھا رسالہ نکالا۔ یہ ایک رسالہ نہیں تھا بلکہ ایک کور کے اندر کسی پرانے سن کے بارہ مہینوں کے بارہ شمار سلے ہوئے تھے۔ فاطمہ نے اوپر کا کور کھول کر پہلا پرچہ دیکھنا شروع کیا' پرانے ہو جانے کی وجہ سے پرچے کے صفحات زرد پڑ چکے تھے اور ان میں بوسیدگی بھی آچکی تھی۔ دو تین صفحات پلٹنے کے بعد فاطمہ کے نتھنوں سے بوسیدگی کی بو ٹکرانے کے باعث چھینکوں کا ایک لمبا سلسلہ

شروع ہوگیا، لیکن وہ ان پرانے شماروں میں یوں کھوگئی تھیں کہ انہیں الرجی چھینکوں اور ناک منہ سرخ ہونے کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ شام ڈھلے جب وہ ایک طویل مطالعہ کے بعد اپنے کمرے سے نکلیں تو ڈائننگ ٹیبل کی سطح پر کپڑا پھیر کر اس پر گرا پانی خشک کرتی خدیجہ نے دیکھا۔ فاطمہ کی ناک اور آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور ان پر سوجن بھی نمایاں تھی۔

"ہیں! تمہیں کیا ہوا بیٹھے بٹھائے؟" انہوں نے رومال ناک پر رکھ کر مسلسل چھینکیں مارتی فاطمہ سے کہا۔

"کچھ نہیں، شاید فضا میں پولن بڑھ رہا ہے۔" انہوں نے رومال سے ناک رگڑتے ہوئے کہا۔

"پولن بڑھ رہا ہے۔" خدیجہ نے ڈائننگ روم کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتے ہوئے کہا۔ "پولن کا موسم تو گزر چکا۔" انہوں نے حیرت سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"اچھا!" وہ ناک پر رومال رکھ کر چھینکنے کے بعد بولیں "مجھے شاید اب اثر کررہا ہے جاتا پولن۔"

"کوئی اینٹی الرجی کھالو فوراً۔" "تمہارا خاصا برا حال ہے" خدیجہ نے کہا اور واش بیسن پر ہاتھ دھونے لگیں۔

"ہاں، لے لیتی ہوں" فاطمہ نے ہولے سے سر ہلایا "اینٹی الرجی لینے سے وقت سے پہلے نیند آنے لگے گی۔ اور مجھے تو ابھی سعد کو ضروری کال کرنی ہے۔ تین چار بار اسے کال کرچکی ہوں، اس نے اٹینڈ نہیں کی۔" وہ سوچ رہی تھیں۔

"تمہارا فون بج رہا ہے شاید۔" خدیجہ کی آواز نے انہیں ان کی سوچ سے چونکایا "کمرے میں ہی رکھ آئی ہو فون۔"

"او ہاں!" انہوں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ ان کا سیل فون ان کی بیڈ سائیڈ پر رکھا تھا اور اس کی اسکرین پر جلتی بجھتی روشنی میں "سعد کالنگ" کے الفاظ نمایاں ہورہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے یہاں قیام کے دوران میں نے تمہاری کمپنی کو بہت انجوائے کیا، تمہارے ساتھ گفتگو کا مزا ہی کچھ اور ہے۔" چوہدری سردار نے مسکراتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا جو کمرے کے کونے میں رکھے صوفے پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں نیم دراز تھا۔

"مجھے بھی بہت مزا آیا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے سوفٹ ڈرنک کے ٹن کو ہلاتے ہوئے کہا "جن جن چیزوں کا میں نے پہلے بھی سرسری مشاہدہ کیا تھا، انہیں تفصیل سے دیکھنے کا موقع مجھے یہاں قیام کے دوران ملا —— یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔"

"کھاری کی شادی ایک زبردست موقع ثابت ہوئی تم سے تفصیلی ملاقات کا۔" چوہدری صاحب بولے۔

"کھاری کی شادی!" سعد نے ایک بار پھر ٹن کو ہلایا، زیادہ دیر فریزر میں رکھے رہنے سے اس کا محلول ہلکی برف کی شکل اختیار کرچکا تھا اور اب وہ اسے ہلا ہلا کر دوبارہ مائع شکل میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔

"ویسے انکل! ایک بات تو بتائیں، کھاری آپ کو ملا کہاں سے تھا۔ آپ کو اس کا آگا پیچھا کچھ معلوم نہیں ہے کیا؟"

اس نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ "اس کے آگے پیچھے اور آپ کو ملنے کے متعلق بہت سی Myths میں یہاں کے مختلف لوگوں سے سن چکا ہوں، لیکن آپ سے یقیناً میں بالکل اصل بات کی توقع کرتا ہوں۔"

چوہدری صاحب سعد کی اس بات پر ہولے سے مسکرائے۔

"اس بیچارے کا آگا پیچھا معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی آپ نے کبھی؟" سعد نے کہا۔

"کوشش تو میں جب کرتا جب مجھے خود معلوم نہ ہوتا۔" کمرے کی خاموشی میں چوہدری صاحب کا غیر متوقع جواب ابھرا۔

"کیا مطلب؟" سعد کا مشروب کا ٹن ہلاتا ہاتھ رکا، اس نے مارے تجسس کے ٹن میز پر رکھا اور اپنی نشست سے ذرا آگے کو کھسکا۔

"آپ کو معلوم تھا؟" وہ حیرت سے بولا "اور آپ نے اسے اس کے ماں باپ تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔"

"اس کی ماں اسے ایک بس اسٹیشن کے ٹکٹ گھر کے قریب رکھ کر خود غائب ہوگئی تھی۔" چوہدری صاحب کی آواز آئی۔

"اوہ۔ تو آپ کو پھر اس کا آگا پیچھا کیسے پتا چلا، اگر ماں غائب ہوگئی تھی۔" وہ قصے سننے کا شوقین دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

"میں نے اسے بچے کو وہاں رکھتے دیکھا تھا، اس لیے۔" چوہدری صاحب کی آنکھیں سکڑ کر خلا میں کسی نکتے پر جمی ہوئی تھیں جیسے کوئی پرانا منظر ان کی نظروں کے سامنے چل رہا ہو۔

"پھر؟" سعد حسب عادت مزید متجسس ہوا۔ "آپ نے اس عورت کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"میں پیچھا کرتا یا صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتا، جیسے ہی مجھے صورت حال سمجھ میں آئی۔ اور میں روتے ہوئے بچے کی طرف بڑھا، وہ وہاں موجود سب لوگوں کو جل دے کر غائب ہوچکی تھی۔"

"وہ مایوس ہوا "پھر آپ کو اس کے آگے پیچھے کے بارے میں تو کچھ علم نہ ہوا نا۔ ایک اجنبی نامعلوم عورت بچہ لاوارث چھوڑ کر غائب ہوگئی۔ آپ اس کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتے نا کہ وہ کون تھی اور کھاری کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔"

"وہ نامعلوم عورت نہیں بلکہ ایک نامور عورت تھی، اس لیے میں وثوق سے کھاری کے پس منظر کو جاننے کا دعوا کرسکتا ہوں۔" چوہدری صاحب نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"نامور عورت" قصے سننے کے شائق کے لیے یہ ایک انتہائی دلچسپ موڑ تھا۔ "کون تھی وہ نامور عورت؟" اس نے سوال کیا۔

چوہدری صاحب اٹھ کر کمرے کی مغربی دیوار کے دریچے کے قریب جا کھڑے ہوئے اس دیوار پر نامور مصوروں کی پینٹنگز کی نقول بجی تھیں۔ کچھ دیر دریچے سے باہر جھانکنے کے بعد چوہدری صاحب سعد کی طرف مڑے اور ایک قصہ سنانا شروع ہوئے، قصے سننے کے شائق کے اردگرد جیسے سب کچھ جامد اور بے آواز ہوچکا تھا، جو سنائی دے رہا تھا اور دکھائی دے رہا تھا، وہ ایک بڑا اور تلخ سچ تھا۔ اس کی سماعت اور بصارت دونوں ہی جواب دینے لگی تھیں۔

کتاب ہجراں ندارم جاں
نہ لیہو کیسے لگائے چھتیاں

چوہدری صاحب نے بات ختم کرنے کے بعد اپنے سامع کی حالت سے بے خبری میں کمرے کے مشرقی کونے کا رخ کیا اور لکڑی کے دیوار گیر شیلف میں سجے گراموفون کا بٹن دبادیا۔ ایاز قوال کی آواز میں امیر خسرو قوالی کی ترنم چہار سو پھیل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شبان ہجراں دراز چوں زلف

وروز وصلت چو عمر کو تاہ
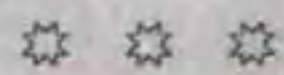
ماہ نور بالائی منزل سے آنے والی آواز پر کان لگائے کہ گانے والے کی آواز اور موسیقی کی لے لاجواب تھی۔ وہ مسحور سے انداز میں آگے بڑھی اور کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کے قریب کھڑے ہونے پر آواز زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اس نے مسکرا کر بالائی منزل کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ آواز اس حصے میں سنائی دے رہی تھی جہاں سعد کا قیام تھا۔

"کتنا باذوق اور مہذب شخص ہے یہ اور میرے دل کے کتنے قریب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا "کل سے یہ مجھ سے ناراض ہے اور میرا دل چاہتا ہے جاؤں اور اسے مناؤں مگر جھجک میرے قدم روک دیتی ہے چلو ابھی جاتی ہوں اور مناتی ہوں۔"

اس نے پیروں میں چپل پہنی اور صوفے کی پشت پر رکھا دوپٹا اٹھا کر اوڑھا۔ کمرے سے باہر نکل کر طویل راہداری عبور کرنے کے بعد جب وہ بالائی منزل کی طرف جاتے زینے کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا۔ سفید ٹراؤزر اور نیلی پولو شرٹ میں ملبوس سعد تیزی سے عمارت کے عین سامنے کھڑی اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اپنا سامان پھینکنے کے انداز میں رکھ رہا تھا۔

"ہیں! یہ سامان کیوں رکھ رہا ہے؟" وہ آگے بڑھی' سعد نے پاؤں میں وہ پٹی کی وہ چپل پہن رکھی تھی جو وہ گھر میں پہنتا تھا۔ ماہ نور نے منتظر نظروں سے دیکھا۔ وہ اندر آئے گا اور اسے راستے میں کھڑا دیکھ کر رکے گا' لیکن اس کی منتظر نظریں منتظر ہی رہیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سعد گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے اسے موڑ کر باہر جانے والے راستے پر لے گیا تھا۔

ماہ نور پریشانی اور عجلت میں بھاگ کر باہر نکلی تھی' پل کے پل میں سعد کی گاڑی طویل روش پر نظروں سے دور ہوتی غائب ہو گئی تھی۔ ماہ نور نے پریشان اور حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایسا کوئی نظر نہیں آیا جو اسے بتا سکتا کہ سعد اتنی عجلت میں اس وقت کیوں اور کہاں گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی ابھی بھی حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہی تھی جس پر سے سعد گاڑی نکال کر گیا تھا۔ بالائی منزل پر گراموفون ابھی بھی ریکارڈ بجا رہا تھا۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں

تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

فضا میں یکایک گرد آلود ہوا چلنے لگی تھی' یہاں وہاں کاغذ' سوکھے پتے اور بکھری چیزیں اڑنے لگی تھیں۔ گرد آلود ہوا' رفتہ رفتہ تیز ہو رہی تھی اور در و دیوار سے سر پٹکنے لگی تھی۔ بالائی منزل سے آتی آواز بھی جیسے اچانک گریہ کرنے لگی تھی۔

جو چشم سوزن چو ذرہ حیراں

ہمیشہ گریاں بہ عشق آں مہ

ماہ نور حیرت زدہ نظروں سے گرد آلود آسمان اور بگولے اٹھاتی آندھی کو چلتے دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

خاک ہوئی آسی

رابعہ سرخ دوپٹا اوڑھے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی ساس اسے بیڈ پر بٹھا کر گئی تھی۔ کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ اس سے خالد کی۔

"وہ بہت نیک ہے' دل کا بہت پیارا ہے' ایسا ہے' ویسا ہے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ الفاظ اس کے کانوں میں پہنچ ضرور رہے تھے' لیکن نشان نہیں چھوڑ رہے تھے۔ باتیں سن' ضرور رہی تھی' سجھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ گئیں' تو وہ کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ ارمان نہیں رہے تھے تو ارمانوں کی سیج پر بیٹھنا کیسا۔ میک اپ نہ ہونے کے برابر تھا۔ چوڑیاں پہنی تھیں۔ بندے اور ہلکے سے کام والا شلوار سوٹ... وہ بمشکل ہی دلہن لگ رہی تھی۔

آج شام اس کا نکاح ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ گھر آئے تھے۔ یہ رابعہ کی دوسری شادی تھی اور خالد کی بھی رابعہ کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

پہلی شادی پر اس نے جس چاہ سے ہاتھ پاؤں رنگے تھے۔ دوسری پر اس کا جی چاہا کہ منہ پر سیاہی تھوپ کر جنگل بیابان میں نکل جائے۔

وہ مر کر بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک بار تیزاب پینے کی کوشش کی اور ایک بار چوہے مار گولیاں کھائیں مگر دونوں ہی بار بچ گئی۔

اس کی پہلی شادی پانچ سال پہلے ہوئی تھی' ڈیڑھ سال چلی اور بھی چل جاتی اگر۔۔۔

☼ ☼ ☼

اونچا لمبا جوان تھا شوکت' اچھی شکل و صورت کا' لیکن اس کی آنکھوں میں جال تھا' پھندے جیسا جال' ایسا پھندا جو اس کا دم گھوٹ رہا تھا' وقت نکل رہا تھا لیکن دم نہیں نکل رہا تھا۔

اس نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور دیر تک دیکھتا رہا پہلے وہ شرمائی' پھر گھبرائی اور پھر خوف زدہ ہو گئی۔ جیسے بھیڑیے کی آنکھیں گھپ اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ رابعہ کو شوکت کی آنکھیں ایسی ہی لگیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا پتلیوں کو ہلائے بغیر۔ وہ اس کا شوہر تھا یا۔۔۔ اس نے ایک ہنکارا بھرا' دلہن کا دل جو کسی اور طرح دھڑک رہا تھا' اب کسی اور طرح سے دھڑکنے لگا۔ اس کے نتھنوں سے دھواں سا نکلا' جیسے لڑاکا بھینسا ہو۔

"جمال سے دور رہنا۔" آواز میں درندگی در آئی' جمال اس کے دیور کا نام تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

"کوئی چکر وکر تھا تیرا' ہو گا ضرور ہو گا۔۔۔ کوئی پیچھے آتا تھا۔۔۔ کہاں کہاں جاتی تھی؟"

اس کا سر تیزی سے نفی میں ہلنے لگا۔ اگلے سوالوں پر وہ ہلتا سر بھی رک گیا۔ وہ پوچھتا ہی جا رہا تھا' پھر اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ شوہر ہو کر بھی یہ سوال درست نہیں تھا' لیکن یہ کون طے کرتا کہ کیا درست تھا اور کیا غلط؟ رابعہ کا دل ٹوٹ کر سیج پر بکھر گیا۔ وہ سوال کیے جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی آنکھوں میں چور ڈھونڈ رہا ہو۔

"پانی!" اس نے گردن کو سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھی اور اسے پانی دیا۔ پھر اس نے بیڈ سے لٹکتے پیروں کو زمین پر ٹکایا اور آنکھ سے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ عین اس کے پیروں کے نیچے جھک گئی۔ ذرا اور بیڈ کے نیچے اس کی چپل پڑی تھی۔ اپنے لہنگے اور دوپٹے کو سنبھالتی وہ جھکی۔ اور اس کی چپل نکالی۔

وہ اسے اٹھا کر۔۔۔ چلا کر۔۔۔ اس کا چال چلن دیکھ رہا تھا' شوکت کے ہر ہر انداز پر رابعہ کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ میٹرک پاس تھی' فقط اٹھارہ سال کی تھی۔ صورت کی بھی پیاری تھی۔

دو نندیں تھیں اس کی۔ ایک بڑی شادی شدہ اور ایک سب سے چھوٹی جو شادی شدہ نند کے پاس ہی رہتی تھی۔ سسر حیات نہیں تھے۔ ایک دیور تھا جمال۔۔۔ ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوا تھا۔ سبزی منڈی میں کام کرتا تھا۔ ساس دمے کی مریضہ تھی' گھر سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ رابعہ آگئی' اس نے سنبھال لیا' گھر کو بھی۔۔۔ ساس کو بھی۔

جمال بے چارہ تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکتا' نہ ہی رابعہ اس سے واسطہ رکھتی تھی۔

"بھابھی ایک۔" وہ آواز لگاتا ایک اور پراٹھا لینے اندر باورچی میں آ رہا تھا' شوکت غرایا۔

"باہر دفعان ہو۔" وہ الٹے پیروں پلٹ گیا۔ اپنے بھائی کی عادت سے واقف تھا۔ بھول گیا تھا۔

اپنا ناشتا لے کر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ جمال ناشتا کر کے چلا گیا تو شوکت نے اسے آواز دی۔ باہر سے تالا لگا کر وہ بھی چلا گیا۔ جمال شام تک فارغ ہو جاتا اور ادھر ادھر کی دکانوں پر' تھڑوں پر بیٹھا رہتا۔ شوکت دیر سے آتا' کھانا کھاتا اور جب وہ اندر کمرے میں چلی جاتی' پھر جمال آتا' کھانا لے کر ماں کے کمرے میں چلا جاتا اور سو جاتا۔

چھٹی والے دن جمال بڑی بہن کے ہاں چلا جاتا پھر رات کو معمول کی طرح آتا۔ رابعہ نے تو ٹھیک سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

چھوٹی نند کبھی کبھار بڑی نند کے ساتھ ہی ماں سے ملنے آجاتی تھی۔ دونوں تھوڑا سا وقت بھی بمشکل ہی گزارتیں۔ ایک بار چھوٹی نند چپکے سے چھت پر چلی گئی تھی۔ چھت کی آخری سیڑھی سے شوکت نے اسے لڑھکا دیا۔ بڑی بہن اسے اپنے ساتھ لے گئی' اس دن سے ان ہی کے پاس تھی۔

شوکت سے سب ڈرتے تھے۔ تین منگنیاں ٹوٹ چکی تھیں اس کی۔ خاندان میں کوئی لڑکی دینے کو تیار نہیں تھا۔

گھر بند۔۔۔ دروازے بند۔۔۔ منہ بند۔۔۔ کان' آنکھیں سب بند۔۔۔ پھر بھی شوکت باؤلا رہتا' ساس اچھی تھی' دونوں اکیلے گھر میں خوش رہتیں' اماں اسے اپنے دکھ سناتی' وہ اماں کو اپنے سنا دیتی۔ وقت گزر رہا تھا۔ ہاں زندگی شوکت کے ہاتھوں میں ٹھہر گئی تھی۔

ایک بار وہ پانی پینے اٹھی' رات گئے جگ میں پانی تھا لیکن جگ سے شوکت نے منہ لگا کر پانی پیا تھا۔ وہ اس کا شوہر تھا لیکن اتنا پیارا نہیں تھا کہ وہ اسی جگ کو منہ لگا لیتی۔ اس پر ایک نظر ڈال کر وہ اٹھی۔ وہ اٹھ جاتا' وجہ پوچھتا تو اسے اسی جگ سے پانی پینا پڑتا یا پیاسا ہی سونا پڑتا۔ وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں آئی تو ڈر گئی۔ جمال ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی پانی پیا اور جانے لگی۔

"بھابھی! بھائی کو نہ بتانا۔" یہ الفاظ رابعہ نے اپنے پیچھے سنے اور باورچی خانے کے باہر کھڑے شوکت نے بھی۔

"کیا نہ بتانا۔" وہ اس پر جھپٹا۔

وہ کروٹ بھی لیتی تو شوکت کو پتا چل جاتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ باورچی خانے تک آئے اور اسے پتا نہ چلے۔

شوکت نے اسے گریبان سے پکڑا اور پٹخ پٹخ کر مارا' باورچی خانے کے سب ہی برتن ٹوٹ گئے۔ وہ بے چارا "بھائی بھائی سگریٹ۔۔۔ سگریٹ" کرتا رہا۔

ساس روتی پیٹتی بمشکل باورچی خانہ تک پہنچی۔

"شوکت! چھوڑ دے اسے۔" بیمار کمزور ہاتھوں میں اتنی جان بھی نہ تھی کہ اسے شوکت سے آزاد کروا لیتیں۔ خود رابعہ اپنے انجام کے لیے الگ کھڑی کانپ رہی تھی۔ اتنا ہنگامہ' باہر کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ شوکت چلایا۔

"دفع ہو جاؤ سب اپنے اپنے گھروں کو۔۔۔ گھر کا ہی چور پکڑا ہے' گھر کے دو چور۔"

شوکت جانے کتنے عرصے سے اس انتظار میں تھا کہ موقع ملے اور وہ جمال کا خون پی جائے' اماں نے بڑی بیٹی کو فون کر دیا۔ وہ آدھی رات کو اپنے شوہر کے ساتھ بھاگی آئی۔

جمال صحن میں ہی زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ نند کے آنے تک اماں اس کے سرہانے بیٹھی ایسے روتی رہی جیسے میت کے پاس بیٹھی ہو۔ نند جمال کو رکشہ میں ڈال کر لے گئی۔ ساتھ ہی اماں بھی چلی گئی۔ اس نے ساس کی منت کی کہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہ جائے' لیکن وہ جمال کے لیے تڑپ رہی تھی۔ شوکت نے اس کے لمبے بالوں کی چوٹی کو کس کر کرسی کے پائے سے باندھا۔ اور اسی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر اپنے چمڑے کے جوتے سے۔

وہ کوئی سوال نہیں کر رہا تھا' نہ ہی گالیاں دے رہا تھا۔ وہ عمل پر یقین رکھتا تھا۔

جمال گھر سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا' شوکت یہی چاہتا تھا' نند نے جمال کو کسی جاننے والے کے یہاں دوسرے شہر بھیج دیا۔ اماں اس سارے صدمے سے آخری سانسیں لینے لگی۔ چند مہینوں میں ہی چل بسی' اب گھر سے مر کر نکلنے کے لیے ایک وہی بچی تھی۔

اب شوکت وقت بے وقت آجاتا۔ بیرونی دروازے کے ساتھ ہی غسل خانہ بنا تھا' آکر اس میں چھپ جاتا اور ہوا دان سے سر نکال کر دیکھتا۔ کبھی چپکے سے آکر تیزی سے چھت پر چڑھ جاتا۔ وہ اندر کمرے میں ہوتی یا باورچی خانے میں۔

وہ ایسے ظاہر کرتی جیسے اسے معلوم ہی نہیں' ورنہ شوکت کی بو تو اس کے وجود میں گھستی چلی جاتی۔

شوکت جیسے مرد کے ساتھ رہتے ہوئے تو مردہ عورت کی حسیں بھی بیدار ہو جائیں، اس میں تو ابھی جان تھی۔

دو کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ آگے برآمدہ، برآمدے کے پار باورچی خانہ اور صحن۔ بجلی چلی جاتی تو اندھیرا جان کو آتا۔

وہ برآمدے میں صبح سے سبزی بنانے لگتی اور شام کر دیتی، کبھی چھری پکڑ لیتی، کبھی چھوڑ دیتی اور وہ کیا کرتی۔

میکے سے کبھی کبھی اماں اور بھاوج آکر مل جاتی تھیں، وہ اتنا لمبا سفر کر کے آتی تھیں، لیکن انہیں ہر صورت شوکت کے صبح نکلنے سے پہلے آنا ہوتا تھا، پھر تو باہر سے تالا لگ جاتا تھا نا۔ دو بار ایسے ہی آکر پلٹ گئیں۔ ایک دن آئیں تو ساتھ والوں کے ہاں رک گئیں کہ مل کر ہی جائیں گی۔ شام کو شوکت آیا تو اندر آئیں رابعہ کو خبر نہیں تھی کہ ساتھ والے گھر میں کون رہتا ہے، پڑوسن نے بہت دیر تک اماں سے باتیں کیں شوکت کی۔

"سر دکھ رہا تھا میرا، یہ تیری بھاوج میرا سر دبانے لگی، ان کا بڑا لڑکا۔۔۔ خدا اسے اجر دے، جھٹ بازار۔۔۔"

"اے مائی!" وہ تینوں برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ شوکت کمرے میں تھا، وہیں سے حلق میں سے کرخت آواز نکالی۔ اماں ڈر گئیں۔

رابعہ بت سی بن گئی۔ جیسے وہ ہمیشہ مار کھاتے ہوئے بن جاتی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ شوکت کی منت کرے کہ اسے نہ مارے یا خود کو اس سے بچائے۔ کمرے سے نکل کر وہ باہر آیا۔

"دو کالے بال نہیں بچے تیرے اور اپنی لڑکی کو غیر لڑکوں کے قصے سنا رہی ہے۔"

"وہ۔۔۔ میں۔۔۔" بورے بالوں والی اماں ڈر گئی۔

"رکشا لایا ہوں، نکل آؤ باہر۔"

اماں اور بھابھی چلی گئیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کی غیرت کا لحاظ رکھا اور آخری بار ملنے سے گریز کیا۔

شوکت کھانا کھا کر سو گیا، وہ بھی لیٹ گئی۔

"میں جب بھی آتا ہوں تو یہیں بیٹھی ہوتی ہے۔"

شوکت آتا تو وہ سامنے ہی برآمدے میں چٹائی پر بیٹھی ہوتی، وہ باورچی خانے میں بیٹھنے لگی۔ باورچی خانے کے لیے بھی وہی اعتراض، وہ کمرے میں بیٹھنے لگی، پھر بھی اعتراض برقرار۔

اور پھر وہ کہیں کی بھی نہ رہی۔ شوکت آتا تو وہ کسی نہ کسی دیوار سے سر ٹکائے کھڑی ہوتی۔ کبھی اس دیوار سے، کبھی اس دیوار سے۔ وہ دیواروں میں ملیامیٹ ہونے لگی۔

آئے دن شوکت تالے بدلتا رہتا۔ ایک بڑا صندوق بھرا پڑا تھا۔ نت نئے تالوں سے اور اس صندوق کو لگا تالا بھی آئے دن بدلتا۔ کبھی دونوں کمرے بھی بند کر جاتا، کبھی باورچی خانے کو بھی تالا لگا جاتا، وہ دوپہر کی روٹی سے بیٹھی رہتی۔ غسل خانے کے نل سے پانی پیتی رہتی۔

جب اس کی پہلی لڑکی ہوئی، سرما کے دن تھے۔ کمرا ٹھٹھرا تھا، سیلن زدہ، ہوا دھوپ کبھی ہو کر نہ گزری۔ ٹھنڈ لگ گئی۔ نیلی پڑ کر مر گئی۔ وہ مردہ بچی کے ساتھ شام تک اکیلی رہی۔

☼ ☼ ☼

چند دنوں سے ایک دیوار پر دھمک سی ہوتی تھی، جیسے اس پر مسلسل ضربیں لگائی جا رہی ہوں۔ یہ پڑوسیوں کے ساتھ والی دیوار تھی۔ ایک دن دبے پیروں اور بے وقت شوکت آیا تو وہ اسی دیوار کے ساتھ ٹکی بیٹھی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس دیوار پر ضربیں لگنے لگیں۔ جیسے کوئی دیوار کے ساتھ لگا کوئی کھیل کھیل رہا ہو۔ کئی دنوں سے ایسے ہی ہو رہا تھا۔ شوکت نے آنکھوں سے سونگھنا شروع کر دیا، پھر اپنا کان دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ شاید کوئی وزنی بڑا فٹ بال تھا دیوار پر مارا جا رہا تھا۔ شوکت موٹا ڈنڈا اٹھا لایا اور ٹھیک اسی جگہ دھڑ دھڑ مارنے لگا، دھمک وہاں ضرور گئی ہو گی۔ پھر اب یوں ہوا کہ وہ وہ یہاں سے مارتا تو وہ ہی وہاں سے ضرب پڑتی۔

شوکت کی ضربوں کے جواب آنے لگے۔ کھیل شروع ہو گیا۔ وہ شوکت کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ ادھر سے ملنے والی ہر دھمک پر شوکت اس کی طرف دیکھتا۔ پھر اس پر نظریں ٹکائے شوکت پاگلوں کی طرح ضربیں مارنے لگا۔

آخری دو ضربیں دیوار پر مار کر وہ اس پر جھپٹا۔

کئی مہینے اس کا علاج ہوتا رہا۔ ہاتھ کی دو انگلیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ایک پیر میں لنگ آگیا تھا اور بھی بہت کچھ ہو گیا تھا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ زندہ تھی۔

پانچ سال بعد اس کے گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی کر دی۔ چوہے مار گولیاں وہ اپنے کپڑوں میں چھپا کر لائی تھی۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اب دیر نہیں کرے گی۔ اس بار والا شوہر کس قماش کا ہے، معلوم ہوتے ہی گولیاں پھانک لے گی۔

وہ اندر آیا۔۔۔

"تمہارا نام۔۔۔ ہاں اچھا۔۔۔ وہ شاید۔۔۔ ہاں رابعہ۔۔۔" آواز دیتا وہ باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر کافی دیر تک دونوں کی آوازیں آتی رہی تھیں، کھٹ پٹ باتیں، سرگوشیاں۔ جیسے کوئی منت کر رہا ہے۔ التجا کر رہا ہے، وہ پھر اندر آیا۔ باہر سے کسی نے کنڈی لگا دی۔

"اماں۔۔۔ اماں کنڈی نہ لگا، اماں!" اس کی آواز رندھ گئی۔ رابعہ کو چوہے مار گولیاں رہ رہ کر یاد آنے لگیں۔ یہ قریب ہی کے تکیے میں رکھی ہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی نکالنے اور نگلنے میں۔ وہ اماں۔۔۔ اماں کرتا بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔

"اے دلہن!" اس کی دھیمی آواز نکلی۔

"اماں کی دلہن۔۔۔ ذرا۔۔۔ ادھر مجھے دیکھ۔۔۔ جلدی سے دیکھ۔" بچوں سی آواز۔

رابعہ نے سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ کٹا پھٹا سا منہ تھا۔ نوعمری میں کنڈیکٹر تھا ویگن کا، پنڈی سے مری ویگن لے جاتے پہاڑ سے نیچے آگری، آدھا ہاتھ، ایک آنکھ کی بینائی، کٹا پھٹا بدصورت منہ۔ رابعہ نے اس کے کہنے پر ایک نظر دیکھ کر سر جھکا لیا، ایک نئی سرگوشی کمرے میں گونجی جس پر رابعہ کو دوبارہ سر اٹھانا ہی پڑا۔

"تو ڈر کر چیخی نہیں؟"

"مجھے مارو، پھر چیخوں گی۔"

"وہ تو۔۔۔ تو مجھے مارے گی۔"

"میں کیوں ماروں گی؟"

"پھر تھوکے گی۔۔۔ ہے نا۔" اپنے اکلوتے ہاتھ سے اس نے اپنے بال نوچے۔ رابعہ نے سر کو جھٹکا دیا کہ سر پر ٹکا دوپٹا سرک کر گردن تک آگیا۔

"تھوکتا تو مرد ہے اور اس کمرے میں تو مرد ہے۔"

"تھوکتی تو بیوی ہے اور اس کمرے میں تو بیوی ہے۔"

"اس نے کہا تھا کہ میری اس شکل پر کوئی تھوکے گا بھی نہیں، میری صورت ہے۔ جیسی۔۔۔ جیسی۔۔۔ وہ جو غلیظ سا جانور ہے نا۔۔۔ اماں! کنڈی کھول دے۔"

وہ دوبارہ دروازے پر پہنچ گیا۔

رابعہ کے تکیے میں چوہے مار گولیاں پڑی تھیں۔ رابعہ اپنی جگہ سے اٹھی، وہ ڈر گیا۔

"سن! میں تجھے چھوڑ دوں گا، جب چاہے طلاق لے لینا، میں نے نہیں کی یہ شادی۔ اس بار بھی اماں نے بہت مجبور کیا، کہتی ہے مر جاؤں گی، بہت بیمار ہیں اماں، میرا وعدہ ہے۔ قسم لے لے، میں چھوڑ دوں گا۔"

رابعہ اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اپنے اکلوتے ہاتھ سے اس نے منہ کو چھپانا چاہا۔ وہ خود میں سمٹ رہا تھا۔ رابعہ نے اس ہاتھ پر جو بمشکل کانی آنکھ کو چھپا رہا تھا، اپنا ہاتھ رکھا اور اس کے پاس نیچے بیٹھ گئی۔ اس اکلوتے ہاتھ کو رابعہ نے اپنی آنکھوں پر رکھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کٹے پھٹے منہ پر پھیرنے لگی، دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے زخموں کو سی لیں۔ ایک ایک داغ، دھبہ۔۔۔ ایک ایک زخم۔

☼

سدرۃ المنتہیٰ

محبت گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا جب اس کے تیور بدلے۔ پہلے ارادے، پھر لہجہ، پھر لفظ اور پھر پورا کا پورا وہ بدل گیا اور اب گھر کی ہر چیز اس کی طرح بدلی بدلی سی لگتی ہے۔ جب سے وہ بدلا اس نئے گھر میں ایک لمحہ بھی سکون کا نہ ملا۔ نہ ہی محبت کا احساس رہا۔

وہ جس کے لیے میں نے گھر چھوڑا۔ پھر گلی، محلہ، ماں، باپ، بہن، بھائی، سہیلیاں گویا سب کچھ چھوڑ دیا۔

سارے شوق، کتابیں اور کہانیاں، کچھ بھی اہم نہ رہا، سوائے اس کے۔ پہلے وہ باتیں بھولنے لگا، اہم دن، پھر ذمہ داریاں اور اب کسی دن لگتا ہے، مجھے بھی کسی چیز کی طرح ایک کونے میں چھوڑ کر بھول جائے گا۔

بھولنے کی بیماری تو اس کی پرانی تھی، اب مزید پکی ہو گئی ہے۔

اور میں، میری خواہشات اس کے وعدے سب ماضی کا قصہ ٹھہرے۔

جو میرے لیے کبھی راتوں کو سوتا نہ تھا۔ اسے اب نیند مجھ سے زیادہ پیاری ہے۔ وہ میرے سامنے رات ہونے سے پہلے ہی سو رہا ہوتا ہے۔

اور میں پوری پوری رات اس کی بے اعتنائی کا زخم چاٹتے جاگتی رہتی ہوں۔

جاگنا تو جیسے میرا مقدر بن گیا ہے اور سونا اس کا شوق، اولین شوق۔ وہ کیا تھا اور کیا بن گیا۔

(غصہ، افسوس، بے زاری۔)

☆ ☆ ☆
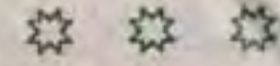
اسے مجھ سے کوئی ایک شکایت نہیں ہے۔ ایک ہو تو بتاؤں اور شاید دور بھی کر دوں، مگر اس کی شکایتوں کی فہرست طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے دفتر کے کام بڑھ رہے ہیں، ویسے ویسے اس کی فرمائشیں اور ضرورتیں بھی۔ جو بعد میں شکایتوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔

وہ اور اس کی شکایتیں۔

میں اور میری ذمہ داریاں، میری الجھنیں، میری پریشانیاں، جن کا اسے کوئی احساس نہیں اور شاید نہ ہی کبھی ہو گا۔

اس لیے زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس سب کے بارے میں سوچنے کے علاوہ کچھ بھی نہ سوچوں اور چپ کر کے سو جاؤں کیونکہ نیند بہت آ رہی ہے۔

صبح اٹھ کر دفتر بھی جانا ہے اور پھر گھر بھی لوٹنا ہے، پھر وہی۔۔۔ وہ۔۔۔ اور اس کی شکایتیں۔۔۔ جو میرا نصیب۔۔۔ جو میرا مقدر۔

وہ بھی اور اس کے گلے شکوے بھی، جو کل پر اٹکتے ہیں۔

رات آرام کے لیے ہوتی ہے۔ مگر یہ بات اسے سمجھانا مشکل ہے۔ اس لیے تمام مشکل کام دن کے لیے رکھتے ہوئے مجھے آ رہی ہے نیند۔۔۔ سو گڈ نائٹ۔

(بند ڈائری، سنہرا ورق، دو صفحوں کے بیچ رکھا ہوا قلم اور خراٹے۔)

☆ ☆ ☆
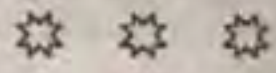
بات کوئی اتنی بڑی نہ تھی۔ بات عام سی تھی۔ اسے نہ جانے کیوں غصہ آ گیا۔ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ اب ظاہر ہے اس کے بچوں کی ضروریات کے لیے تو میں اسی سے کہوں گی نہ کہ کسی اور سے۔ اپنی ضرورتوں کو گنوانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ جو دے دیتا ہے بغیر کسی شکایت کے رکھ لیتی ہوں۔ وہ بھی بہت بڑا احسان کرتا ہے۔ ایسے علاقے میں گھر بنوانا میرا ہی نہیں اس کا بھی خواب تھا۔ اب اگر اخراجات چلانے میں مشکل ہوتی ہے تو اسی کا قصور ہے۔

خود ہی سنبھال لے یا پھر کچھ کاروبار کر لے۔ میں کتنے مشورے دوں اور ویسے بھی وہ کون سا میرے مشوروں پر عمل کرتا ہے، میری اگر مانتا تو شاید یہ حال
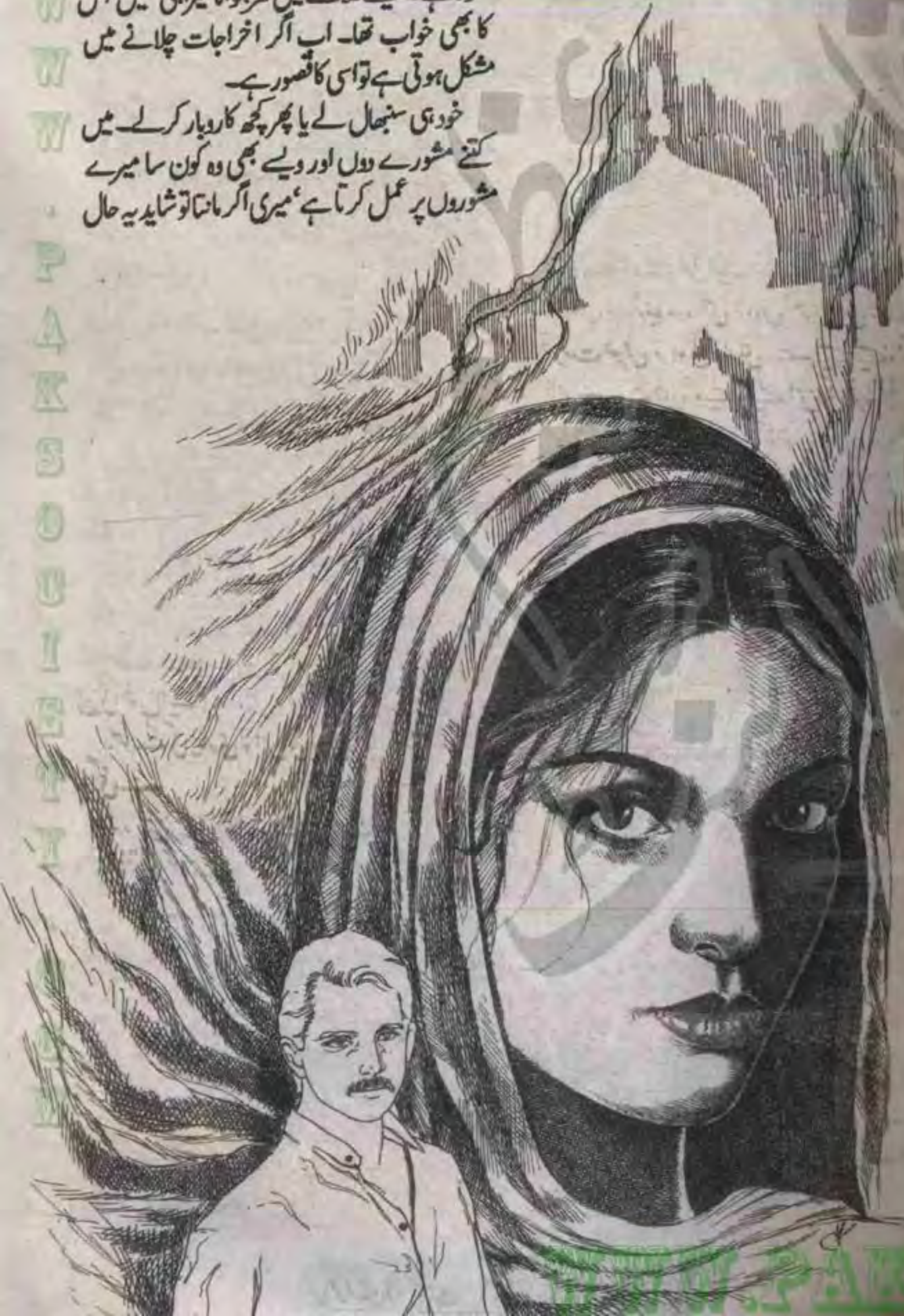
نہ ہوتا۔

سارے کام اس کی مرضی سے ہوں اور نتائج کی ذمہ دار میں اکیلی ٹھہروں۔ گویا میں اس کے بچے بھی پالوں، اس کا خیال بھی رکھوں، گھر بھی سنبھالوں اور پھر بھی اس کی تنقید کا نشانہ بھی بنوں۔

خیر! اس سب میں قصور اس کا نہیں، میرا ہی ہے کہ شروع سے اس کی ہر بات مانتی آرہی ہوں۔ کبھی کوئی ڈیمانڈ نہ کی، کچھ مانگا نہیں۔ جیسے چاہا، گزارا کرلیا۔ مگر بھئی زندگی آخر کبھی تو بدلتی ہی ہے اور طرز زندگی بھی۔ مگر میرا کچھ نہیں بدلا، سوائے اس کے اور اس کے خیالات کے۔

☼ ☼ ☼

اسے کیا کہوں، جسے خود کوئی احساس نہ ہوتا ہو۔ جو وہی سوچتی ہے جو وہ سوچنا چاہتی ہے اور وہی دیکھتی ہے جو دیکھنا چاہتی ہے۔

اسے کہاں نظر آؤں گا میں، میری مجبوریاں، میری پسینے میں بھیگی ہوئی ٹوٹے بٹن والی شرٹ، میرے الجھے دھول میں اٹے بال، میری آنکھوں، میرے وجود کی تھکن اور میری فکر، جو ہر وقت میرے چہرے اور میری باتوں سے جھلکتی ہے۔ جسے وہ بے زاری، جھنجلاہٹ کا نام دیتی ہے۔ اسے صرف میری جیب نظر آتی ہے اور اس سے جڑی ساری ذمہ داریاں، تمام کے تمام اخراجات۔

وہ مجھے نوٹ چھاپنے والی مشین سمجھتی ہے۔ اسے کیا پتا کہ کمانا کس قدر مشکل ہے اور خرچ کرنا اس سے بھی کہیں زیادہ۔ روپیہ، پیسہ دانتوں میں دبا دبا کر خرچ کرو، تب ہی گھر کا خرچا اور اوپر کے اخراجات چلتے ہیں اور کبھی کبھار وہ بھی پورے نہیں ہوسکتے۔ اب میں نوٹ کو کھینچ کر بڑا کرنے سے تو رہا۔

مگر اسے کیا احساس۔ اسے تو صرف خرچ کرنا ہوتا ہے اور خرچ کرتے وقت وہ نوٹ کی تعداد کہاں ذہن میں رکھتی ہے۔ اسے تو صرف نت نئی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ شوق ہے مجھے لٹانے کا۔

(سوچ، تھکن، جمائی، نیند۔)

☼ ☼ ☼

اس دن کے بعد میں نے اسے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی بھی بات کرو، اس کا مزاج بگڑنے اور زبان برسنے کے لیے تیار ہوتی ہے، اس لیے میں زیادہ تر چپ رہنے کی ہی کوشش کرتی ہوں۔

تاکہ اسے مجھ سے کوئی اضافی شکایت نہ ہو۔ صبح ناشتا دیتے وقت بھی یاد نہ دلایا کہ اسے گھر کا سودا لانا ہے۔ اس نے خود ہی پوچھا تو کہہ دیا کہ لانا تو چاہیے۔

اب ایسا کیا کہہ دیا تھا، جو اس کا موڈ عجیب تر ہوگیا۔

کہا: "اخبار دو۔"

دے دیا۔

کہا۔ "ناشتا لاؤ۔"

لاکر سامنے رکھ دیا۔ عجیب سے انداز میں آملیٹ دیکھنے لگا۔ دس منٹ تک پراٹھے کو گھما پھرا کر دیکھتا رہا۔

"جل گیا ہے۔" اس کا موڈ فوراً" خراب ہوگیا۔

"ذائقے میں اچھا ہے۔ اتنا زیادہ بھی نہیں جلا۔" اتنی ہی صفائی دی تھی اور واقعی ذائقہ میں اچھا ہی تھا، اب تھوڑا بہت تو جل ہی جاتا ہے کبھی کبھار۔ ادھر منا بھی رو رہا تھا۔ اس کی فکر الگ۔ فریج میں سوائے انڈوں کے کچھ نہ بچا تھا۔ جلدی جلدی ناشتا بنا کر اسے دیا، تاکہ آفس سے دیر نہ ہوجائے۔ مگر پھر بھی دیر ہو ہی گئی، جس کی وجہ وہ خود ہی تھا۔

آرام سے ناشتا کرکے چلا جاتا۔ کس نے کہا تھا آدھا گھنٹہ ضائع کردو۔ چیخ چلا کر چلا گیا۔ میری ایک نہ سنی۔ اپنی ہی سنا سنا کر میرا دماغ خالی کردیا اور پھر رہی سہی کسر منے نے پوری کرلی۔

میرا دماغ تو جھنجھنے کی طرح بج رہا ہے۔ ایک منا، ایک منے کے ابا۔ اور بیچ میں پس رہی ہوں میں۔

☼ ☼ ☼

اس کی لاپروائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک ناشتا ہی ڈھنگ سے کرتا ہوں۔ وہ بھی ایک تو دیر سے ملا۔ پھر جلا ہوا اور اس پر محترمہ کے مزاج دیکھو، اتنا چڑچڑا پن۔ اس پر رعب الگ۔ یہ نہیں کہ بندہ کچھ شرمندہ ہوجائے، ایکسکیوز ہی کرلے۔ ڈھٹائی تو دیکھو۔ پراٹھا جلا دیا ہے اور کہتی ہے۔ "ذائقے میں تو اچھا ہے۔" یہ پہلی بار سنا ہے کہ جلی ہوئی چیز ذائقے میں اچھی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ پکا کر نہیں، جلا کر کھانا کھاتے۔ ایک تو اتنا برا پکاتی ہے، پھر برتن پٹخ پٹخ کر خود بھی پاگل ہوجاتی ہے اور دوسروں کو بھی نیم پاگل کردیتی ہے۔ فریج میں اگر صرف انڈا تھا تو پہلے تو بتاسکتی تھی ناکہ انڈا بناؤں گی بغیر نمک کے تاکہ باہر سے ہی کچھ منگوالیتا۔ وقت الگ ضائع ہوا، موڈ الگ خراب۔ پھر منا اتنا رو رہا تھا۔ بھلا کوئی ایک کام ہی بندہ ہوش حواس میں رہ کر کرلیتا ہے۔ اس پر مجھے غصہ کیسے نہ آئے گا۔ اتنا بڑا گھر بنا کر دیا اور صفائی کے لیے ملازمہ بھی رکھ دی۔ مگر بی بی کو ٹی وی دیکھنے سے فرصت ہو تو ہی اپنی نگرانی میں صفائی کرائیں نا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دھول کی تہہ جم جاتی ہے۔ ملازمہ جیسے ہاتھ ہلا کر ہی چلی جاتی ہے۔ اس پر اتنے پیسے کیوں برباد کرتا بھلا۔ سو نکال دیا ملازمہ کو۔ مگر اس طرح تو گھر اور گندا ہوگیا۔ منا الگ بیمار سا رہنے لگا ہے۔ گھر بھی گندا، کھانا بھی بدمزا اور جلا ہوا، پھر اس کا حلیہ مت پوچھیں! حلیے سے لگے گا جیسے سارا دن کام میں گھن چکر بنی رہتی ہو۔ اس کی طرف دیکھنے تک کو دل نہیں چاہتا۔ مگر اسے تو میری کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ میں کیا چاہتا ہوں، اس سے اس کو کوئی غرض نہیں ہے۔ لیکن اب اسے نہیں چاہتا، اس کا اس کو بڑا دکھ ہے اور۔ لیکن اگر دکھ ہے تو وہ خود کو سدھارتی کیوں نہیں۔

☼ ☼ ☼

کل اس کی امی اور بہن آئی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اتنا خوش میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا۔ بلاوجہ ہی بات بات پر چہک رہا تھا۔ جیسے مجھے جتا رہا ہو کہ میرے ساتھ وہ خوش نہیں ہوتا۔ کتنی دیر تک فریحہ کے بچوں کو گود میں لیے بیٹھا رہا۔ کبھی منے کو تو اس طرح لے کر نہیں بیٹھتا۔ دو منٹ پیار کرکے چھوڑ دیتا ہے۔

منے کو اگر ایسے بہلائے کچھ دیر تو میں گھر کے کام آرام سے نہ نپٹالوں۔ میں نے جب گھور کر دیکھا تو بچے کو گود سے اتار دیا، اپنی ماں کے سامنے سارے کھاتے کھول کر بیٹھا تھا۔ اپنے دفتر کے مسائل، پریشانیاں۔ یہ سب مجھ سے بھی تو شیئر کرسکتا ہے نا۔

مگر دل کے قریب سمجھے تب نا۔

بہرحال آپس کی بات ہے، مجھے اس کی پریشانی کا احساس بہت ہوا۔ کہ ایک میں ہی پریشانیوں میں گھری ہوئی نہیں، وہ بھی الجھا ہوا ہے۔۔۔ تو جب میں پریشانی میں موڈ خراب کرکے بات کرتی ہوں یا بگڑتی ہوں تو وہ بھی بگڑ سکتا ہے۔

امی کو خدا معلوم کیا محسوس ہوا۔ مجھے کمرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور بہت سی باتوں کے درمیان بہت کچھ سمجھانے لگیں۔ انہیں کیسے پتا چلا کہ ہمارے درمیان کچھ غلط چل رہا ہے۔ مجھ سے کہنے لگیں۔

"اس کا خیال رکھا کرو اور اپنا بھی۔۔۔ اچھے کپڑے بنائے ہیں تو پہنا بھی کرو۔ کتنی چیزیں بے کار پڑی ہیں۔ وہ نکالو، کچھ پہنو، کچھ دے دو۔ چیزوں کو استعمال میں لاؤ۔"

اور کتنے ہی طریقے بتانے لگیں، چیزوں کو استعمال کرنے کے، سجانے کے۔ مجھے تو آج سے پہلے ان سب باتوں کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔

خیر! جو بھی ہے، باتیں تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ میں بلاوجہ اتنا وقت جلنے کڑھنے اور فضول سوچنے میں ضائع کردیتی ہوں۔ ان کا کہنا تھا میں اپنی طرف سے اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح نبھالوں تو اسے بھی اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کا احساس ہوگا۔ عورت کو تو گھر بنانے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ واقعی میری ماں نے بھی بہت محنت کی تھی۔ بہت قربانیاں دی تھیں۔

ابا دن رات بگڑتے رہتے، مگر وہ خاموشی سے برداشت کر لیتیں۔

اور کبھی کبھار اگر وہ غصے میں کچھ کہہ دیتیں تو ابا ہنس کر ٹال دیتے۔ یہاں ہم دونوں ایک جیسے ہیں، تو ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ساتھ میں بھی ذمہ دار رہی ہوں اس سب کی۔ میں نے ان کی باتوں کو بہت غور سے سنا، سمجھا اور سوچا کہ اپنی طرف سے مطلع صاف کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔ پھر بھی اس کے سر پہ جوں نہ رینگی تو امی سے خوب شکایت لگاؤں گی۔ مگر ابھی مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ فی الحال میں شکایت لگانے کی پوزیشن میں نہیں، کیونکہ میری بھی تمام کمزوریاں ان کے ہاتھ آچکی ہیں۔

سب سے پہلے انہوں نے کچن کا جائزہ لیا۔ میں شرمندہ ہو گئی۔ کچن اتنا گندا ہو رہا تھا، پھر اس میں کچھ بھی نہ تھا جو بنا کر انہیں پیش کرتی۔

سب کچھ نوشاد بازار سے لے آیا۔ فریحہ کا لہجہ تو بہت کچھ جتلانے والا تھا۔ مگر امی بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے بات سنبھال لی۔ نہ جانے کیوں آج مجھے احساس ہوا کہ امی کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے کہ ان کا حق تو بیٹے پر ہے، نہ کہ بیٹی پر۔ دراصل شادی کے بعد میرا رویہ ان کے ساتھ اتنا خراب تھا کہ انہوں نے روایتی جھگڑوں کے بجائے مناسب سمجھا کہ ہمارے درمیان سے نکل جائیں۔ مجھے معلوم ہے یہ بات اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے ماں کو روکنے کی بہت کوشش بھی کی تھی، لیکن میرا سرد رویہ اسے خاموش کر گیا، لیکن اس دن کے بعد سے ہمارے درمیان جیسے ایک خاموشی آگئی تھی۔

نوشاد ان کی بات بہت مانتا ہے۔ کم از کم میرے کہنے پر نہ سہی ان ہی کے احساس دلانے پر اسے احساس تو ہوتا۔ یہ احساس مجھے آج اور بھی گہرا ہوا۔

جب وہ سودا اور ضرورت کی دیگر چیزیں لے کر آیا تھا۔ پہلے کی نسبت اس کا رویہ بس ٹھیک تھا۔ کھانا بھی باہر سے لے آیا۔ میرے لیے بھی سب چیزیں لے آیا اور منے کے ڈائپر اور کپڑے بھی۔ پھر بھی بار بار پوچھتا رہا کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔

پہلے مجھے تھوڑی حیرت ہوئی، پھر ہنسی آئی اور دل چاہا، کہہ دوں۔ "کیوں... آج لاٹری نکلی ہے کیا؟ تمہارے پاس تو پیسے نہیں تھے۔ قرضہ لیا ہے؟ چوری کی ہے؟ ڈاکا ڈالا ہے؟ یا پھر بھیک مانگی ہے سڑک پر جا کر؟"

یہی تو وہ کہتا ہے نا، ڈاکا ڈالوں، چوری کروں یا قرضہ لوں کسی سے یا پھر بھیک مانگوں سڑکوں پر جا کر؟

سوچا کہ یاد دلا دوں۔ مگر پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اب ہر شیطانی خیال کو اگر عملی تشکیل دے دی جائے تو غلط فہمیاں دور نہیں ہو سکتیں۔

شیطان تو چاہتا ہی ہمیں الگ کرنا ہے۔ مگر میں جتنی بھی گناہ گار سہی، شیطان کی ہر بات تھوڑا ہی مان لیتی ہوں۔

آپ بھی ہر بات نہ مانا کریں شیطان کی۔

☆ ☆ ☆

اب اسے احساس ہو نہ ہو، مجھے تو ہوتا ہے۔ کل امی آئی تھیں۔ اتنے دنوں بعد مجھے اپنا گھر اچھا لگ رہا تھا۔ امی سے بات کرنے کے بعد میری ساری تھکن اتر گئی۔ وہ ساری باتیں جو سوچ سوچ کر میں پریشان ہو رہا تھا، ان سے شیئر کر کے دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ امی کے یہاں نہ رہنے کی وجہ بھی وہی ہے۔ اسی کی وجہ سے امی نے فریحہ کے ہاں رہنا قبول کیا تھا۔ یہ میری غیرت پر طمانچہ تھا، لیکن امی کے سمجھانے پر خاموش ہونا پڑا۔

ہاں! مگر اس وقت خود پر بھی بہت افسوس ہوا، جب وہ کچن کا جائزہ لے رہی تھیں اور کچن میں کچھ نہ تھا۔ اتنی شرمندگی ہوئی مجھے۔ بازار سے سب کچھ لے تو آیا، پر دل مطمئن نہ ہوا۔ فریحہ بھی ساتھ تھی۔ یہ بات اس نے بھی نوٹ کی۔ بعد میں امی نے میری کلاس لے لی۔ میری کوتاہیاں ایک ایک کر کے گنواتی رہیں اور میرا سر جھکتا گیا۔ اب وہ ماں ہیں، ان کے سامنے نہ تو میں سچ کی

نفی کر سکتا ہوں، نہ ہی بحث بازی، سو ہر ایک قصور مانا گیا۔

انہوں نے کہا تھا، وہ الماس کو بھی سمجھائیں گی۔ مگر مجھے خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ منا بہت چھوٹا ہے۔ اس کی چیزیں ہر وقت موجود ہونی چاہئیں۔ میں پتا نہیں کیوں اس کی آڑ میں اپنے بچے کو بھی بلاوجہ ہی نظرانداز کرتا رہا۔

اس کا شدید احساس تب ہوا، جب میں فریحہ کے بیٹے کو مسلسل گود میں لیے بیٹھا تھا۔ منا اس کی گود میں رو رہا تھا اور وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں دکھ تھا، شکوہ تھا اور ہلکا ہلکا غصہ بھی۔ میں اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے بچے کو گود سے اتار کر باہر جانے کے بہانے سے اٹھ گیا۔

مگر یہ احساس مجھے رات بھر رہا۔ رات نیند بھی سکون سے نہ آئی۔ عجیب بے چینی سی تھی۔ وہ بھی دیر تک جاگتی رہی تھی۔ منے کی وجہ سے۔ مگر —— وہ میرے کپڑے پریس کر کے رکھتی رہی، میرے جوتے بھی پالش کیے۔ جب منا سو گیا تو کچن میں چلی گئی۔ شاید صبح کے ناشتے کے لیے آٹا گوندھ کر رکھنے گئی ہو گی۔ وہ پتا نہیں کب لوٹی۔ مجھے تو بارہ بجے کے بعد نیند آگئی تھی۔ تو گویا وہ دیر تک جاگتی ہے، جب ہی صبح مشکل سے اٹھتی ہے، کام کی تھکن کی وجہ سے ہی اس کا موڈ آف رہتا ہے اور وہ غائب دماغ بھی اسی لیے رہتی ہے۔ سو مجھے اس کے لیے ذرا سی رعایت ضرور رکھنی چاہیے۔

چلو! آئندہ دھیان رکھوں گا۔

اگر وہ پہلی سی محبت نہ بھی دے سکوں، تب بھی خیال تو رکھ ہی سکتا ہوں۔

ہو سکتا ہے، پھر اس کی شکایتوں کی فہرست کچھ مختصر ہو۔

ہو سکتا ہے شکایتیں ختم بھی ہو جائیں۔

(مسکراہٹ، سوچ، خود کلامی۔)

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد حیرت انگیز تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ بالکل پہلے والا نوشاد لگ رہا تھا۔ حالانکہ آج بھی تھکا ہوا تھا، مگر روز کے برخلاف اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ بہت اچھے طریقے سے اس نے مجھ سے بات کی۔ یہ بھی پوچھا کہ دن کیسا گزرا۔ پھر منے کو گود میں اٹھا کر بہت پیار کیا۔ اس کی طبیعت پوچھی۔ اس کی دوائیں چیک کیں، منے کے لیے فروٹ بھی لایا تھا۔ اسے کیلا چھیل کر کھلایا۔ منے نے اس کی پوری شرٹ گندی کر دی۔ مگر پہلے کی طرح موڈ خراب نہ کیا۔ بلکہ ہنستا ہوا اسے گود میں لیے چومتا رہا۔ پھر کپڑے تبدیل کیے اور کھانا کھایا، خلاف معمول آج کھانے میں اس نے کوئی نقص بھی نہ نکالا تھا۔ کھانا کھاتے وقت ہلکی پھلکی بات چیت کرتا رہا۔ تھوڑی دیر سونے کے لیے لیٹا اور پھر شام کو ہم باہر بھی گئے۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا نا۔

میں نے اسے یاد دلایا، پہلے جب ہم یہاں آئے تھے تو اس نے مجھے امجد اسلام امجد کی ایک طویل نظم سنائی تھی۔ آج بھی اس نے مجھے ان ہی کی ایک نظم سنائی تھی۔ بہت دیر تک بے مقصد باتیں کرتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ ہمیشہ سے ایسا تھا۔ وہ کبھی نہ بدلا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج اس کا حلیہ بہت بہتر تھا۔ مجھے بھی بہت اچھی لگی۔ روز سے ہٹ کر صاف ستھری، نہ کوئی شکوہ، نہ شکایت، نہ ہی کام کرتے وقت اس نے برتن پٹخے، نہ شور کیا۔ نہ غصہ، نہ بڑبڑاہٹ، میں جب تک منے کے ساتھ لگا رہا، وہ میرے کپڑے نکال کر رکھتے ہوئے شرٹ کو اچھی طرح دیکھتی رہی۔ اس کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے فوراً بٹن ٹانکا۔ دوبارہ پریس کر کے مجھے دی۔ اگر ہر روز وہ اسی طرح کپڑوں کو چیک کر کے مجھے دیتی رہے تو نہ کوئی مسئلہ ہو اور نہ ہی مجھے برا لگے۔ کھانا بھی بہتر تھا، شاید دل سے پکایا تھا۔

شام کو ہم باہر گئے۔ وہ بہت خوش تھی۔ میں نے

اس کی فرمائش پر نظم بھی سنائی۔ اس کا موڈ ضرورت سے زیادہ بہتر تھا۔

اور سچ بتاؤں تو بہت دن بعد محسوس ہوا کہ جیسے زندگی میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ نہ دفتر کے کام کا جھنجٹ' نہ ٹریفک کی بے زاری' نہ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری' نہ بجلی' گیس' پانی کے بل' نہ ہی اس کی شکایتیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی ٹینشن فری ہو کر مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں ایسا احساس تھا جو سیدھا میرے اندر تک اتر گیا۔

☼ ☼ ☼
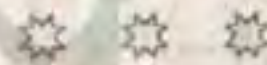
وہ بدل تو واقعی گیا تھا' مگر اتنا بھی برا نہیں تھا' جتنا میں اسے سمجھ رہی تھی۔ کچھ بھی ہو میری خواہشوں کی خاطر اس نے بہت کچھ کیا تھا۔

اب کچھ تو مجھے بھی کرنا چاہیے۔ کل وہاں سے آنے کے بعد میں نے امی کو فون کر لیا تھا اور آج میں جا کر فریحہ کے ہاں سے امی کو لے آئی تھی' جو اس کے لیے سرپرائز تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا تو نہیں۔ مگر اس کا رویہ بہت اچھا تھا اور یہ سن کر تو اور حیران ہو گیا کہ امی اب ہمیشہ ہمارے پاس رہیں گی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

کاش! یہ سب میں بہت پہلے کر لیتی' تو کم از کم ہمارے درمیان اتنی غلط فہمیاں اور دوریاں نہ بڑھ گئی ہوتیں۔

امی نے آتے ہی میرے آدھے کام اپنے سر لے لیے۔ اور بھی بہت کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ملازمہ بھی لوٹ آئی ہے۔ امی اپنی نگرانی میں صفائی کرواتی ہیں۔ تب تک بے فکر ہو کر میں کچن دیکھ لیتی ہوں اور جب منے کے پاس جاتی ہوں تو امی کچن دیکھ لیتی ہیں۔ اس طرح کام کا بوجھ کچھ کم ہوا ہے کہ ذہن بھی کچھ تروتازہ ہو گیا ہے۔

ہم دونوں کبھی باہر جائیں گے تو منا بھی امی کے پاس ہی رہے گا۔ کتنے مسائل تھے جو کم ہوئے ہیں۔ پہلی دفعہ احساس ہوا ہے کہ ساس زحمت نہیں' رحمت ہو سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اتنی بھی بری نہ تھی۔ بس تھوڑی سی کم عقل اور بے صبری تھی۔

میرا خیال نہیں رکھتی تھی' نہ ہی اپنا۔ اب ہر چیز کا خیال رکھتی ہے۔ میری پرانی الماس بن گئی ہے۔ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ سب سے بڑی بات کہ اسے اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہو گیا ہے۔

کل وہ امی کو لے کر آئی اور میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا۔ دل کو سکون بھی مل گیا کہ امی ہمارے ساتھ رہیں گی تو میں ان کا خیال بھی رکھ سکوں گا۔ منے سے وہ بہت پیار کرتی ہیں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

وہ بھی ہر وقت صاف ستھری' خوش مزاج سی رہتی ہے تو اچھا لگتا ہے۔ اب لگتا ہے' زندگی اتنی بری بھی نہیں' جتنی لگنے لگی تھی۔

گھر سے فریش ہو کر نکلتا ہوں تو دفتر کے کام کچھ آسانی سے کر سکتا ہوں اور جب تھکا ہوا گھر پہنچتا ہوں تو اس کے رویے' امی کی موجودگی' منے کی قلقاریوں سے میرے ذہن پر چھائی ساری تھکن اتر جاتی ہے اور رات کو سوتے وقت ذہن پر کوئی تھکن نہیں ہوتی۔

کاش! وہ ہمیشہ ایسی رہے۔

اور زندگی بھی۔

ویسے..... بھروسا اس کا بھی کچھ نہیں اور نہ ہی زندگی کا۔

جو اچھا وقت ہے اسے گزار دو۔ کل کس نے دیکھا ہے۔

(مسکراہٹ' اطمینان' خوشی)
(نیند' خراٹے' اندھیرا)

راشدہ رفعت

بعض چہرے کتنے حسین، کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے' انہیں فرصت سے بیٹھ کر دیکھتے ہی رہیں۔ ایسا ہی چہرہ اس وقت ٹی وی اسکرین پر نظر آرہا تھا۔ میں جو ایک بھرپور نیند لے کر بیدار ہو کر کسی کو اپنے لیے ناشتا بنانے کا کہنے کے لیے کمرے سے نکلا تھا کہ لاؤنج میں سے گزرتے ہوئے یوں ہی ٹی وی اسکرین پر نگاہ پڑی اور اسی لمحے نسرین (ملازمہ) بھی سامنے سے آتی دکھائی دی۔

"صاحب جی! ناشتا لے آوں؟"

ناولٹ

"ہاں! یہیں لے آؤ۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ "بابا جان چلے گئے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جی! چلے گئے ہیں' بڑے صاحب بھی اور بیگم صاحبہ بھی اور جی۔۔۔" نسرین کچھ کہتے کہتے رکی۔

"جملہ مکمل کریں نسرین صاحبہ!" میں مسکرایا۔

"کچھ نہیں چھوٹے صاحب وہی روز کی باتیں۔" نسرین بابا جان کے الفاظ دہراتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"مجھ پر برس رہے ہوں گے۔ دن چڑھے تک سونے پر خفا ہو رہے ہوں گے۔ آج کل آرام کا نہیں' کام کا زمانہ ہے۔ لیکن مجھے کوئی پروا ہی نہیں۔ باپ اس بڑھاپے میں بھی کولہو کے بیل کی طرح جتا ہوا ہے اور بیٹے کی غیر سنجیدگی جانے کا نام لے رہی۔ ہے نا نسرین بی! یہ ہی کچھ فرمایا ہو گا والد بزرگوار نے۔" میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

"جب آپ کو پتا ہے تو مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں۔" نسرین کو بھی ہنسی آگئی۔

"اچھا جاؤ! مزے دار سا ناشتا بنا کر لاؤ۔ پھر چلتے ہیں ہم بھی کام پر۔" میں نے گہری سانس اندر کھینچی۔

نسرین سر ہلاتے ہوئے مڑ گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دن بھر کے پلان ترتیب دینے لگا۔ سوچ رہا تھا کہ آج واقعی دل لگا کر کام کروں گا اور پچھلے دو دنوں سے جو سستی اور لاپروائی برت رہا تھا' اس کا ازالہ کر کے بابا جان کی خفگی کا بھی خاتمہ کروں گا۔ وہ مجھ پر صحیح خفا ہو رہے تھے۔ آرام کا زمانہ بیت چکا تھا' آج کل کام کرنے کا وقت تھا۔ آئندہ کے آرام کے لیے یہ کام' یہ

تک وہ بے حد ضروری تھی اور بابا جان کی اتنی بھاگ دوڑ کرنے کی اب عمر ہی کہاں تھی۔ اب مجھے ان کا دایاں بازو بن کر دکھانا تھا۔ میں نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا۔

لیکن جب تک نسرین ناشتا بنا کر لاتی اتنی دیر سکون سے بیٹھ کر ٹی وی تو دیکھا جاسکتا ہے نا۔ ٹی وی اسکرین پر موجود اس من موہن صورت والی لڑکی نے پھر سے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی وہ شاید کوئی کرنٹ افیرز کا پروگرام تھا۔ شاید کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ ٹی وی کا والیوم بند تھا مگر بغیر آواز کے بھی وہ صورت دیکھنے کے لائق تھی۔ صبیح رنگت، تیکھے نین نقوش اور آنکھیں عجیب سا سحر طاری کرنے والی تھیں۔

"واہ آفاق میاں! جب سے تم اس چینل کے ڈائریکٹر نیوز لگے ہو، لگتا ہے چینل پر اینکرز کی بہار آگئی ہے۔" میں نے دل ہی دل میں آفاق حیات کی کارکردگی کو سراہا۔ آفاق میرا لنگوٹیا یار تھا۔ اس نے کچھ دن پہلے ہی یہ چینل جوائن کیا تھا اور پروگرامز کی ریٹنگ کے لحاظ سے اس چینل نے دیگر چینلز میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر ہاتھ مار کر ریموٹ تلاشنا چاہا، مگر اس سے پہلے ہی میرا موبائل بجنے لگا تھا۔ والد بزرگوار کی کال تھی۔

"الٰہی خیر!" میں نے موبائل کان سے لگایا۔

"صبح ہوگئی ہے صاحب زادے!" پتا نہیں انہوں نے پوچھا تھا یا بتایا تھا۔ میں نے بھی فقط "جی" کہنے پر اکتفا کیا۔

"جی کے بچے! اگر اٹھ گئے ہو تو ٹی وی چلاؤ۔" بابا جان کی فرمائش میرے لیے تعجب خیز تھی۔

"آپ کا کوئی انٹرویو آرہا ہے۔۔۔ کس چینل پر بابا جان؟" میں نے ریموٹ اٹھا کر چینل سرچنگ کرنی چاہی۔

"حقیقت۔۔۔ لگاؤ۔" انہوں نے چینل کا نام لیا۔ میں جو چینل بدلنے والا تھا، رک گیا۔

"میں "حقیقت" ہی دیکھ رہا ہوں بابا جان! مگر اس پر تو ایک محترمہ اکیلے ہی بیٹھ کر کچھ بول رہی ہیں۔ شاید ابھی گیسٹ اناؤنس نہیں کیے۔"

"وہ محترمہ جو بول رہی ہیں۔ وہ تم مزے سے بیٹھ کر سن رہے ہو؟" بابا جان دھاڑے۔

"سن نہیں رہا، دیکھ رہا ہوں بابا جان!" میں نے فوراً" ان کی تصحیح کی۔

"اف دیکھ رہے ہو۔ گویا آنکھیں کھلی اور کان بند ہیں۔"

"ٹی وی کی آواز بند ہے بابا جان!" میں کچھ چڑ گیا۔ بابا جان کی تنقیدیں۔۔۔ اف!

"کیوں، کیا ریموٹ کے سیل ختم ہورہے ہیں؟" انہوں نے یقیناً" دانت پیسے تھے۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" میں عاجز آتے ہوئے بولا۔

"احمق! ٹی وی کا والیوم بڑھاؤ اور سنو اس لڑکی کی گوہر افشانیاں، جو وہ مسلسل پندرہ منٹ سے میرے متعلق کیے جارہی ہے۔ وہ تمہارا نکما دوست۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں! آفاق۔۔۔ اسے فون کھڑکاؤ۔ کہو کہ وقفے کے بعد جب پروگرام آن ایر ہو تو وہ تمہاری کال لیں اور تم نے ہماری پارٹی اور میری صفائی میں بیان دینا ہے پہلے تو سلیقے سے بھاؤ سے بات کرنا، بات سمجھ لیتی ہے تو ویل اینڈ گڈ۔ ورنہ تم جانتے ہونا۔"

"جی میں جانتا ہوں، "اٹیک از دا بیسٹ ڈیفنس۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

"گڈ! میں تمہاری کارکردگی دیکھنے کا منتظر ہوں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بابا جان! ریلیکس ہوجائیں، میں ٹیکل کرلوں گا۔" میں نے مزید فرماں برداری کا تاثر دیتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ بابا جان نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کال منقطع کی تو میں نے آفاق کا نمبر ملایا تھا اور بریک کے بعد جب پروگرام آن ایر ہوا تو مجھے لائن پر لے لیا گیا۔

"دیکھیں محترمہ! بغیر تحقیق کے کسی پر کوئی الزام لگانا اور بات ہوتی ہے اور ثبوت اور دلیل کے ساتھ بات کرنا دوسری بات اور سچی بات تو یہ ہے کہ سیاست دانوں پر تنقید کرنا نہ صرف بہت آسان ہے، بلکہ فیشن بن گیا ہے۔ آپ میرے والد صاحب پر بدعنوانی کے جو الزامات لگارہی ہیں، وہ سراسر غلط ہیں۔ میرے والد صاحب کی سیاسی اور سماجی خدمات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کچھ دنوں پہلے حکومتی سطح پر ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں اعلا ترین اعزاز دیا گیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ عوام کے بھروسے۔۔۔"

"جی یقیناً" معیز عباس! آپ درست کہہ رہے ہیں کہ حکومت کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں اعزاز کا مستحق گردانا گیا ہے، لیکن جس حلقے سے منتخب ہوکر وہ اسمبلی میں پہنچے تھے، وہاں کے غریب عوام کے لیے انہوں نے کیا کیا۔۔۔ سننے میں آیا ہے کہ حلقے کے ترقیاتی کاموں کے فنڈز انہوں نے صرف اپنے اور اپنے خاندان کی ترقی کے لیے خرچ کیے۔"

اس نے کٹیلے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ طنز میں تو محترمہ نے گویا پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ لیکن ایک بات تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہ تھا۔ وہ جتنی خوب صورت بغیر آواز کے لگ رہی تھی، اس کی مترنم آواز نے اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ کیسا من میں گھنٹیاں سا بجادینے والا لہجہ اور انداز تھا اس کا اور اس کے لبوں سے میرا نام کیسا بھلا اور پیارا لگا تھا۔ میں اس کے طنز کو فراموش کرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اس کی خوب صورت شخصیت کے سحر میں گم ہوگیا تھا۔

"جی معیز عباس! کیا آپ لائن پر ہیں؟ مجھے سن سکتے ہیں آپ؟" میری خاموشی پر وہ پوچھ رہی تھی۔

"جی! بولتی رہیے، میں سن رہا ہوں آپ کو۔" میرے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرائے تھے اور میرے لہجے میں ضرور کچھ ایسا تھا کہ وہ بھنا کر رہ گئی۔

"لگتا ہے معیز عباس! آپ لائن پر تو ہیں مگر حواسوں میں نہیں ہیں۔ میں نے آپ سے سوال پوچھا ہے۔ بلکہ آپ کی فرمائش پر ہی آپ کی کال پروگرام میں شامل کی گئی ہے۔ آپ اپنی چھوٹی سی پارٹی کے ترجمان کے طور پر اپنے والد صاحب کی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ آپ کو موقع دیا جارہا ہے۔ ہمارے الزامات کے جوابات میں کچھ کہنا چاہیں تو ضرور کہیں۔ یقیناً" آپ خود بھی دلیل کے ساتھ جواب دینے کے خواہش مند ہوں گے۔"

"شیور شیور۔" میں بھی فوراً" سنبھلا تھا۔ اس محترمہ نے تو کیا عزت افزائی کی تھی۔ اگر میں یوں ہی بونگیاں مارتا رہا تو بابا جان کی طرف سے ضرور عزت افزائی ہوجانی تھی۔

"تو میں کہہ رہا تھا مس۔۔۔" میں نے بات میں قصداً" وقفہ دیا۔ اچانک اس کا نام جاننے کی خواہش بھی دل میں انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ اصولاً اسے اپنے نام سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے چبا چبا کر میرا ہی نام لے دیا۔

"جی معیز عباس! میں سن رہی ہوں آپ کو۔"

"ہم نے اپنے حلقے کے عوام کے لیے کچھ کیا ہے یا نہیں، اس بات کا فیصلہ ہمارے حلقے کے عوام ہی بہتر طور پر کرسکتے ہیں، آپ نہیں۔۔۔ اور ہمیں ہمارے حلقے کے عوام کا اعتماد بھی حاصل ہے اور تائید بھی۔ اس بات کا فیصلہ الیکشن میں ہوجائے گا۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں معیز!" اس نے اس بار مجھے پورے نام کے بجائے صرف معیز کہہ کر پکارا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے اس کے تائیدی جملے سے زیادہ خوشی ملی ہے یا صرف معیز کہہ کر پکارنے سے۔

"ہمارے عوام بہت بھولے اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی بہت کمزور ہوتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ کی جانے والی پچھلی وعدہ خلافیوں اور زیادتیوں کو بھول کر نئے وعدوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ عوام پر آپ کا یقین بے جا نہیں ہے معیز!" تائیدی جملے کا مفہوم کچھ اور نکلا۔ مگر میری خوشی برقرار تھی۔ گویا فیصلہ ہوگیا تھا کہ مجھے کس بات سے زیادہ خوشی پہنچی ہے۔

"آج ہمارا اسٹوڈیو میں بیٹھ کر کیا جانے والا یہ آخری پروگرام ہے۔ الیکشن سے پہلے تک آخری،

کیونکہ اب ہم عوام میں نکلیں گے تو ان کی یادداشت پر دستک دیں گے۔ پچھلے الیکشن میں ان سے کیا وعدے ہوئے اور ان میں سے کتنے پایہ تکمیل کو پہنچے' یہ ان سے دریافت کریں گے۔ اگر وہ اپنے نمائندوں سے مطمئن اور خوش ہوئے تو ان کی خوشی ہمارے سر آنکھوں پر۔۔۔ اور سیاست دانوں کا ہم سے یہ شکوہ بھی دور ہو جائے گا کہ ہم صرف ان کی کوتاہیوں کو ہائی لائٹ کرتے ہیں۔ بلکہ اگر آپ لوگوں نے واقعی اپنے حلقے کے عوام کے لیے کچھ کیا ہوگا تو بجا طور پر آپ کو اس کا کریڈٹ دیا جائے گا۔ آنے والے الیکشن کے لیے ہماری جانب سے یہ اقدام آپ کی "فری الیکشن کیمپین" ثابت ہوگا۔ لیکن اگر عوام آپ سے مطمئن نہ ہوئے تو آپ کو ان کی ناراضی کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے اور ان کے سوالوں کے جواب دینا بھی۔ ہم اپنے پروگرام کی اس نئی سیریز کا آغاز آپ کے حلقے سے ہی شروع کر دیتے ہیں اور مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ میرے ساتھ ہوں۔"

"وائے ناٹ۔۔۔ شیور۔۔۔ یقیناً کیوں نہیں۔"

میری طرف سے زیادہ ہی خوشی بھرا اقرار ہوا تھا۔

اس نے بھی مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔ مجھے جانے کیوں لگا کہ اس نے دانت بھی کچکچائے ہیں۔ میرے دانت البتہ نکلے جا رہے تھے۔ ذرا دیر بعد بابا جان کی کال موصول ہوئی تو میری خوش گوار مسکراہٹ کو بریک لگے۔

"نالائق گدھے! تم سے ایک کام بھی ڈھنگ سے نہ ہو سکا۔ اب تم اس کے ساتھ اپنے حلقے کے عوام کا سامنا کرو گے؟ ہمارے مخالفین اس موقع سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' تمہیں اندازہ ہے کچھ؟ میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں پارٹی ترجمان کے عہدے سے فی الفور فارغ کر دوں۔ تم سے صرف زبان کے جوہر دکھانے کو کہا تھا۔ اتنی الٹی شنسی جھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جب ہمارا ضمیر صاف ہے تو ہم ان میڈیا والوں سے کیوں دبیں؟ آخر اتنے عرصے میں آپ نے اس حلقے کے عوام کے لیے کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا ہوگا بابا جان! میں آفاق سے کہہ کر پروگرام کا فارمیٹ اپنی مرضی کا رکھواؤں گا۔ جس میں ہمارے کروائے گئے کام بہت اچھے طریقے سے ہائی لائٹ ہوں۔"

"ہمارے کروائے گئے کام۔۔۔" بابا جان نے میرے لہجے کی نقل اتاری۔ "کام کروائے کس نے ہیں؟ تمہارے باپ نے؟" اگلے ہی پل بابا جان دھاڑے۔

"یقیناً" آپ نے ہی کروائے ہوں گے۔ میں تو پڑھائی سے فارغ ہو کر نیا نیا سیاست میں آیا ہوں۔" میں نے بہت غلط وقت پر معصومیت کا مظاہرہ کیا۔

"اور بیرون ملک اتنے مشہور اور مہنگے تعلیمی ادارے میں تمہاری پڑھائی کا خرچا میں نے کس طرح برداشت کیا۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کچھ؟"

"ہماری ایک ٹیکسٹائل مل اور لیدر گارمنٹس کی دو فیکٹریاں ہیں بابا جان! میری پڑھائی کا خرچا نکالنا آپ کے لیے کچھ اتنا بھی مشکل نہ تھا۔" ان کے احسان جتانے پر میں قدرے برا مانتے ہوئے بولا۔

"سیاست کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے تمہارے باپ کے پاس کیا تھا۔ اس کے کیا مالی وسائل تھے' جیسے تمہیں کچھ اندازہ ہی نہیں۔" ان کا انداز ایسا تھا' جیسے فون پر ہی مجھے کچا چبانے کی خواہش رکھتے ہوں۔

"نہیں بابا جان! مجھے واقعی کوئی اندازہ نہیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا' آپ سیاست میں ہی ہیں۔"

"ہمارے فون ٹیپ ہو سکتے ہیں۔ آخر! تم مجھ سے کون سا اعتراف سننا چاہتے ہو۔" انہوں نے بھنچی بھنچی آواز میں خفگی کا اظہار کیا۔

"اوہ۔۔۔" مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔

"بابا جان! آپ ٹینشن نہ لیں۔ رات کو جب آپ گھر آئیں گے ہم تب یہ معاملہ ڈسکس کر سکیں گے۔" میں نے فہم و فراست کا مظاہرہ کیا۔ بابا جان نے بنا کچھ کہے کال بند کر دی تھی۔ یقیناً" یہ ان کی طرف سے شدید ترین غصے کا اظہار تھا۔ میں چند لمحوں تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے چھوٹے صاحب!" نسرین نے آ کر میری سوچوں کا ارتکاز توڑا۔

"ناشتا تو کروا دیا بابا جان نے صبح ہی صبح۔" میں نے گہری سانس اندر کھینچی۔

نسرین نے دانت نکوسے تھے۔ میں نے اسے گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔ بھوک واقعی مر چکی تھی۔ میں پھر بیڈ روم میں چلا آیا۔

بیڈ پر نیم دراز ہو کر بابا جان کی خفگی دور کرنے کا طریقہ سوچنے لگا۔ سوچوں کا سلسلہ ذرا دراز ہوا تو خفگی کا سبب بننے والی محترمہ ذہن کی اسکرین پر چھم سے نمودار ہو گئیں۔ میرے لب خوامخواہ ہی مسکرانے لگے تھے۔ بابا جان ذرا دیر پہلے مجھ پر کیسے برس رہے تھے' سب کچھ ذہن سے محو ہو گیا۔ یاد رہی تو صرف وہ۔

میری باتوں سے آپ اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ میں کوئی دل پھینک سا نوجوان ہوں۔ کاش! میں آپ کو اندرون ملک اور بیرون ملک بسنے والی ان حسیناؤں کی فہرست گنوا سکتا جو میرا دل کیچ کرنے کے درپے رہتی تھیں' مگر میرا دل میرے سینے کی حدود میں ہی رہا۔ ہائے' ہیلو' دوستی اور ایک خاص حد تک بے تکلفی بہت سوں سے تھی مگر میں نے کسی کو اپنے دل کے ساتھ واردات نہ کرنے دی۔ لڑکیاں مجھ پر پروانوں کی طرح لپکتی تھیں۔ اس کا بڑا سبب اگر میری وجاہت اور میری شخصیت تھی تو اس سے بھی بڑا سبب میرا خاندانی بیک گراؤنڈ۔ ماضی کی بات چھوڑیے تو ہمارا حال ملک کے خوش حال ترین لوگوں والا تھا۔ بے حد آسودہ' دولت کی ریل پیل تھی۔

والد محترم کا شمار ممتاز سیاست دانوں میں ہوتا تھا۔ تین بڑی پارٹیاں یکے بعد دیگرے چھوڑنے کے بعد ہم اپنی چھوٹی سی پارٹی کے مالک تھے اور اس پارٹی کا الحاق اس پارٹی سے تھا' جس سے بابا جان سب سے پہلے بے وفائی کے مرتکب ہوئے تھے۔ بہرحال جنگ اور محبت میں تو سب جائز ہو نہ ہو' سیاست میں سب جائز ہوتا ہے۔ کل تک آپ جس کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں' اس سے اتحاد کر کے نئی توانائی کے ساتھ نئے مخالفین پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر غلطی سے کوئی آپ کو آئینہ دکھا دے تو اوروں کا پتا نہیں' ہماری پارٹی "آفنس از دا بیسٹ ڈیفنس" والی حکمت عملی اپناتی ہے۔

مجھے کوچہ سیاست میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ کچھ عرصہ پہلے تعلیم کا سلسلہ مکمل کر کے میں وطن واپس لوٹا ہوں۔ ملک کے سرکردہ رہنماؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میرے والد محترم نے بیرون ملک مجھے تعلیم دلوانے کا خصوصی اہتمام کیا۔ آخر جن لوگوں نے اس ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے ' انہیں اعلا تعلیم یافتہ تو ہونا چاہیے نا؟ اور بابا جان تو ملک و قوم کا خاص درد رکھنے والے بندے ہیں۔ اگر انہوں نے قوم کا پیسہ قوم کے مستقبل کی قیادت کو تعلیم یافتہ بنانے پر خرچ کیا تھا تو اس پر اعتراض کا میرے نزدیک تو کوئی جواز نہیں۔ لیکن وہ محترمہ تو بابا جان کے پتا نہیں کون کون سے کارنامے گنوا رہی تھیں۔

محترمہ کا خیال ایک بار پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کا سبب بنا تھا۔ آخر ایک ایسی لڑکی میں جس کے نام تک سے واقف نہیں تھا اور اصولاً" مجھے جس پر شدید ترین غصہ آنا چاہیے تھا۔ اس کا تصور میرے لیے اتنا خوش کن کیوں ہے کہ اسے سوچتے ہی میں مسکرانے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ سوال بہت پیچیدہ تھا۔

اور اسی سوال کا جواب جاننے کی جستجو مجھے آفاق حیات کے پاس لے گئی۔ آفاق میرا واحد دوست تھا جس سے میں اپنی کوئی بات نہ چھپا پاتا تھا۔ وہ میری زندگی کے ہر گوشے سے واقف تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے پتا تھا' آج تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے۔" وہ ہنستے ہوئے مجھ سے گلے ملا۔

"تو مصروف تو نہیں؟" میں نے اس کے شان دار

آفس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"تھا بھی تو اب نہیں ہوں۔" آفاق نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے اپنا لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"سنا ہے "حقیقت" والے بہت اچھا پیکیج دے رہے ہیں تجھے؟" میں نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

"پیکیج تو بلاشبہ اچھا ہے' مگر یہاں کام کرنے کی فریڈم بھی بہت ہے۔ مالکان بالکل پریشر نہیں ڈالتے۔"

"اور تیری اپنی پوزیشن کیا ہے؟ کسی کو پریشرائز کر سکتا ہے یا نہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کسی کو تو کر سکتا ہوں' لیکن شہرزاد جہانگیر کو ہرگز نہیں۔" وہ بہت زیرک بندہ تھا۔ مجھے اس کا یقین پہلے بھی تھا۔ اب مزید پختہ ہو گیا۔

"ویسے انکل بہت خفا ہو رہے ہوں گے؟" اس نے اندازہ لگایا۔ میں نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یار! میں نے اس سے کہا بھی تھا' ہولا رکھے' لیکن وہ اپنے پروگرام کے بارے میں کوئی ڈکٹیشن نہیں لیتی۔"

"تو محترمہ کا نام شہرزاد جہانگیر ہے۔ حیرت ہے' میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔"

"ہاں! حیرت ہی ہے' ورنہ شہرزاد تو بہت مشہور اینکر ہے۔ "حقیقت" سے پہلے "آسمان" پر ہوتی تھی۔ وہیں سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچی ہے۔" اس نے ایک اور مشہور چینل کا نام لیا۔

"کیسی لڑکی ہے؟ آئی مین اس کا فیملی گراؤنڈ؟" میں نے مزید کریدا۔

"یہ سب تو کیوں معلوم کر رہا ہے؟ تم لوگوں کے خلاف ایک پروگرام ہی کیا ہے نا یار! سیاست میں ہو تو تنقید سننے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے' مانا کہ انکل کی پبلک ریلیشننگ کی وجہ سے ان کی طرف اٹھنے والی انگلیاں بہت کم ہیں۔ انہیں ہر کسی کو خوش رکھنے کا ہنر آتا ہے لیکن یار! اب میڈیا بہت آزاد ہے۔ شہرزاد نہ سہی' کوئی اور بھی یہ موضوع اٹھا سکتا تھا۔ تردید تم لوگوں کا حق ہے' لیکن یہ کیا کہ تم اس کا بائیو ڈیٹا ہی اکٹھا کرنے لگ گئے؟" آفاق کو میرا اس کے بارے میں پوچھنا برا لگا تھا۔

"یار! تو مجھے تب سے جانتا ہے' جب ہم اسکول بیگ میں فیڈر رکھ کر اسکول جایا کرتے تھے۔ میں تجھے ایسا لگتا ہوں؟" اس کے غلط اندازے نے مجھے اس سے بھی زیادہ برہم کر دیا تھا۔

"پھر تیرے سوال کا مقصد؟" آفاق نے بھنویں اچکا کر دریافت کیا۔

"میں خود حد درجہ کنفیوز ہوں۔ تجھے اس سوال کا مقصد کیسے سمجھاؤں۔" میں نے بے بسی کا اظہار کیا۔ آفاق نا سمجھی کے عالم میں مجھے تکتا رہا۔

"یار! تو لو ایٹ فرسٹ سائٹ پر یقین رکھتا ہے؟ کیا واقعی اس دنیا میں یہ ممکن ہے؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔ آفاق ذرا سیدھا ہو بیٹھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی پھیل گئی۔

"او کھا مڑ! صحیح صحیح بتا' معاملہ کیا ہے؟"

"پہلے تو میرے سوال کا جواب دے۔"

"ہاں ہاں! پہلی نظر کی محبت ممکن ہے۔ مجھے خود چار' پانچ لڑکیوں سے پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ لیکن جب سے پانچویں لڑکی میری منگیتر بنی ہے' وہ مجھے کسی دوسری لڑکی پر پہلی نظر ڈالنے کی اجازت تک نہیں دیتی۔"

"تیرا ٹریک ریکارڈ اس لحاظ سے واقعی بہت شان دار ہے اور فرحین بالکل صحیح کرتی ہے' جو تجھے اپنے سوا کسی کو دیکھنے نہیں دیتی۔ لیکن یار! میں تو آج تک کسی لڑکی کے دام الفت میں گرفتار نہیں ہوا۔ تو جانتا ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی مجھ پر مر مٹنے کو تیار ہوتی تھی۔ لیکن۔۔۔"

"ہے نا تو سیاست دان کا بیٹا۔ نرگسیت کا شکار اور بلاوجہ ہی بات کو طول دے رہا ہے۔ اب بک بھی دے تو کس پر مر مٹا ہے؟" آفاق نے جھنجلا کر میری بات

کاٹی تھی۔

"یار! یہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ہوں، حتیٰ کہ نام تک نہیں اور وہ آپ کو اتنا اچھا لگنے لگ جائے کہ اس کا تصور ہی آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دے، اس سب کو کیا نام دیا جائے؟"

"پاگل پن۔" آفاق نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر جواب دیا تھا۔

"ہاں! واقعی شاید یہ پاگل پن ہے۔" میں نے بھی فراخ دلی سے تسلیم کرلیا۔ اور اسی لمحے دروازے پر دستک کے بعد وہ شخصیت اندر آئی تھی جو آج صبح سے میرے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی تھی۔

"معیز عباس... عباس احمد خان کے صاحب زادے۔" آفاق نے میرا تعارف کروایا۔

"جی! جانتی ہوں میں۔ اخباروں میں کبھی کبھار اپنے والد صاحب کے کندھے کے پیچھے کھڑے نظر آجاتے ہیں یہ اور اب تو پارٹی ترجمان کی حیثیت سے ایک، دو پریس بریفنگز بھی دی ہیں انہوں نے۔ یہ اور بات کہ ان سے زیادہ ان کے والد صاحب کو ہی بولنا پڑتا ہے۔" وہ میرے بارے میں اتنا جانتی تھی۔ مجھے سن کر بہت خوشی ہوئی۔

"معیز میرا بہت اچھا دوست ہے اور اس وقت یہ مجھ سے دوست کی حیثیت سے ہی ملنے آیا ہے۔ اس لیے تم یہ گولہ باری بند کردو۔" آفاق نے اسے اپنائیت سے ڈپٹا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور میں تو اس کی مسکراہٹ کے سحر میں پہلے ہی گم تھا۔

"آفاق صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے ملک کے لیے کتنی حساس ہوں، اس لیے جب بھی میرا سامنا کسی ایسے بندے سے پڑتا ہے جو ملک کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتا ہو تو میں کچھ جذباتی ہوجاتی ہوں۔ بہرحال سوری فار ویٹ۔" اس نے آخری جملہ میری طرف دیکھ کر بولا تھا اور میں جو بہت فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا، ایک دم گڑبڑا گیا۔

"جی! کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" مجھے واقعی اس کی بات سمجھ میں ہی نہ آئی تھی۔ اس نے اس بار کچھ نہ کہا، صرف مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر آفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ اس وقت بزی ہیں۔ میں پھر آجاؤں گی آفاق صاحب!" ناصر کے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہے۔ وہ چھٹیوں پر جانا چاہ رہا ہے۔ میں اس مسئلے پر آپ سے بات کرنے آئی تھی۔ مجھے دوسرا بندہ درکار ہوگا۔ مگر وہ ناصر کی طرح کومپیٹنٹ ہونا چاہیے۔ بہرحال ہم یہ مسئلہ بعد میں ڈسکس کرلیں گے۔ آپ اپنے دوست کو ٹائم دیں۔" وہ واپس مڑ گئی اور اس کے جانے کے بعد مجھے جیسے ہوش آیا۔

"تم شہرزاد کو روکتے تو سہی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہمارے حلقے میں جاکر پروگرام کرنا چاہتی ہے۔ میں اس سے پروگرام کا فارمیٹ پوچھنا چاہ رہا تھا۔"

"بیٹا جی! چاہ تو تم کچھ اور رہے ہو، لیکن تمہارے دل نے بہت غلط جگہ پر آکر دغا دی۔ شہرزاد بہت مشکل لڑکی ہے۔ کیا واقعی یہ لو ایٹ فرسٹ سائٹ والا معاملہ ہوا ہے۔" آفاق جیسا جینئس بہت جلد معاملے کی تہ تک پہنچا تھا۔

"سو فیصد، بلکہ دو سو فیصد لو ایٹ فرسٹ سائٹ، کیونکہ ٹی وی کا والیوم بند تھا۔ صرف دیکھنے ہی دیکھنے میں دل کے ساتھ ہاتھ ہوگیا۔" میں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ آفاق کا قہقہہ چھت پھاڑ تھا۔

"امیزنگ، ان بلیو ایبل۔" کچھ دیر بعد اس نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بے یقینی سے سر جھٹکا تھا۔

"تجھے یقیناً "کسی لڑکی کی بددعا لگی ہے اور کچھ نہیں۔ بہرحال! میری نیک تمنائیں تیرے ساتھ ہیں۔"

"اچھا! یہ تو بتا، وہ میرے ساتھ حلقے میں جاکر جو پروگرام کرنا چاہتی تھی، وہ کب ہوگا۔" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پہلے آپ اپنے حلقے کی خبر لیں معیز صاحب! شہرزاد تمہارے ساتھ وہ کرسکتی ہے کہ عاشقی کا بھوت دو منٹ میں سر سے اتر کر بھاگ جائے گا۔ تم اپنے ایریا میں جاکر ہوم ورک مکمل کرو۔ لوگوں کو پیسے ویسے دے کر ساتھ ملاؤ۔ ویسے تو ضروری نہیں تھا کہ تم اس کے ساتھ عوام اور کیمرے کا بیک وقت سامنا کرتے۔ اس نے تو شہر کے مختلف حلقوں کے بارے میں عمومی نوعیت کے پروگرام کرنے تھے۔ وہاں کے لوگوں سے ان کے مسائل پوچھنے تھے۔ کون سا عوامی نمائندہ ایسا ہوگا جو اپنے خلاف چارج شیٹ سننے کے لیے ایک نجی چینل کی میزبان کے ساتھ گھومے پھرے گا؟ لیکن تم نے خود تیسج والے پروگرام میں بصد شوق ہامی بھرلی ہے، تو اب بھگتنا بھی تمہیں خود ہی پڑے گا۔ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔" آفاق نے مجھے ہری جھنڈی دکھادی تھی۔

"ٹھیک ہے مجھے تیری مدد کی ضرورت بھی نہیں۔ میں دوست کی حیثیت سے تجھ سے ملنے آگیا تھا۔ الحمد اللہ! میرے پاس بہت اختیارات اور وسائل ہیں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لڈ! اب لگے ہو نا عباس احمد خان کے بیٹے۔ عوامی نمائندوں کے لیے گردن میں کلف ہونا ضروری ہے یار! ورنہ بندہ بے چارہ عوام عوام سا لگنے لگتا ہے۔" آفاق نے مسکراہٹ دباتے ہوئے مجھے چھیڑا۔

میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ بابا جان بھی مجھ سے اسی لیے نالاں رہتے تھے۔ میں ہرگز ویسا ثابت نہ ہورہا تھا جیسی انہوں نے مجھ سے توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

"میں نے تمہیں مہنگے سے مہنگے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی ہے۔ پھر بھی جانے کیوں تمہاری شخصیت میں کچھ کمی سی لگتی ہے۔" بابا جان اکثر و بیشتر میرے سامنے یہ جملہ دہراتے تھے۔

"تم اپنی شخصیت سے اتنے بے نیاز کیوں ہو؟ تم عباس احمد خان کے بیٹے ہو۔ اپنا لاابالی پن چھوڑ کر سنجیدہ ہوجاؤ۔ میں تمہیں بہت اوپر تک جاتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔" ابھی پرسوں ہی بابا جان نے میری ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔

"کیا کمی ہے میرے بیٹے میں۔ اتنا ڈیشنگ، ہینڈسم اور اسمارٹ ہے۔" ماما کو بابا جان کے اعتراضات سخت برے لگے تھے۔

"اس اسمارٹ بندے کی پرسنالٹی میں کچھ رعب داب، کچھ رکھ رکھاؤ بھی ہونا چاہیے۔ یہ تو نوکروں تک سے گپیں لڑانے بیٹھ جاتا ہے۔ اگر اسے میرے ساتھ قدم سے قدم ملاکر چلنا ہے تو ہر طرح کی غیر سنجیدگی ترک کرنی ہوگی۔" بابا جان نے بہت سنجیدگی بھرے انداز میں مجھے وارننگ دی تھی۔

اور میں سوچ بیٹھا تھا کہ بابا جان کو اب واقعی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میری وجہ سے پھر ایک مشکل کھڑی ہونے والی تھی، الیکشن سر پر آچکے تھے۔ بابا جان کی جوڑ توڑ والی سیاست آج کل عروج پر تھی اور ایسے موقعے پر میں شہرزاد کی "سنگت" میں اپنے حلقے کی سیر کو نکل جاتا تو یہ پروگرام یقیناً "ہماری الیکشن کیمپین کو متاثر کرتا۔ آفاق صحیح کہتا تھا۔ مجھے پہلے اپنا ہوم ورک مکمل کرنا چاہیے تھا۔ میں نے پروگرام سے پہلے ہی اپنے حلقے کے عوام میں جانے کا فیصلہ کیا۔ پانچ سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ آخر بابا جان نے عوام کے لیے کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا ہوگا اور مجھے اسی "کچھ نہ کچھ" کی تلاش تھی جس کو دکھا کر میں شہرزاد کا منہ بند کرسکوں۔ اس مرحلے کے بعد اس کے دل تک رسائی کے طریقے سوچے جاسکتے تھے۔

وہ لڑکی واقعی میرے حواسوں پر سوار ہوگئی تھی۔ بلاشبہ اس کے حسن میں کوئی کلام نہ تھا۔ لیکن میرا دل صرف اس کے حسن کی وجہ سے اس کی طرف نہ کھنچا تھا، اس کی شخصیت میں عجیب سی تمکنت تھی۔ مقابل کو زیر کردینے والی جھیل سی گہری آنکھیں جن سے بے تحاشا ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس کی مشرقیت، اس کی سادگی اور اس کی مترنم آواز۔ پتا نہیں ان میں سے اس کی کون سی خاصیت ٹھاہ کرکے میرے دل کو لگی تھی۔

میں نے اس کے پچھلے پروگرامز کی ریکارڈنگز بھی دیکھ ڈالی تھیں اور ہر بار وہ مجھے میرے آئیڈیل کے تصور سے مزید قریب لگتی۔ وہ اپنی ہم عصر خواتین

اینکو زکی طرح چیختی چلاتی نہ تھی۔ یہ اسی کا سلیقہ تھا کہ وہ انتہائی کاٹ دار بات کس طرح اتنے دھیمے سروں میں کر جاتی تھی۔ وہ اپنے ملک اپنے لوگوں کے لیے پاگل پن کی حد تک جذباتی تھی۔ اب اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔

اور اس کے ایک ممکنہ پروگرام کے خوف نے مجھے بھی میرے لوگوں میں پہنچا دیا۔

☆ ☆ ☆

ایک پورے دن میں، میں اپنے حلقے کے کچھ علاقوں کا ہی وزٹ کر سکتا تھا۔ بغیر کسی پروٹوکول کے میں مختلف علاقوں میں گھوما پھرا تھا۔ لوگ مجھے اپنے درمیان پا کر بے تحاشا خوش ہوئے تھے۔ ایک دو جگہ تو نعرے بازی کا بھی سماں بن گیا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی علاقے کی جو حالت تھی، مجھے تو لوگوں سے چہرہ چھپا کر پھرنا چاہیے تھا۔ میں ان کے منتخب نمائندے کا بیٹا تھا اور اس منتخب نمائندے نے انتخاب کے بعد ان کے لیے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود جیسے جیسے لوگوں کو علم ہو رہا تھا کہ عباس احمد خان کا بیٹا ان کے علاقے میں آیا ہوا ہے۔ وہ جوق در جوق میرے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔

مجھے کسی تجزیہ نگار کے الفاظ یاد آ رہے تھے کہ ہمارے عوام سیاسی لیڈران کو دیوتاؤں کا درجہ دینے لگ جاتے ہیں اور ایک بار جس سیاسی خانوادے کے ہاتھ پر بیعت کر لیں پھر اپنی نسلوں کو ان کی نسلوں کا مرید بنا دیتے ہیں۔

لیکن شاید اب آہستہ آہستہ عوام میں شعور بیدار ہو رہا تھا۔ جب مجھے بہت سے ناراض نوجوانوں کے تند و تیز جملوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تو یقین مانیں! مجھے ان پر رتی برابر بھی غصہ نہ آیا حالانکہ بشیر جو بابا جان کا پولیٹیکل سیکریٹری تھا اور آج میرے ہمراہ تھا۔ وہ ان جذباتی نوجوانوں کو مخالف کیمپ کا قرار دے کر مجھے ان کے پاس رکنے نہ دینا چاہ رہا تھا۔

"پلیز بشیر صاحب! مجھے اپنے لوگوں کی بات سننے دیں اور ان کے مسائل سمجھنے دیں۔" میں نے بشیر غفار کو سنجیدگی سے ٹوک دیا تھا۔

لوگوں کے چہرے میری بات سن کر دمک اٹھے تھے۔ واقعی ہمارے عوام بہت بھولے ہیں۔ انہیں بہلانے کے لیے محض چند لفظ ہی تو بولنے پڑتے ہیں لیکن آج میں نے جو صورت حال دیکھی تھی۔ میں لفظوں کے علاوہ ان لوگوں کے لیے کچھ عملی کام بھی کرنا چاہتا تھا۔ خدا گواہ ہے کہ نہ مجھے شہزاد کے ممکنہ پروگرام کا خوف تھا، نہ آنے والوں الیکشن کے لیے لوگوں کے دل جیت لینے کی تمنا۔ مجھے فقط احساس شرمندگی تھا۔

میں نے اب تک بابا کے ساتھ بہت سی پارٹی میٹنگز اٹینڈ کی تھیں اور ان اجلاسوں میں ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے منصوبے تیار کیے جاتے تھے۔ ہماری منشور کمیٹی بھی بہت قابل اور پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھی۔ اگرچہ ہماری پارٹی صوبائی سطح کی ایک چھوٹی پارٹی تھی۔ چند نشستوں کے عوض ایک، دو وزارتیں مل جاتیں، یہ ہی غنیمت تھا۔ منشور پر عمل در آمد ہونا اس لیے ہمارا درد سر نہ تھا لیکن رسمی کارروائیاں تو پوری کرنی ہی پڑتی ہیں۔

لیکن آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان رسمی کارروائیوں کے علاوہ ہم صرف اپنے حلقے کے عوام کے لیے کچھ عملی کارروائیاں بھی کر ڈالتے تو میرا ضمیر مجھے اتنی ملامت نہ کر رہا ہوتا۔ بڑے بڑے مسئلے تو حل طلب تھے ہی کتنے چھوٹے چھوٹے مسئلے بھی ان پانچ سالوں میں حل نہ ہو سکے تھے۔ گورنمنٹ بوائز اسکول کی ٹوٹی ہوئی چار دیواری، فرنیچر کی قلت، گرلز اسکول میں پنکھوں کی عدم دستیابی، واٹر فلٹریشن پلانٹ جو علاقے کے لوگوں کو صاف پانی فراہم کرنے کی غرض سے لگایا گیا تھا، جانے کیوں اب تک چالو نہ ہو سکا تھا۔ سرکاری ڈسپنسری میں دواؤں کی قلت، غرض ایسے چھوٹے چھوٹے درجنوں مسئلے تھے جن کی وجہ سے لوگ بڑی پریشانی میں مبتلا تھا لیکن شاید وہ بھی اس صورت حال کے عادی تھے۔ بہت سے منصوبے، جن کا افتتاح بابا جان کے مبارک ہاتھوں سے انجام پایا تھا، تکمیل سے ہنوز بہت دور تھے لیکن ہم نے اپنی انتخابی مہم میں ان ہی منصوبوں کا ذکر بہت فخر سے کرنا تھا۔ کیا تھا جو ابھی تک مکمل نہ ہو سکے تھے، کبھی نہ کبھی تو انہوں نے مکمل ہو ہی جانا تھا لیکن جانے کیوں مجھے اپنے دل و دماغ اور ضمیر پر بہت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بابا جان اپنا طبی معائنہ کروانے کی غرض سے چند دنوں کے لیے باہر گئے تھے۔ حکومت کی پر حقیقی میں کچھ وقت رہ گیا تھا۔ سرکاری خرچ پر تشفی آمیز معائنے کے بعد آخر بابا جان نے کمر کس کے انتخابی مہم کی قیادت بھی تو کرنی تھی اور مجھے جو کرنا تھا، وہ بھی ان چند دنوں میں ہی کرنا تھا۔ میں نے ذاتی دلچسپی لے کر علاقے کے چھوٹے چھوٹے درجنوں حل طلب مسئلوں کو حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ "تاکافی" سرکاری فنڈز تو کب کے ختم ہو چکے تھے۔ اب جو خرچ کرنا تھا وہ اپنی جیب سے ہی خرچ کرنا تھا اور میری "جیب" میں کون سا میرا ذاتی پیسہ تھا۔ سب بابا جان کا ہی کمایا ہوا تھا ورنہ ہو سکتا ہے میں پیسہ خرچ کرتے وقت ہچکچاتا لیکن اب تو بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا۔

اور جب اپنے معتبر بندوں کے ذریعے بابا جان تک میرے کارنامے پہنچے تو پلوں کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا تھا اور بینک اکاؤنٹس میں سے بہت سا پیسہ نکل چکا تھا۔ پہلی ممکنہ فلائٹ سے بابا جان وطن واپس پہنچ گئے۔

"تم احمق، نالائق، گدھے! میری عمر بھر کی کمائی کیسے دونوں ہاتھوں سے لٹانے پر لگے ہوئے ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں پیسہ کتنی مشکلوں سے کمایا جاتا ہے اور آج کل کے دور میں جب میڈیا آزاد اور عدالتیں فعال ہیں تو اس پیسے کو کتنی مشکلوں سے لوگوں کی نظروں سے چھپانا پڑتا ہے۔ الیکشن سر پر ہیں پانی کی طرح وہاں پیسہ بہایا جائے گا۔ اللہ کرے جیت اس بار بھی مقدر بنے پھر تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن میرے منہ میں خاک، اگر ہار گئے تو کیا بنے گا ہمارا۔" بابا جان کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ چہرہ سرخ ٹماٹر اور آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔

"بابا جان! اگر ایک عرصے تک ہم نے عوام پر خرچ کیے جانے والا پیسہ بے دریغ اپنے اوپر خرچ کیا تو اگر اب اپنا تھوڑا سا پیسہ عوام پر خرچ کر دیں گے تو اس کا کوئی نقصان تو نہیں، بلکہ ہو سکتا ہے آپ کو الیکشن میں فائدہ ہو جائے۔" میں نے رسانیت سے انہیں سمجھانا چاہا۔

"اپنی فضول دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرو۔" بابا جان نے مجھے غضب ناک نگاہوں سے گھورا پھر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئے۔

"کتنی امیدیں تھیں مجھے تم سے۔ کیا کیا خواب نہ دیکھ رکھے تھے تمہارے متعلق۔ میں نے جو کچھ مقام، مرتبہ حاصل کیا ہے، وہ اپنے زور بازو سے حاصل کیا ہے۔ لیکن تمہیں تو سب کچھ بیٹھے بٹھائے ملا ہے شاید اسی لیے تمہیں اس کی قدر نہیں۔ تم جانتے ہو تمہارے دادا کیا تھے، ایک ریٹائرڈ اسکول ہیڈ ماسٹر۔ میں پیدائشی صنعت کار یا جاگیردار نہیں ہوں۔ دوسرے سیاست دانوں سے بہت مختلف بیک گراؤنڈ ہے میرا۔ محض اپنی ذہانت، اپنی عقل اور محنت سے میں نے یہ مقام اور مرتبہ حاصل کیا ہے۔ تمہارے دادا کے بتائے گئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتا تو آج میں بھی سولہویں یا سترہویں گریڈ کا سرکاری ملازم ہوتا۔ "ایمان داری" سے روزی کماتا اور تم لوگوں کو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترساتا۔" بابا جانے جیسے چبا چبا کر لفظ "ایمان داری" ادا کیا تھا، مجھے شاید دکھ ہوا تھا۔

"جانے تم کس پر چلے گئے ہو معیز!" بابا جان بھی شدید ترین دکھ کی لپیٹ میں تھے۔

اور میں جو گردن جھکائے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنے جا رہا تھا۔ جانے کیا کہنے کے لیے سر اٹھایا تھا کہ سامنے دیوار پر لگی دادا جان کی تصویر پر نظر پڑی۔ مجھے لگا جیسے

وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہوں۔ خیر! تھا تو یہ میرا وہم ہی۔ مگر پھر بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور یہ مسکراہٹ بابا جان کی نظروں سے مخفی نہ رہ پائی۔

"میں تمہیں لطیفے سنا رہا ہوں؟" وہ گرجے اور اتنا گرجے برسے کہ ماما کو مداخلت کرنی پڑی۔

"تم اپنے بابا کی نگاہوں سے تھوڑی دیر کے لیے اوجھل کیوں نہیں ہو جاتے؟ دیکھ نہیں رہے ان کا بی پی شوٹ کر رہا ہے؟"

میں نے موقع غنیمت جانا اور اپنی جگہ ماما کو بابا کے رحم و کرم پر چھوڑا اور گھر سے نکل گیا۔ اب مجھے بھی شدید ترین ڈپریشن ہو رہا تھا۔ بابا کو خوش رکھتا تو مجھے اپنا ضمیر تھپک تھپک کر سلانا پڑتا جبکہ میرا ضمیر جو ایک طویل نیند کے بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا' اتنی جلدی دوبارہ سونے کے موڈ میں نہ تھا۔

میں مشورے کے لیے آفاق کے پاس چلا گیا وہ معروضی حالات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو اس نے حسب معمول فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ مگر پھر میرے گھورنے پر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

"بیٹا جی! اگر اپنے باوا کو خوش رکھنا ہے تو خدمت خلق کا بھوت اپنے سر سے اتارنا پڑے گا۔" نئے سرے سے میری ساری بپتا سن کر اس نے وہی پرانا مشورہ دیا' جو دو روز قبل فون پر دے چکا تھا۔

"ہرگز نہیں آفاق صاحب! آپ اپنے دوست کو اتنا غلط مشورہ کیسے دے سکتے ہیں۔"

ہماری گفتگو میں تیسرے بندے بلکہ بندی کی مداخلت اتنی اچانک اور حیرت انگیز تھی کہ ہم دونوں ہکا بکا رہ گئے۔

"معذرت چاہتی ہوں معیز! میں نے دروازے کے پیچھے سے آپ کی گفتگو سن لی۔ کی تو میں نے ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ میں پھر معذرت چاہتی ہوں۔ لیکن پلیز آپ ہمت نہ ہاریں۔ اچھا کام کرنے میں رکاوٹیں تو آتی ہیں مگر رکاوٹوں سے گھبرانا مردوں کا شیوہ تو نہیں۔" وہ شہرزاد تھی جو بہت ملائم لہجے میں مجھ سے مخاطب تھی۔

"مجھے افسوس ہے' میں نے آپ کے متعلق بہت غلط اندازے لگائے۔ آپ کے خیالات جان کر مجھے اپنے اندازوں پر افسوس ہوا۔ آپ کے خیالات پر خوشی ہو رہی ہے۔ یہ ملک ہمارا ہے معیز! اگر ہم' آپ اور ہمارے جیسے دوسرے نوجوان یہ عزم کر لیں کہ ہمیں اپنی اپنی سطح پر اس ملک اور اس ملک میں بسنے والوں کے لیے کچھ کرنا ہے تو یقین کریں! ایسا کر کے نہ صرف ہم اپنی پچھلی نسل کی غلطیوں کی تلافی کر دیں گے بلکہ ہماری آئندہ آنے والی نسلیں بھی ہم پر فخر کریں گی۔ انہیں ہمارے کارناموں پر منہ نہیں چھپانا پڑے گا ہم اپنے ضمیر کے سامنے بھی سرخرو ہوں گے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے سامنے بھی۔"

اس نے دروازے کے پیچھے سے جانے میری کون کون سی بات سن لی تھی اور ان میں سے کس بات سے اتنی متاثر ہو گئی تھی کہ جوش جذبات میں تقریر ہی جھاڑ دی۔ اس کی تقریر تو خیر میرے سر پر سے ہی گزر گئی تھی کہ اسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر دماغ غیر حاضر تھا۔ دل البتہ ضرورت سے زیادہ حاضر اور فعال تھا اور ایک انوکھی لے پر دھڑک دھڑک جا رہا تھا۔

میں دھڑکن کے شور پر ایسا گھبرایا کہ آفاق کو "اللہ حافظ" کہہ کر فوراً" ہی وہاں سے چلا آیا۔ اسی شام مجھے شہرزاد نے فون کیا تھا۔

"آپ دوپہر کو جلدی میں تھے معیز! میری آپ سے تفصیلی بات ہی نہیں ہو سکی۔ کیا اس وقت آپ فری ہیں؟"

"جی' جی بالکل۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔ جانے اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ میری سٹی گم ہو جاتی تھی۔

"اگر کل شام آپ فارغ ہوں تو اسٹوڈیو آجایے گا۔ ایک پروگرام میں آپ سے شرکت کی استدعا ہے۔ میں بھی اس پروگرام میں گیسٹ کے طور پر مدعو ہوں۔ نوجوانوں کے لیے ہمارے چینل نے ایک خاص پروگرام ترتیب دیا ہے۔ نیلم ہمدانی ہوسٹ کریں گی۔ نئی نسل جو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں۔ ہمیں ان کے ایٹی ٹیوڈ کو ڈسکس کرنا ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں وہ کتنا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں' انہیں اس بات کا احساس دلانا ہے۔ خصوصاً" یہ الیکشن پاکستان کے مستقبل کے لئے اہم ترین الیکشن ہے۔ نوجوان نسل اگر کمر کس لے تو یہ وڈیرے' سرمایہ دار' جاگیردار جو بے شک ہر پارٹی میں شامل ہیں' وہ یہ الیکشن ہائی جیک نہیں کر پائیں گے۔"

ایک تو یہ لڑکی ہر وقت تقریر کے موڈ میں ہوتی تھی۔ میں نے گہری سانس اندر کھینچی تھی۔

"ہیلو معیز! کیا آپ لائن پر ہیں؟" آخر کار اسے خیال آگیا تھا کہ وہ تقریر نہیں کر رہی کسی سے فون پر بات کر رہی ہے۔

"شہرزاد! آپ نے مجھ سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ میں بھی اسی اسٹیٹس کا ہی حصہ ہوں' جس کے خلاف آپ علم بغاوت بلند کرتی رہتی ہیں۔ میرے چند کارناموں سے متاثر ہو کر اگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ میں آپ اور نیلم ہمدانی جیسے انقلابیوں کے پروگرام میں شرکت کر کے آپ کی حسب پسند گفتگو کروں گا تو معاف کیجئے گا! یہ بھول ہے آپ کی۔" میں نے بھی اس کی تقریر کے جواب میں یہ طویل جملہ ذہن میں ترتیب دیا تھا لیکن جو بولنے کی باری آئی تو صرف اتنا پوچھنے پر اکتفا کیا۔

"آپ نے کیا ٹائم بتایا تھا پروگرام کا؟"

"آپ سات بجے تک پہنچ جایئے گا۔ لائیو پروگرام ہے آٹھ بجے تک نشر ہو گا۔"

"ٹھیک ہے! میں حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے یقین دہانی کے بعد اللہ حافظ کہہ کر کال منقطع کر دی۔

☼ ☼ ☼
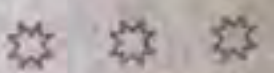
اگلے روز میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ شہرزاد نے مجھے ممکنہ سوالوں سے آگاہ کر دیا تھا بلکہ آگاہ تو اس نے ممکنہ جوابوں سے بھی کر دیا تھا۔ میرا کام کیمرے کے سامنے جا کر وہی باتیں دہرانے کا تھا' جس کی مجھے شہرزاد نے ریہرسل کروا دی تھی۔

"آپ کی شخصیت بہت سحر انگیز ہے معیز! آج کے پروگرام میں آپ کو مدعو بھی اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ اتنے ڈیشنگ اور اسمارٹ بندے کی سیٹ پر موجودگی کی وجہ سے لوگوں کی پروگرام میں دلچسپی بڑھ جائے گی۔" نیلم ہمدانی کے لہجے میں میرے لیے ستائش چھپی تھی۔

میں محض مسکرا کر گیا تھا۔ تعریف ظاہر ہے کسی کو بری نہیں لگتی لیکن میرا دل تو خود کسی کی برملا تعریف کرنے کو بے چین ہوا جا رہا تھا۔ آسمانی رنگ کے سوٹ میں وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔

پروگرام شروع ہوا تو مجھے اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ وہ بول رہی تھی اور میں مسحور ہو کر اسے سنے جا رہا تھا پھر پتا بھی نہ چلا کہ کب سننے کے ساتھ اسے دیکھنا بھی شروع کر دیا۔ عجیب خود فراموشی کی کیفیت تھی۔ وہی کیفیت' جو ہر بار اسے دیکھ کر مجھ پر طاری ہو جاتی تھی۔ آفاق جس کو پاگل پن گردانتا تھا۔ میں بھول گیا کہ میں اس وقت' بہت سے کیمروں کے سامنے بیٹھا ہوں اور اسٹوڈیو میں میرے اور شہرزاد کے علاوہ اور بھی لوگ موجود ہیں' جو یقیناً" اندھے نہیں ہیں اور متواتر میری کیفیت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

کیمرہ مین کے لیے بھی یہ منظر اتنا دلچسپ تھا کہ وہ اس پر سے نگاہیں نہیں ہٹا سکا اور نگاہوں کے سامنے چونکہ کیمرا تھا سو وہ بھی نگاہوں کے ساتھ ہی متحرک رہا۔ صرف شہرزاد تھی جو بہت جوش و خروش سے اپنی تقریر کیے جا رہی تھی۔ درمیان میں اس نے ایک دو بار مجھے بھی مخاطب کیا۔ پتا نہیں کسی بات کی تائید چاہ رہی تھی یا تردید۔ میں بوکھلا کر صرف "آں ہاں" کہنے پر اکتفا کرتا۔ نیلم ہمدانی عقل مند خاتون تھیں' انہوں نے مجھ سے کوئی سوال کرنے سے گریز ہی کیا اور آخر کار شہرزاد جہانگیر کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کیمرے سے زیادہ میری نگاہوں کے فوکس میں ہے۔

"کتنی دیر سے آپ گردن ترچھی کیے بیٹھے ہیں۔

پلیز! اگر دن سیدھی کر کے بیٹھیں معیز عباس!"

اس کی تنبیہی سرگوشی مجھے ہوش میں لانے کا سبب بنی تھی لیکن اب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ نیلم ہمدانی پروگرام کے اختتامی کلمات ادا کر رہی تھیں۔ پتا نہیں پروگرام کے شرکاء میں سے کون کیا کیا بولا تھا۔ البتہ سب کے شکریے کے ساتھ میرا بھی شکریہ ادا کیا گیا جو میں نے مسکرا کر وصول کیا۔ میں کب جانتا تھا یہ میرے لبوں پر آنے والی آخری مسکراہٹ تھی۔ پروگرام کا فیڈ بیک پروگرام ختم ہونے کے تین منٹ بعد ہی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

"ساٹھ منٹ کے پروگرام میں شروع اور آخر کے دس' دس منٹ اشتہاروں کے نکال دیے جائیں تو چالیس میں سے اڑتیس منٹ آپ نے اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی کو گھورنے پر صرف کیے ہیں۔ وہ بھی ایک لائیو پروگرام میں۔ خیریت چاہتے ہیں تو گھر کا رخ نہ کریں چھوٹے صاحب! بڑے صاحب نے اتفاقاً" آپ کا پروگرام دیکھ لیا ہے اور وہ شدید غصے میں ہیں۔"

یہ مراد تھا۔ بابا جان کا ڈرائیور اور نسرین کا میاں۔ شاید نسرین کے کہنے پر ہی اس نے مجھے میسج بھیجا تھا۔

"او خدایا! مجھ سے کیا حماقت سرزد ہو گئی ہے۔"

میں فوراً" اسٹوڈیو سے رفوچکر ہونے کی سوچی۔ پارکنگ میں آکر گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ آفاق کی کال آئی۔

"معیز! یہ آج کیا حرکت کی ہے تم نے۔ یہ پروگرام براہ راست نشر ہو رہا تھا۔ کیا اس کے بعد تمہیں شہزاد کو پھر دیکھنے کا موقع نہ ملتا جو یوں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھے ہی گئے؟ تم نے تو چلو قسم کھائی ہے کہ مجنوں کے جانشین بن کر ہی دم لوگے۔ لیکن یار! سوچنا چاہیے تھا لڑکیوں کی عزت آبگینے سے زیادہ نازک ہوتی ہے۔ جس والہانہ انداز میں تم اسے تک رہے تھے یہ بات پروگرام دیکھنے والے ہر بندے نے نوٹ کی ہوگی۔ شہزاد جیسی ڈیسنٹ لڑکی لوگوں کے تبصروں کی زد میں آجائے گی۔ تم نے حد ہی کر دی معیز!" آفاق شدید ترین خفا ہو رہا تھا۔

میں چپ چاپ اسے سنے گیا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا میں نے واقعی بہت حماقت کا ثبوت دیا تھا لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ شدید پشیمانی میں مبتلا ہو کر میں گھر پہنچا تھا۔ بابا جان کے گیسٹ آئے ہوئے تھے اس لیے ان سے سامنا نہ ہوا۔

اگلی صبح بھی میں دیر تک اپنے بیڈ روم میں رہا جب ان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی میں تب کمرے سے باہر نکلا۔ لاؤنج میں ماما جیسے میرے انتظار میں ہی بیٹھی تھیں۔

"دو چینلز نے خبروں میں انٹرٹینمنٹ والے سیگمنٹ میں تمہیں اس لڑکی کو تکتے ہوئے دکھایا ہے۔ ساتھ گانا بھی چلایا ہے۔ ایک چینل نے انڈین گانا چلایا تو دوسرے نے پاکستانی ــــ تم کون سا سننا چاہو گے؟" ماما انتہائی سرد اور سپاٹ لہجے میں مجھ سے مخاطب تھیں۔

کیا میں نے اسے واقعی اتنے والہانہ انداز میں تکا تھا کہ یہ حرکت پبلک نوٹس میں آگئی۔ جس محبت کا اقرار میں شہزاد تو کیا خود اپنے سامنے بھی نہ کر پایا تھا' وہ دنیا جہان میں نشر ہو گئی۔ میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں نے پروگرام میں شرکت کا وعدہ کیا تھا۔

"تمہارے سرکل میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت' ماڈرن اور پڑھی لکھی لڑکی موجود ہے۔ کبھی تم نے کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور کل جب اس لڑکی کو دیکھنے لگے تو پلک تک نہیں جھپکی۔ کیا پہلی بار تمہارے ساتھ کوئی لڑکی بیٹھی تھی جو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہے تھے؟ ذرا سوشل میڈیا پر لوگوں کے کمنٹس پڑھو۔ کیا کیا بکواس نہیں کی ہوئی لوگوں نے تمہارے بابا جان ہمیشہ تمہاری غیر سنجیدگی پر خفا ہوتے تھے مگر میں انہیں سمجھاتی تھی۔ تمہاری حمایت میں بولنے پر ان کی ناراضی مول لیتی تھی لیکن آج کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تمہارے متعلق جو بھی فیصلہ کریں گے' وہ مجھے قبول ہوگا۔" ماما کا سرد لہجہ قطعیت سے بھرپور تھا لیکن یہ ان کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا کہ بابا میرے لیے کیا فیصلہ کر چکے ہیں نہ صرف فیصلہ بلکہ اس پر عمل در آمد۔

☼ ☼ ☼
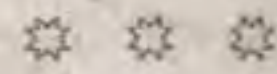
دو دن تک تو میرا ان سے آمنا سامنا نہ ہو سکا اور میں اس بات پر شکر مناتا رہا لیکن تیسرے دن بلکہ تیسری رات نسرین مجھے بلانے آگئی۔

"بڑے صاحب ڈنر کر رہے ہیں اور آپ کو بھی ڈائننگ روم میں بلوایا ہے۔" میں جل تو جلال تو کا ورد کرتا ڈائننگ روم میں پہنچا۔

"کھانا کھا چکے ہو؟" میرے سلام کرنے پر انہوں نے سوال داغا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر یہ مٹھائی کھاؤ۔" انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر موجود بڑے سے مٹھائی کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسی مٹھائی ہے یہ؟" بابا کے عین سامنے بیٹھی ماما نے تعجب سے وہی سوال پوچھا جو میرے دل میں تھا۔

"تمہارے بیٹے کی بات پکی کر آیا ہوں۔ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ تمہیں یاد ہے جب میں اس کی عمر کا تھا تو میری گود میں یہ آچکا تھا۔" انہوں نے ماما کو مخاطب کیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے بس انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔ میرا حال بھی ماما سے مختلف نہ تھا بلکہ حیرت کے مارے میرا تو منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"آخر کس سے کر آئے ہیں آپ میرے بیٹے کی بات پکی۔ مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا بڑا قدم آپ کیسے اٹھا سکتے ہیں؟"

"بہت آرام سے۔" بابا جان نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں جواب دیا تھا۔

"آفاق نے مجھے بتایا کہ تم اسے پسند کرتے ہو ورنہ میں تو تمہاری طرف سے اس سے اور اس کے گھر والوں سے صرف معذرت کرنے جا رہا تھا۔ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں معیز! وہ بچی تمہاری وجہ سے لوگوں کے الٹے سیدھے تبصروں کی زد میں تھی۔ معذرت کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم واقعی اس کے لیے سنجیدہ ہو۔ تب میں نے معذرت کے بعد تمہارا پروپوزل بھی پیش کر دیا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس کے والدین نے رشتہ قبول کر لیا ہے۔ بچی البتہ کافی ناراض لگ رہی تھی۔ اسے منانا تمہارا کام ہے۔" بابا جان نے اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں بات مکمل کی تھی۔

میں حیران پریشان بس انہیں دیکھے گیا۔ مجھے یقین ہی نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ چکے ہیں۔ ماما کو البتہ فوراً" یقین آگیا تھا اور اب وہ ان سے جھگڑے جا رہی تھیں۔ ظاہر ہے میرے حوالے سے ان کے دل میں بہت سے ارمان دبے تھے۔ بابا جس طرح "کمانڈو ایکشن" کی طرز پر میرا رشتہ طے کر آئے تھے' ان کا خفا ہونا فطری تھا۔

بابا کھانا چھوڑ کر مسکراہٹ دبائے انہیں تکے جا رہے تھے۔ اس گھر میں بابا کی حیثیت حاکم اعلا کی تھی۔ غصہ کرنا' لڑنا جھگڑنا ان ہی کا وطیرہ تھا میں اور ماما تو انہیں ریلیکس رکھنے کی کوششوں میں ہی لگے رہتے لیکن جب کبھی ماما کو غصہ آجاتا تو پھر وہ بے تکان بولتی تھیں اور ایسے میں بابا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی اور وہ بہت فرصت سے ماما کو تکنے لگتے۔ ان کی خاموشی اور ان کی مسکراہٹ ماما کے طیش میں اور اضافہ کر دیتی۔ بابا ہنستے رہتے اور میں پریشان ہو جاتا۔

"ارے یار! لڑتی جھگڑتی بیوی کو منانا کچھ مشکل کام نہیں۔" میری پریشان شکل دیکھ کر بابا دوستانہ انداز میں مجھے تسلی دیتے۔

"آپ کیسے منائیں گے ماما کو؟" میں ہونق بن کر پوچھتا۔

"بیٹے کے سامنے منالوں؟" وہ ماما کی طرف جھکتے ہوئے پوچھتے۔ ماما کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہو جاتا۔ مجھے آج تک اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ حیا کی سرخی ہوتی تھی یا غصے کی۔

"تم جاؤ یار! میں منالوں گا تمہاری ماں کو۔" بابا تسلی دے کر مجھے وہاں سے بھیج دیتے۔ یہ سین میں اپنے بچپن سے دیکھتا آرہا تھا۔ ہر دو' تین مہینے کے بعد یہ بنا کسی رد و بدل کے اسی طرح دہرایا جاتا لیکن آج بابا جان نے اپنے پہلے ڈائیلاگ میں تبدیلی کر دی تھی۔

"لڑتی جھگڑتی بیوی کو منانا کچھ مشکل کام نہیں

صاحبزادے! تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ تم بھی طریقہ سیکھ لو۔ چلو بیٹھو۔" انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"عباس!" ماما بوکھلا کر چیخ اٹھیں۔

"میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔"

میں نے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔ کمرے میں آکر مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ بابا جان نے جو شاکنگ نیوز مجھے سنائی تھی میرے دل و دماغ بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

"بابا جان کہیں مجھے سبق سکھانے کے لیے مذاق تو نہیں کر رہے یا واقعی انہوں نے شہزاد سے میری بات طے کردی ہے؟" میں عجیب الجھن میں مبتلا تھا۔ اتنے میں آفاق کی کال آگئی۔

"مبارک ہو جناب! دل کی مراد پا گئے آخر۔"

"کیا واقعی یہ سچ ہے آفاق؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"یار معیز! مجھے لگتا ہے تجھ میں ضرور کوئی ٹیکنیکل فالٹ ہے۔ عام انسانوں والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ بات تیری پکی ہوئی ہے اور تیرے بندے سے تصدیق چاہ رہا ہے۔" اس نے مجھے لتاڑا۔

میرے چہرے پر تین' چار دن بعد مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ خوشی سے بھرپور' ایک خوشگوار مسکراہٹ۔

"ویسے معیز! ایک بات ہے تیرے بابا کی میں ہمیشہ سے بہت عزت تو کرتا تھا مگر دل پر جبر کرکے لیکن آج جو انہوں نے قدم اٹھایا ہے۔ میرے دل میں واقعی ان کی عزت بڑھ گئی ہے۔ مجھے ایک سبق بھی ملا ہے ہم کسی انسان کے بارے میں کبھی کوئی حتمی رائے یا اندازہ قائم نہیں کرسکتے' ہر انسان کے اچھے برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" میں بشاشت سے مسکرایا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہورہی تھی۔ آفاق سے بھی میری خوشی چھپی نہ رہ پائی۔

"اتنا خوش ہونے کی بھی ضرورت نہیں بیٹا! تو دنیا کا پہلا دولہا ہوسکتا ہے جس کا سہاگ رات میں بیوی کے ہاتھوں قتل متوقع ہے۔ قتل نہ کرسکی تو تیرا سر تو ضرور پھاڑے گی شہزاد..... اور سر بھی نہ پھاڑ سکی تو تجھ پر چیخے چلائے گی تو ضرور۔" آفاق مجھے ڈرا رہا تھا۔

"لڑتی جھگڑتی بیوی کو منانا کچھ اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ میں منالوں گا اسے۔" میرا لہجہ یقین سے بھرپور تھا اور آفاق کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔

وقت نے ثابت کردیا کہ میرا یقین غلط نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ عرصے بعد میری اور شہزاد کی شادی ہوگئی۔ ماما نے اپنی ناراضی اور خفگی بھول بھال کر بہت جوش و خروش سے میری شادی کی تیاریاں کی تھیں۔ ہماری شادی کو میڈیا نے بھی بہت کوریج دی۔ سوشل میڈیا پر بھی لوگوں کی اکثریت نے ہمارے کپل کو خوب صورت کپل قرار دے کر ہمارے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ دلہن بنی شہزاد کو میں جن والہانہ نگاہوں سے تک رہا تھا' اس پر بھی بہت دلچسپ اور محظوظ کردینے والے کمنٹس آئے تھے۔ ولیمہ کی تقریب سے پہلے تو شہزاد نے مجھے خبردار کردیا۔

"آپ کا گھورنا ضرب المثل بن چکا ہے معیز! اگر آج آپ نے مجھے زیادہ گھورا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اپنا انجام یاد رکھیے گا۔"

"آپ کو گھورنے کے تمام حقوق میں اپنے نام منتقل کرواچکا ہوں مسز! اب آپ سمیت کوئی مجھے روک ٹوک نہیں سکتا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"پہلے کون روک سکا تھا آپ کو؟" اس کے ہونٹوں پر خفگی بھری شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے معیز! میں نے اس پروگرام کی ریکارڈنگ کوئی بیس دفعہ دیکھی ہوگی۔ اٹھارہ دفعہ غصے سے' انیسویں دفعہ حیرت سے اور....." وہ رکی۔

"اور بیسویں مرتبہ؟" میں نے بے تابی سے اس کا جملہ مکمل کروانا چاہا۔

"بیسویں بار مجھے آپ کے پیار پر یقین بھی آگیا تھا اور آپ سے پیار بھی ہوگیا تھا۔" اس نے سادگی اور معصومیت سے اقرار کیا۔

"یعنی لو ایٹ ٹوئنٹیتھ سائٹ؟" میں مسکرایا۔ وہ بھی ہنس پڑی۔

اصولاً" اس کہانی کے اتنے خوب صورت اور رومانٹک موڑ پر اس کا اختتام ہوجانا چاہیے تھا۔ ہو بھی جاتا اگر ان دنوں بابا جان کی مزید ایک مالی بے ضابطگی منظر عام پر نہ آتی۔ شہزاد جو گھر میں بابا جان کی چہیتی اور لاڈلی بہو تھی' اپنے پروگرام (جو اس نے شادی کے بعد بھی جاری رکھا ہوا تھا) میں اس نے دوسرے سیاست دانوں کے بڑے بڑے مالی اسکینڈلز کے ساتھ بابا جان کے چھوٹے سے مالی اسکینڈل کے حوالے سے ان کی اہلیت پر سوالیہ نشان اٹھائے تھے۔

اگر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بابا جان نے اپنی اینکر بہو کی یہ گستاخی معاف کردی ہوگی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ انہوں نے بہو کو براہ راست تو کچھ نہ کہا مگر مجھے بلا کر میری کلاس لی۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے معیز! ہماری کتنی جگ ہنسائی ہورہی ہے۔ اگر میرے اپنے گھر سے میری جانب انگلیاں اٹھائی جائیں گی تو سوچو کیا کریڈیبلٹی رہ جائے گی میری؟ اپنی بیوی کو سمجھاؤ کہ ہوش کے ناخن لے وہ۔"

"اور اگر نہ لے تو.....؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے نہ سمجھی تو....." ان کے گھورنے پر میں نے فوراً "سوال واضح کیا۔

"تو اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور بیوی سمیت اس گھر سے نکل جاؤ۔" بابا جان نے اپنے ازلی بے نیاز لہجے میں مجھے مطلب کرتے ہوئے سگار سلگالیا۔

بابا جان کو توقع ہوگی کہ میں شہزاد کو سمجھالوں گا لیکن مجھے ہرگز ایسی کوئی خوش گمانی نہ تھی۔ اس نے مجھے پہلے ہی باور کرا رکھا تھا کہ وہ فرمانبردار اور اطاعت گزار قسم کی بیوی اور بہو تو ثابت ہوگی لیکن ہم میں سے کسی نے اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے آڑے آنے کی کوشش کی تو وہ اس چیز پر ہرگز کوئی کمپرومائز نہ کرے گی۔

تین دن کے اندر ہم دونوں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ ماما نے ہمیں روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔ بابا البتہ اپنی بے نیازی پر قائم تھے۔ جیسے انہیں ہمارے گھر چھوڑنے سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ میں خود ذہنی طور پر ڈسٹرب تھا۔ گھر چھوڑنے کا دکھ اپنی جگہ مگر معاشی مسئلے پریشانی کا اصل سبب تھے۔ آج کل بابا جان سیاست کو فل ٹائم دے رہے تھے تو میں نے کاروباری ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں لیکن ظاہر ہے گھر چھوڑنے کے ساتھ میں از خود کاروباری معاملات سے بھی الگ ہوگیا۔ اپنے بینک اکاؤنٹس کا پیسہ استعمال کرنے کی اجازت میری انا نہیں دیتی تھی۔ انا دے بھی دیتی تو بیوی سے اجازت ملنا محال تھا۔

"آپ فنانشل پرابلمز کی وجہ سے کیوں پریشان ہورہے ہیں۔ مجھے چینل سے ٹھیک ٹھاک پیسے مل رہے ہیں۔ اتنا پیسہ ہے میرے اکاؤنٹ میں کہ ہم گاڑی بھی لے لیں گے اور گھر بھی فرنشڈ کروالیں گے۔" شہزاد مجھے تسلی دے رہی تھی لیکن میری انا یہ بھی کب گوارا کرتی تھی کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں اور بیوی کے پیسے پر عیش کروں۔ ایسے میں آفاق میرے پاس ایک حیران کن تجویز لے کر آیا تھا۔

"ہمارا چینل مارننگ ٹرانسمشن میں ایک گھنٹے کا خصوصی لائیو شو شروع کرنے جارہا ہے کچھ پولیٹیکل مگر زیادہ سوشل ایشوز ڈسکس ہوں گے۔ اگر تم اور شہزاد ہوسٹنگ پر راضی ہوجاؤ تو دیکھنا شو کیسے سپرہٹ ثابت ہوگا۔"

"تیرا دماغ تو صحیح ہے آفاق!" شہزاد کی حد تک تو صحیح ہے مگر مجھے کب میزبانی کا تجربہ ہے؟ میں کیمرے کے سامنے دو جملے نہیں بول سکتا۔ وہ بھی ایک لائیو پروگرام میں امپاسبل یار۔"

"او بھائی میرے! تمہارے بولنے کا زیادہ کام نہیں

ہو گا۔ بول تمہاری بیوی لے گی۔ تم بس اسے اپنی مشہور زمانہ "میٹھی میٹھی نگاہوں" سے تکتے ہوئے مسکراتے رہنا۔ ہمیں بس ایک اسمارٹ کپل درکار ہے۔ تم دونوں کا کپل تو ویسے بھی لوگوں کو بہت پسند ہے۔ امید ہے شو بہت کامیاب ثابت ہو گا اور پیکج بھی بہت اچھا ملے گا۔"

"ٹھیک ہے یار! میں سوچ کر بتاؤں گا۔" میں نے نیم دلی سے جواب دیا۔

اور پھر شہرزاد سے مشورے کے بعد میں نے آفاق کو ہاں کہہ دی تھی۔ اب ہم دونوں میاں بیوی کامیابی سے اپنا شو بھی چلا رہے ہیں اور اپنا گھر بھی۔ آہستہ آہستہ مجھے کیمرے کا سامنا کرنا بھی آ گیا اور بولنا بھی۔ ہاں! اپنے پہلو میں بیٹھی اپنی حسین ترین بیوی کو والہانہ نگاہوں سے تکنا تو میرا حق ہے جس پر کوئی بھی قدغن نہیں لگا سکتا۔

اس کہانی کے اختتام کے لیے یہ موقع بھی مناسب تھا اور میں اس کا اختتام یہیں پر کر بھی دیتا اگر کل گائنا کولوجسٹ ہمیں شہرزاد کی مثبت پریگننسی رپورٹ کی خوش خبری نہ سنا دیتی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ خوش تو شہرزاد بھی تھی مگر مجھے وہ کسی سوچ میں گم لگی۔ میں نے کوئی استفسار نہیں کیا۔ جانتا تھا جو کچھ اس کے دل میں ہے مجھ سے شیئر کر کے رہے گی اور وہی ہوا۔

رات سونے سے پہلے اس نے اپنے دل کی بات سے آگاہ کر دیا۔

"اس خوش خبری پر ماما جان اور بابا جان کا بھی حق ہے۔ ان کی ناراضی ہم سے ہے نا، ہمارے بچے سے تو نہیں؟ آپ کل مٹھائی لے کر ان کے پاس جائیں۔ ہو سکتا ہے اس خوش خبری سے تعلقات پر جمی برف پگھل جائے۔"

"برف پگھلا کر کیا کرو گی؟ بابا جان خیر سے اس حکومت کا بھی حصہ ہیں پھر کوئی معاملہ کوئی بے ضابطگی سامنے آئی تو تم تو لحاظ کرنے والوں میں سے ہو نہیں۔ پگھلی پگھلائی برف پھر سے جما دو گی۔" میں نے نرمی سے اسے حقیقت بتائی۔ اس نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

لیکن اب خود میرے دل میں کسک پیدا ہو گئی تھی۔ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اپنے ماں باپ سے شیئر کیے بنا نہ رہ پایا۔

اگلی شام میں مٹھائی کا ڈبا لے کر گھر پہنچ گیا تھا۔ ماما اور بابا جان دونوں ہی گھر پر تھے۔ ماما تو مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ کر ملیں۔ بابا جان نے سرد مہری سے سلام کا جواب دیا تھا۔

"کس نام کی مٹھائی ہے یہ؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بابا جان کی طرف سے ہی سوال آیا۔

"نام تو ابھی رکھا نہیں۔ بلکہ سوچا تک نہیں۔ ہونے کے بعد رکھیں گے۔ بلکہ آپ لوگوں کی پسند سے ہی رکھیں گے۔" میں نے کچھ شرما کر، کچھ مسکرا کر جواب دیا۔

ماما اور بابا جان کچھ لمحوں تک تو میری بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے، جب بات سمجھ میں آئی تو بابا جان چیخ اٹھے۔

"گدھے، نالائق! اتنی بڑی خوش خبری صرف ایک مٹھائی کا ڈبا لے کر سنانے چلے آئے۔"

"پھر کتنے لانے چاہیے تھے؟" میں حیرانی سے پوچھا۔

"بیوی کہاں ہے تمہاری۔ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟" بابا جان نے سوال پوچھ کر پہلے سے زیادہ حیران کیا۔

"وہ گھر پر ہی ہے۔" میں نے آہستہ سے بتایا۔

"وہ دو کمروں کا فلیٹ۔ اسے تم گھر کہتے ہو؟" ماما نے نخوت سے مجھے مخاطب کیا۔

"جی ماما! وہ ہمارا گھر ہے۔ اس کی ایک ایک چیز ہماری محنت کی کمائی کا نتیجہ ہے۔ آسائشات زندگی کے لیے ہمیں اپنا ضمیر گروی نہیں رکھنا پڑا۔ یقین کریں! جو سکون مجھے وہاں حاصل ہے اس وسیع و عریض محل میں کبھی نہ تھا۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"یہ سب کتابی باتیں ہیں صاحبزادے! اچھی زندگی

کا حصول ہر انسان کی خواہش ہے۔ جب صاحب اولاد ہو گے تب پتا چلے گا۔ اولاد کے قدموں میں ہر آسائش ڈھیر کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اولاد کو اچھی زندگی فراہم کرنے کی خواہش دیگر تمام خواہشوں پر حاوی آ جاتی ہے۔ اسے اچھا گھر ملے، اچھا رہن سہن ملے، کسی چیز۔۔۔" بابا جان طنزیہ انداز میں بولے جا رہے تھے۔

"لیکن کون باپ ایسا ہو گا بابا جان! جو اس گھر کی بنیادوں میں سے اینٹیں نکالنے لگ جائے جس میں اس کی اولاد، اس کی اولاد کی اولاد اور آگے کئی نسلوں نے رہنا ہو؟ باہر کہیں کرائے کا گھر تو مل سکتا ہے لیکن اپنا آبائی گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے نا۔۔۔ اس سے محبت بالکل جائز اور فطری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اسے مزید ہر آسائش، مزید خوب صورت بنانے کے بارے میں تو سوچا جا سکتا ہے لیکن ہماری کوئی اخلاقی کمزوری دیمک کی طرح اس گھر کی دیواروں کو کھوکھلی کرنے لگے تو پھر وہ ہماری نسلوں کے رہنے کے قابل تو نہیں رہے گا نا۔ ہماری غفلت کی وجہ سے گھر اگر کھنڈر بن گیا تو ہماری آئندہ نسلوں کو دوبارہ اسے گھر کی شکل دینا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ کوئی ظالم شخص ہی اپنے بچوں کے ناتواں کندھوں پر اتنا بوجھ ڈالنا چاہے گا۔ ہمیں تو ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنی چاہئیں نہ کہ ان کی راہیں مزید مشکل بنا دیں۔" جانے کیوں میں اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ بابا جان کی بات کاٹ کر بولے ہی گیا۔

"تمہاری بیوی نے تمہیں تقریر کرنا اچھی طرح سکھا دیا ہے۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بابا جان پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

"ہاں! اس کی محبت میں رہ کر میں تقریر کرنا بھی سیکھ گیا ہوں اور اپنی مٹی سے محبت کرنا بھی۔" میں بھی تھکے تھکے انداز میں مسکرایا تھا۔

"چلتا ہوں، شہرزاد اکیلی ہو گی۔ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" میں اٹھ گیا اور اٹھتے ہوئے سامنے دیوار پر لگی دادا جان کی تصویر نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ میں رک گیا تھا۔

"میں نے اپنے بچپن کے کچھ سال دادا جان کے ساتھ گزارے ہیں بابا جان! لیکن میرے ذہن پر ان کے ان مٹ نقوش ہیں۔ وہ اسکول ٹیچر تھے نا۔ چھوٹی عمر میں مجھے بڑی بڑی باتیں سکھاتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ شاید میں ان میں سے کچھ باتیں بھول گیا تھا۔ لیکن آپ کی بہو بھی کسی استانی سے کم نہیں۔ سارے بھولے سبق پھر سے یاد کروا دیے۔" میں نے مسکرا کر انہیں مخاطب کیا۔ ماما اور بابا اب بالکل خاموش تھے۔

"ویسے ایک بات بتاؤں بابا! محبت میں آپ سے بھی بے تحاشا و بے حساب کرتا ہوں۔ لیکن دادا جان سے مجھے نہ صرف محبت ہے۔ بلکہ ان پر فخر بھی ہے، لیکن وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ اب آپ بھی ماشاء اللہ دادا بننے والے ہیں۔" میں پھر بلاوجہ مسکرایا۔ اس کے بعد ماما کے سامنے سر جھکا دیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرا بھر کر میری پیشانی چوم لی۔

"بعض پتھر ایک ضرب میں نہیں ٹوٹتے۔ چکر لگاتے رہنا۔" انہوں نے کنکھیوں سے بابا جان کو دیکھتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نہ سہی، میرا بچہ ہی اس پتھر کو توڑنے کا سبب بن جائے۔ ایسا ہو جاتا ہے تو یہ اس کہانی کا خوش گوار اختتام ہو گا۔ ورنہ یہ کہانی یوں ہی جاری و ساری رہے گی، لیکن مجھے قوی امید ہے کہ اب اس کہانی کا خوش گوار اختتام بس ہوا ہی چاہتا ہے، کیونکہ مایوسی کفر ہے اور امید پر دنیا قائم ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

سارہ لودھی

"لو دس بجنے کو آ گئے اور سکینہ کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ لگتا ہے آج پھر چھٹی پہ ہے۔ ایک تو اس نے بہت تنگ کیا ہے۔ جس دن کام زیادہ ہو' یہ اسی دن غائب ہو جاتی ہے۔ اب کیا اس گندے گھر میں بٹھائیں گے مہمانوں کو؟" رضیہ بیگم نے صحن میں رکھے پلنگ پہ بیٹھے بیٹھے اپنے خدشے کا اظہار کیا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کسی متبادل حل کی تلاش کا حکم بھی صادر کیا جسے ان کی بہو نے بغیر کسی دقت کے سمجھ لیا۔

"یہ کون سی نئی بات ہے امی! سکینہ کا تو معمول ہے یہ۔ آپ فکر نہ کریں میں کرلوں گی سب۔" ماہم نے ناشتے کے برتن اٹھاتے ہوئے ان کو تسلی دی۔

"تم بھی کیا کیا کرو گی بیٹا! مگر میں بھی کیا کروں اب میں تو خود مجبور ہوں۔ یہ جوڑوں کا درد کچھ کرنے دیتا تو خود آدھا کام نمٹا دیتی تمہارے ساتھ۔ کبھی سارا سارا دن کام کرتے ہوئے بھی نہیں تھکے تھے ہم اور اب کچھ کیا ہی نہیں جاتا۔"

اب یہ داستان ان کی جوانی کی پھرتیوں سے بڑھاپے کی مجبوریوں تک کس کس پیچ و خم سے ہوتی ہوئی جائے گی۔ ماہم کو ازبر تھا۔ وہ سرہلاتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔

رضیہ بیگم کے بھائی اور بھاوج حج سے لوٹے تھے۔ اسی سلسلے میں آج ان کی دعوت کا انتظام کیا جانا تھا۔ اس گھر کی بڑی اور اکلوتی بہو ہونے کے ناتے ساری ذمہ داری ماہم ہی کے سر تھی۔ حمزہ کو تیار کر کے وہ اسکول بھیج چکی تھی۔ ابو اور احمر دفتر جاچکے تھے اور یاسر کالج روانہ ہوچکا تھا۔ ناشتے کے برتنوں سے فارغ ہو کر وہ صفائی میں مصروف ہو گئی۔ جھاڑو پوچے سے لے کر ڈسٹنگ تک سکینہ کے نہ آنے کی وجہ سے سب کچھ آج اسے ہی کرنا پڑا۔ یہ کام نمٹا کر وہ دوپہر کا کھانا تیار کرنے کچن کی طرف بھاگی۔

"ماہم! سویٹ ڈش میں کیا بنائیں گے؟" وہ آٹا گوندھنے کے لیے نکال رہی تھی' جب کچن کے دروازے پہ رضیہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"امی! وہ تو میں رات کو ہی کسٹرڈ بنا کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ آج کام زیادہ ہو جاتا' اس لیے میں نے جو ہو سکتا تھا' وہ رات کو ہی کرلیا۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا! رات کو ہی بنالیا۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ بیٹا پوچھ ہی لیتیں۔ عارف فرنی شوق سے کھاتا ہے۔ چلو! خیر جو بن گیا۔ اب وہی ٹھیک ہے۔ تم دوبارہ تو بنانے سے رہیں۔" وہ کہتی ہوئی پلٹ گئیں اور ماہم پھر سے مصروف ہو گئی۔ حمزہ اور یاسر گھر آ گئے تو اس نے کھانا لگا دیا۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر ایک بار پھر کچن میں انہیں دھونے لگی۔

"ماما! میری اردو کی نوٹ بک نہیں مل رہی۔" حمزہ نے کچن میں آ کر اعلان کیا۔ وہ برتن وہیں چھوڑ کر اس کی نوٹ بک ڈھونڈنے چلی گئی۔

"بیٹا! یہ الماری میں بالکل سامنے تو پڑی ہے۔" اس نے نوٹ بک نکال کر تھمائی اور واپس کچن کی راہ لی۔

"بھابھی!" یاسر کی پکار نے اسے راستے میں ہی روک لیا۔

"بھابھی! پلیز میری بلیو والی شرٹ تو نکال دیں۔ پتا نہیں کہاں گم گئی کپڑوں میں۔۔۔ مل ہی نہیں رہی۔"

"آج کوئی اور پہن لو نا یاسر! اتنا کچھ کرنے والا ہے ابھی۔ وہ میں کل نکال کر رکھ دوں گی۔"

"نہیں بھابھی! میری پیاری بھابھی! میری سویٹ بھابھی! پلیز۔۔۔ آج ہم سب فرینڈز اکیڈمی میں بلیو شرٹس پہن رہے ہیں۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں بھابھی کو راضی کیا۔

اس کی شرٹ ڈھونڈ کر اسے تھمانے کے بعد آ کر کچن میں چائے بنائی اور امی کا کپ لے کر ان کے پلنگ کے پاس چلی گئی۔ ابھی پہلی چسکی لی ہی تھی کہ محلے کی ایک خاتون گھر میں داخل ہوئیں۔ اپنا کپ اٹھا کر وہ کچن میں واپس آ گئی اور پھر سے چائے بنانے لگی۔

ٹرے میں بسکٹ سجا کر جب تک انہیں چائے پیش کر کے لوٹی اس کی اپنی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اسے حلق میں انڈیل کر وہ رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

کبابوں کا مسالا تیار کر کے کباب بنائے اور فرج میں رکھ دیے۔ قورمے کا مسالا تیار کر رہی تھی، جب احمر اور ابو گھر آ گئے۔ پانی کا گلاس لے کر وہ پھر کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے کپڑے نکال کر بیڈ پہ رکھے اور خالی گلاس لے کر واپس مڑی۔

"یار بیگم ایک کام کرو گی؟" احمر کی آواز پہ وہ پلٹی۔

"جی! پتا ہے کیا کام ہے۔ ابھی لاتی ہوں آپ کی چائے۔"

"بیگم ہو تو ایسی۔ کہنے سے پہلے ہی جان لے۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"روز کی تو بات ہے۔ ابھی بھی نہیں جانا تو کب جانوں گی۔" وہ جواباً" مسکرائی۔

"بس آج بہت تھک گیا دفتر میں۔ اب تھوڑا آرام کر لوں تاکہ مہمانوں کے آنے تک فریش ہو جاؤں۔" وہ کمرے سے نکل آئی۔

ابو کی چائے ان کے کمرے تک اور احمر کا کپ اس تک پہنچانے کے بعد وہ پھر سے کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران وقفے وقفے سے حمزہ اپنی کسی نہ کسی ضرورت کے تحت اسے بلاتا رہا۔ قورمے کا گوشت چڑھا کر بریانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ماہم بیٹا! میرا وہ ملتانی کڑھائی والا سوٹ اس بار دھلائی والے کپڑوں میں تھا۔ وہ بھلا کہاں رکھا دھو کر؟" رضیہ بیگم نے پکارا۔

"امی وہ! میں نے استری کر کے آپ کے کمرے کی الماری میں ہی رکھ دیا تھا۔" اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

"آ کر نکال دو ذرا۔ مجھ سے تو اٹھا ہی نہیں جاتا۔ تمہیں پتا ہے بس پلنگ پہ بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ جاتی ہے، کبھی ہم بھی سارا سارا دن لگے رہتے تھے کاموں میں۔" انہوں نے پھر سے اپنا "جوانی نامہ" شروع کیا۔

ماہم نے جا کر سوٹ تھمایا اور واپس آ کر ادھورے کام سمیٹنے لگی۔ ساتھ ساتھ رائتہ بنا کر باؤل میں ڈالا اور سالاد بنانے لگی۔ مولی، کھیرا، گاجر، بند گوبھی اور ٹماٹر کاٹ کر اس نے ڈش میں الگ الگ قطاروں کی شکل میں سجا دیا اور ایک بار پھر ڈش کو دیکھا۔ مختلف رنگ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ خاص امتزاج نہیں بنا رہے تھے۔ غیر مطمئن سی ہو کر اس نے ترتیب بدلنا شروع کر دی۔ وہ سب کچھ پرفیکٹ بنانا چاہ رہی تھی۔

کام تقریباً" ہو چکا تھا۔ اس نے عجلت میں جا کر اپنا لباس بھی بدلا اور ہلکا سا میک اپ کر کے آ گئی۔ اسی دوران اطلاعی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس نے بے اختیار گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ابھی تو صرف سات بجے تھے۔ مہمان اتنی جلدی آ گئے؟ یہی سوچتے ہوئے وہ کچن سے باہر آئی تو سامنے ناجیہ اور عادل کھڑے تھے۔ کچھ حیرت زدہ سی ہو کر اس نے اپنی نند اور نندوئی کو سلام کیا، جن کے آنے کے بارے میں اسے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ انہیں کولڈ ڈرنکس پیش کر کے واپس کچن میں آئی۔ گوشت بھون کر اس کی آنچ ہلکی کی اور دوسری طرف چاولوں کو دم لگا دیا۔ ساتھ ساتھ خالی برتن ڈائننگ ٹیبل پر پہنچائے۔

دوسری بار اطلاعی گھنٹی کی آواز کے بعد مہمانوں کی آمد ہو گئی۔ انہیں مشروب پیش کرنے کے بعد اس نے ایک طرف کباب تلنے کے لیے فرائنگ پین رکھا اور دوسرے طرف کڑاہی میں تیل ڈال کر فریج سے چکن پیسز لینے چلی گئی، جنہیں وہ کل سے مسالا لگا کر رکھ چکی تھی۔

"بھابھی! مجھے بتائیں، جو کام رہ گیا، وہ میں کر دیتی ہوں۔" ناجیہ نے کچن میں آ کر پوچھا۔

"نہیں! کام تو سب ہو گیا۔ بس یہی دو چیزیں رہ گئیں فرائی کرنے کے لیے وہ میں کر لوں گی۔ تم جا کر مہمانوں کے پاس بیٹھو۔" اس نے مسکرا جواب دیا۔

"جی! ٹھیک۔" اس نے کہا اور مڑتے مڑتے واپس پلٹ آئی۔ "بھابھی! اتنی تیز آنچ پر چکن فرائی کریں گی؟ اندر سے تو کچی رہ جائے گی۔" اب اس کا اشارہ کڑاہی کی طرف تھا۔

"ارے نہیں! کھانا سرو کرنا ہے نا جلدی سے۔ ابھی آئل گرم ہو جائے گا تو کم کر دوں گی۔ تم فکر نہیں کرو۔" ماہم نے مسکراتے ہوئے اپنی نند سے کہا، جو اس سے پانچ سال چھوٹی تھی اور کافی حد تک اسی کی نگرانی میں کوکنگ سیکھ چکی تھی۔

دونوں چیزیں تل کر اس نے ابو کے لیے دو روٹیاں بنائیں، جو ڈاکٹر کے کہنے پر نان اور چاول سے پرہیز کرتے تھے اور ساتھ ہی یاسر کو نان لانے کے لیے بھیجا۔ تمام ڈشز اندر میز پر پہنچائیں اور میز کا جائزہ لینے لگی۔ قورمہ، بریانی، روٹی، نان اور کباب، چکن فرائیڈ، رائتہ، سلاد، سویٹ ڈش، پانی، کولڈ ڈرنک، کیچپ، خالی برتن، سب ہی کچھ موجود تھا۔ مطمئن سی ہو کر اس نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ سب آ کر بیٹھ گئے تو وہ خالی ہو جانے والے برتن پھر سے بھر کر لاتی رہی۔ اب تک وہ تھکن سے چور ہو چکی تھی۔ یاسر کو کچن کے دروازے پر دیکھ کر اس نے آواز دی۔

"یاسر! ایک کام کرو گے؟"

"آپ حکم کریں بھابھی!"

"میرے ساتھ ٹیبل سے برتن تو اٹھوا دو۔ بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"بھابھی! خدا کا خوف کریں۔ کہاں پھنسوا رہی ہیں؟ آپ کو نہیں پتا، کتنی مشکل سے جان چھڑوا کر آیا ہوں عافیہ ماہی اس قدر بولتی ہیں۔ پوری کی پوری سی آئی ڈی ہیں۔" ماہم بے اختیار اس کی بات پر ہنسنے لگی۔

"ارے! میں آپ کو اپنی داستان غم سنا رہا ہوں اور آپ ہیں کہ ہنسے چلی جا رہی ہیں۔" اس نے چہرے پر مسکینیت طاری کی۔

"دیکھیں! ابھی مجھ سے کیا سوالات کر رہی تھیں۔ "اچھا تو بیٹا! اکیڈمی جاتے ہو؟" اب وہ ان کی نقل اتارتے ہوئے ناک سے آواز نکالنے لگا۔ "تو وہاں لڑکیاں بھی ہیں؟ اچھا! کتنی لڑکیاں ہیں؟ خوب بن سنور کر آتی ہیں؟ تم بھی تو پرفیوم چھڑک کر ہی جاتے ہو گے؟ روز دھلا ہوا سوٹ پہنتے ہو یا ایک دن چھوڑ کر بدلتے ہو؟ شیمپو کتنے دن بعد کرتے ہو؟ اف میرا تو سر چکرا گیا۔ پلیز بھابھی! میری اچھی بھابھی۔ میری سویٹ سی بھابھی! آپ کوئی بھی اور کام کہہ دیں۔ میں دل و جان سے آپ کا حکم بجا لاؤں گا۔ لیکن خدارا! مجھے وہاں جانے کو مت کہیے گا" اب وہ سینے پر ہاتھ رکھے ماہم کے آگے جھکے اسے اپنی تابعداری کا یقین دلانے لگا۔

"اچھا اچھا یہ ڈراما بند کرو۔ میں خود اٹھا لوں گی۔ میرا مزید وقت ضائع نہ کرو۔" وہ اپنی ہنسی دباتی اسے ڈانٹ کر برتن اٹھانے چلی گئی۔

کھانے کے برتن اٹھا کر میز صاف کی۔ پھل پیش کیے اور چائے بنانے لگی۔

"ماشاء اللہ! بہو نے سارا گھر سنبھالا ہوا ہے آپ کا تو۔" وہ چائے لے کر اندر گئی تو ماہی نے اسے دیکھ کر تبصرہ کیا۔ وہ وہیں بیٹھ کر چائے پیالیوں میں نکالنے لگی۔

"ہاں بھئی! جس دن سے آئی ہے میں نے تو سارا گھر اسی کو سونپ دیا ہے۔" رضیہ بیگم نے کہنا شروع کیا۔ "آج کام زیادہ تھا، اس لیے ناجیہ کو میں نے کہہ کر بلا لیا کہ بھابھی کا ہاتھ بٹا دو۔ ورنہ بہو کے معاملات میں روک ٹوک کی میں روادار نہیں۔ جیسے مرضی پکائے کھائے، رکھے ڈھانپے۔ میں نے کبھی خبر نہیں رکھی۔ اب جب سے ناجیہ کو بیاہا ہے، سیاہ و سفید کی یہی مالک ہے۔"

"ہاں! یہ تو واقعی آپ کا بڑا پن ہے۔ ورنہ کہاں ہوتا ہے ایسا۔ اپنی راجدھانی کسی کو سونپ دینا آسان تھوڑا ہی ہے۔" چائے سب کو تھما کر وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ابھی کام باقی تھا۔

برتن دھو کر فارغ ہوئی تو مہمان گھر جانے کے لیے کھڑے تھے۔ ان کو رخصت کے بعد اس نے کچن صاف کیا جو اس قدر پھیلاوے کے بعد کافی گندا ہو چکا تھا۔

بالآخر سب کام ختم ہو گیا تھا۔

اس نے ہر چیز کا ایک سرسری سا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر کچن سے نکل آئی۔ عادل، احمر اور یاسر ڈرائنگ روم میں کیرم کی بازی لگا کر بیٹھ چکے تھے۔ حمزہ وہیں پہ بیٹھا دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ جبکہ امی اور ناجیہ دوسرے کمرے میں اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔

ماہم کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے کھانا نکالا اور وہیں کچن میں ایک طرف پڑی کرسی اور میز پر بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگیں، بازو اور کمر تھک کر اکڑ چکے تھے۔ لیکن سب کچھ بخوبی انجام پا گیا تھا۔ یہی سوچ کر وہ مسرور سی ہو گئی اور کھانا کھانے لگی۔

"ماہم!" چند لقمے ہی لیے تھے، جب رضیہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"آئی امی!" اس نے وہیں سے آواز دی اور اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف چل دی۔

"پودینے کی چٹنی نہیں رکھی نا تم نے میز پر؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"اوہو امی! وہ تو میں بالکل بھول ہی گئی۔" ایک دم اسے شرمندگی کے احساس نے گھیرا۔

"ارے کیسے بھول گئیں تم؟ سامنے تو فریج میں کل سے پودینہ لا کر رکھا ہے! ہزاروں بار تم نے فریج کھول کر چیزیں نکالیں، رکھیں اور تمہیں نظر نہیں آیا؟ وہ تو مجھے اب ناجیہ نے یاد دلایا۔" وہ مجرم سی بنی سنتی رہی۔

"میری صحت ساتھ دیتی ہو تو میں کسی کو کہوں ہی کیوں؟ ہم نے بھی گھر سنبھالا تھا اپنی عمر میں۔ کبھی ایسے ادھورے کام نہیں کیے۔ اب میں کچھ کہوں تو بھی بری بنوں۔ لیکن بیٹا، غلطی تو ہے نا تمہاری! عادل کو اتنی پسند ہے۔ اب گھر کا داماد کیا سوچتا ہو گا؟ کتنا کام تھا بھلا؟ ایک پودینے کی چٹنی ہی تھی نا! زیادہ سے زیادہ بھی پندرہ منٹ میں بن جاتی۔ مگر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ اگر نہیں بنانا چاہتی تھیں تو بھی بتا دیتیں۔ میں خود بنا لیتی۔ اتنا تو سکھا ہی چکی ہوں میں اپنی بیٹی کو۔ آئی تو بھی تم سے پوچھنے۔ تم نے لوٹا دیا کہ سب کر رہی ہوں۔ کیا کہوں میں اب، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔"

"سیاہ سفید کی مالک۔" بوجھل قدموں کے ساتھ پلٹ آئی۔ "ایک پودینے کی چٹنی ہی تھی ناں!" سارا بڑا کھانا ایک دم بدمزا لگنے لگا۔ وہ ضبط کیے بیٹھی اس پر چمچ گھمانے لگی۔

"بھابھی! ایک گلاس پانی ملے گا؟" وہ وہیں بیٹھی تھی جب عادل نے دروازے سے جھانک کر پوچھا۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کر گلاس میں پانی ڈالا، بے تاثر چہرے کے ساتھ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پلٹ کر پھر بیٹھ گئی۔

"یہ بھابھی کو کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے ان کی؟" باہر سے آتی عادل کی آواز سنائی دی۔

"ہونا کیا ہے؟ پرانی عادت ہے یہ بھابھی کی۔ جس دن مہمان آ جائیں یا کوئی کام کرنا پڑ جائے۔ اسی طرح موڈ آف ہو جاتا ہے ان کا۔" ناجیہ نے تسلی بخش جواب پیش کیا۔

آنکھوں سے پانی کے دو قطرے نکل کر اس کی قمیص کے دامن میں جذب ہو گئے۔

مکمل ناول

نزہت شبانہ حیدر

ہم سادہ ہی ایسے تھے

آج پھر دادی جان کو شدت سے اپنی نواسی یعنی ماہ نور کی یاد آرہی تھی۔

"ارتضیٰ ماہ نور کو جا کرلے آؤ۔ بڑا دل چاہ رہا ہے دیکھنے کو۔"

ایک تو یہ آپ لوگوں کی محبت، جو نہ وقت دیکھتی ہے نہ موقع، ایک دم سے امنڈ کر آجاتی ہے۔ اب میں لینے کے لیے چلا بھی جاؤں۔ مگر کیا پتا اس کے امتحان ہو رہے ہوں یا پھر ٹیسٹ یا پھر یہ کہ وہ آنا ہی نہیں چاہتی ہو۔"

"بس تم اپنی طرف سے سارے اندازے لگالو۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"تم بھی کچھ کچھ اور دادی جان کی طرح جذباتی نہیں ہوتی جا رہی ہو؟" ارتضیٰ نے غور سے میری شکل دیکھی۔

"میرے پیچھے نہیں پڑو۔"

"واہ! تم کہاں کی حور پری ہو۔" ارتضیٰ نے چمک کر کہا۔

"مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کوئی ایسا دعوا کبھی کیا ہو۔" میں نے اطمینان سے کہا" یہ تو لوگ خود ہی سمجھ لیتے ہیں۔"

"ہاں لوگوں کا دماغ جو خراب ہے۔" شاید ارتضیٰ کچھ اور بھی سناتا۔ مگر اسی وقت تائی جان آگئیں۔

"ارتضیٰ! مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میری بات سن لینا۔" ان کے لہجے میں ناگواری تھی اور انداز اس سے بھی زیادہ خراب۔

"جی امی! میں بس آ ہی رہا تھا۔" ارتضیٰ فوراً ہی

کھڑا ہو گیا۔

"تائی امی کا رعب دیکھا۔" فارس نے مجھے کہنی ماری۔

"اچھی بات ہے یار! ہمیں تو لڑکیاں ہو کر بھی اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ ماں کی بات کو فوراً" سن لیں۔"

"یہ بات تم اپنے لیے کہہ رہی ہو نا؟" فارس نے مجھے ترچھی آنکھ سے دیکھا۔

"کوئی نہیں میں تو ایک عام بات کر رہی تھی۔ مگر تم لوگوں کو تو موقع ملنا چاہیے۔ "فوراً" ہی برائی کو میرے سر تھوپنے کا۔" میں نے مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے کہا۔

"ماشاءاللہ! یہ بھی تمہارا ہی حوصلہ ہے۔"

"ہاں! یہ بات تو ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "حوصلے کی مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے۔"

"میں اس حوصلے اور ہمت کی بات نہیں کر رہی، جو تعریف کے زمرے میں آتا ہے۔" فارس نے جلبلا کر کہا "میں تمہاری ڈھٹائی پر کہہ رہی ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" میں نے اسے کشن کھینچ کر مارا، جو اس کے بجائے سیدھا ارتضیٰ کو لگا۔ وہ تائی جان کی بات سن کر واپس آ رہا تھا۔

"تم اپنی تخریب کاری بند نہیں کر سکتیں؟" اس نے مجھے ڈانٹا۔

"میرا کیا قصور؟" میں نے معصوم سی صورت بنائی "تم خود ہی کشن کے سامنے آ گئے تھے۔"

"بس رہنے دو۔ ہر چیز بالکل صحیح ہوتی ہے۔ بس تمہارے ہاتھ ہی میں آ کر چیزیں بگڑ جاتی ہیں۔" ارتضیٰ نے مجھے ناراضی سے گھورا۔

"تم کیا ریت کے بنے ہوئے ہو جو تکیہ لگنے سے ڈھیر ہو گئے؟" مجھ پر اس کے گھورنے کا ذرا اثر ہوا ہو۔

"بات تکیہ لگنے کی نہیں ہے۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں، تمہاری اس قسم کی حرکتیں امی کو ذرا پسند نہیں ہیں۔"

"تائی امی کا یہاں کیا ذکر؟ انہیں تو ویسے بھی کوئی پسند نہیں آتا۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"تو تم ذرا سی کوشش نہیں کر سکتیں؟" ارتضیٰ کا لہجہ گمبھیر ہوا۔

"کس بات کی کوشش؟" میں نے سر اٹھا کر ارتضیٰ کو دیکھا۔

"تم نہیں سمجھو گی۔" ارتضیٰ نے سر جھٹکا۔

"اف! سمجھنے پر یاد آیا۔ مجھے اکنامکس سمجھنی تھی۔ میم رضیہ نے دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ کہتی ہیں کہ اب کے سمسٹر میں پورے مارکس نہیں آئے تو کلاس روم سے باہر۔۔۔ کیا ہم اب اسکول کی بچیاں ہیں۔" میری اپنی ہی فکریں تھیں۔

"مجھے تو اسکول کی بچی ہی لگتی ہو۔" ارتضیٰ نے جل کر کہا۔

ہر وقت کی جلن کڑھن۔۔۔ تم میں کسی ساس کی روح حلول کر گئی ہے کیا؟" میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"حد ہو گئی۔" ارتضیٰ نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"ارتضیٰ! ایک کام کرو گے؟"

"بولو! بلکہ پھوٹو۔ اب کون سی فرمائش کرنی ہے؟"

"رات کو واپسی میں آئس کریم لاؤ گے؟"

"آئس کریم اتنی سردی میں۔۔۔؟" اس نے اعتراض کیا۔

"سردی میں ہی تو آئس کریم کا مزا ہے۔"

"مزا اور وہ جو بیمار پڑ جاؤ گی۔" وہ تپ گیا۔

"تو تم سے نہیں کہوں گی کہ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ کام خود ہی کرنے پڑ جاتے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی اسی وقت آواز آئی۔

"حوریہ! تمہیں تائی امی بلا رہی ہیں۔" مریم نے اندر جھانکا۔

"آ رہی ہوں۔" میں نے سلیپر پاؤں میں اٹکائے۔

"ارتضیٰ!" میں نے نکلتے ہوئے پیچھے مڑ کر کہا "جو کہا ہے وہ کر لینا۔"

"ہاں! جیسے آپ کے ابا جی کا نوکر ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی اسے احساس ہو گیا کہ بڑی غلط بات منہ سے نکل گئی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

وہ جو قول ہے کہ اگر گفتگو چاندی ہے تو خاموشی سونا واقعی صحیح ہے۔

☼ ☼ ☼

شام کا ملگجا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

لیکن ابھی تک گھر میں کہیں کوئی لائٹ نہیں جلی تھی۔ جب سے بجلی کے بل نے زندگی اجیرن کی تھی۔ تب سے تائی جان نے بھی سب کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

کوئی لائٹ نہیں پنکھا نہیں۔

"پتا نہیں ان پرانے زمانے کے لوگوں کو اتنی بچت کر کے کیا مل جاتا ہے۔ فارس غصے سے بڑبڑائی "اس حویلی کی جگہ کیا محل کھڑا ہو جائے گا۔"

"بی بی! جو مہنگائی چل رہی ہے۔ یہ حویلی بھی اپنی جگہ پر قائم رہے تو بھی بڑی بات ہے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے، تائی جان کے منہ سے تو ہمیشہ مہنگائی کا ہی ذکر سنا ہے بچپن سے بڑھاپا آ گیا ایک جیسے ڈائیلاگ سنتے ہوئے۔" فارس تپ کر بولی۔

"اچھا چپ کرو۔ ابھی تائی جی نے یہ ارشادات سن لیے تو پھر وہ جو آج ڈائیلاگ بولیں گی، وہ بالکل نئے ہوں گے۔" میں نے فارس کو ڈرایا۔

"ویسے مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ جب تم تائی جان کی باتیں خاموشی سے سن لیتی ہو سب سے زیادہ ان کے خلاف تمہیں ہی ہونا چاہیے۔"

"ہاں! میری تو وہ ساس لگتی ہیں نا کہ سب سے زیادہ ان کے خلاف مجھے ہونا چاہیے۔" میں نے جل کر کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔" فارس نے لڑکوں کی طرح ہاتھ مارا۔

"دیکھو! تمہارے اندر کہیں نہ کہیں اس خواہش نے سر تو اٹھایا ہے کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔"

"جی نہیں تمہاری طرح فالتو باتیں نہیں سوچتی۔"

"ہاں تم تو بہت کام کی باتیں سوچتی ہو۔" میں اس کی بات پر اسے گھور کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور آ گئی تھی اور پھر تائی جان کے ساتھ ہی لگی رہی۔ وہ اس سے ڈھیروں کام کرا رہی تھیں۔

"اللہ تعالیٰ ہر گھرانے میں کچھ ایسے لوگ ضرور پیدا کرتے ہیں۔ جن کے اوپر رعب جمایا جا سکے یا دوسرے لفظوں میں ظلم کیا جا سکے۔" فارس نے تبصرہ کیا۔

"یہ ہمارے گھرانے میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔ معاف کرنا۔" مریم نے اس کے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔

"ہاں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے گھر میں آتے دیر نہیں لگے گی۔ جہاں تک مجھے نظر آ رہا ہے۔" فارس نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔ اب وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔

"ارتضیٰ کی شادی صرف حوریہ سے ہی ہو گی۔"

"کیوں تم نے کیا فال نکلوائی ہے؟" مریم نے فارس سے کہا۔

"نہیں۔ بس ویسے ہی میں اکثر ارتضیٰ کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔"

"ضرور ایسا ہی ہوتا۔ اگر جو تائی امی اس کی ماں نہ ہوتیں۔"

"یہ تم دونوں کیا سرگوشیاں کر رہی ہو" میں نے دونوں کو گھورا۔

"ماہ نور اکیلی لگی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر تھوڑا کام وغیرہ کروا لو تھوڑی دیر ماہ نور کو بھی آرام مل

جائے گا۔"

"اس کی تم بالکل فکر نہیں کرو۔ اسے کام کرنے کی عادت ہے۔" مریم نے مجھے تسلی دی۔

"لاؤ ماہ نور! دے دو۔ تم تھک گئی ہو گی۔" میں نے اس کے ہاتھ سے واپس لیا۔

"نہیں! نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے عادت ہے کام کرنے کی۔"

"کام کو عادت نہیں بنانا چاہیے اور کام بھی اتنا کرنا چاہیے۔ جتنا انسان برداشت کر سکے۔ تم تو پہلے ہی بہت نازک سی ہو۔" میں نے ماہ نور کے نازک سراپے کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا۔" بڑی بڑی اداس آنکھوں والی ماہ نور ایک دم خوش ہو گئی۔

"وہاں تو سارے ہی لوگ مجھے ٹوکتے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں، کہتے ہیں، دیکھو! بھبے نے کپڑے پہن لیے ہیں یہ اور اسی طرح دل دکھانے والی باتیں۔ لوگ اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں؟" اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"پتا نہیں ماہ نور!" میں نے گہری سانس لی۔

"ہماری فطرت بن گئی ہے کہ ہم لوگ ہر اس شخص کے لیے ظالم بن جاتے ہیں جس کی کوئی مضبوط بیک نہیں ہوتی۔ تم وہاں صرف کام ہی کرتی رہتی ہو۔ یا پھر پڑھائی کا بھی وقت نکالتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بہت مشکل سے۔" اس نے پلکیں جھپکائیں۔

"کیوں مشکل سے ماہ نور! یہ وقت گزر جائے گا تو پھر دوبارہ نہیں آئے گا۔ لوگوں کو انکار کرنا سیکھو۔ اگر تمہاری پڑھائی کا ٹائم ہے تو انہیں سہولت سے بتا دیا کرو۔"

"حوریہ۔ جی! باتیں بہت آسان ہوتی ہیں اور زندگی بہت مشکل۔"

"تمہاری اور میری زندگی میں کتنا فرق ہے؟ بہت معمولی سا نا۔ تو ماہ نور اپنی زندگی بدلو وقت خود بدل جائے گا۔"

"لیکن میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔"

"کیا؟" میری آنکھیں پوری کھل گئیں۔ "ایسی زندگی سے کون خوش ہو سکتا ہے۔ ماہ نور!"

"مگر میں خوش ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔ میں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔ مجھے ماہ نور کے چہرے پر کسی بھی جھوٹ کی تحریر نظر نہیں آئی۔

"اچھا پھر ذرا خوش رہنے کی وجہ بھی بتا دو تاکہ میں بھی اپنی تھوڑی اصلاح کر لوں۔"

"آپ ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی۔ آپ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"پتا نہیں! شاید میں آپ کو سمجھا نہیں پاؤں۔ بعض لوگ فطرتاً مضبوط ہوتے ہیں۔ پھر وقت و حالات انہیں مزید سخت بنا دیتے ہیں۔ وہ اندر سے کتنے ہی نرم ہوں لیکن ظاہری طور پر انہیں توڑنا مشکل ہی ہوتا ہے۔" اس کے کہے ہوئے دو سادہ جملوں میں میرا پورا تجربہ تھا اور میں بے وقوفوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

اتنی ساری باتوں کے باوجود جس وقت شام کو تائی جان ماہ نور کی کلاس لے رہی تھیں، مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

"تائی امی! وہ ہمارے گھر کچھ دنوں کے لیے آئی ہے مہمانوں سے مہمانوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔"

"تو میں نے ایسا ظلم کیا؟ کیا مارا پیٹا ہے اسے؟"

"ظلم کیا مارنا ہی ہوتا ہے۔" میں سوچ کر رہ گئی مگر کہا کچھ نہیں لیکن میرے چہرے پر شاید سب کچھ ظاہر ہو گیا تھا۔ تائی جان کو آگ لگ گئی۔

"او بی بی!" انہوں نے مجھے اس طرح مخاطب کیا۔ جیسے میں ان کی بھتیجی نہیں بلکہ اس گھر کی نوکرانی ہوں۔ "اپنے اصول، فلسفے اپنے پاس رکھو تو بڑی مہربانی ہو گی۔ یہ گھر تمہاری آزاد خیالی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آزاد خیالی۔" مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ جسے آزاد خیالی کہتی تھیں وہ یہ تھی کہ ارتضیٰ کو ڈرائیونگ کرتا دیکھ

دیکھ کے میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور صرف سیکھی ہی تھی۔ کبھی چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہاں! کبھی کبھار جب ارتضیٰ ہم سب لڑکیوں کو کسی نہ کسی بہانے باہر لے جاتا تھا۔ تو اس وقت وہ تھوڑی بہت ڈرائیونگ مجھ سے ضرور کروا لیتا تھا۔ حالانکہ فارس بہت ڈرتی تھی۔ باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کہتی تھی۔

"خدارا ہمارے سفر کو سفر آخرت نہ بناؤ۔"

لیکن ارتضیٰ ہی کیا جو بات سن لے۔ فارس کہتی تھی۔

"تائی جان کی ڈکٹیٹر شپ اور ارتضیٰ کی تابعداری ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے زندگی کے سارے معاملات میں ارتضیٰ بے شک اپنی چلا لے۔ لیکن جب بھی کوئی اصل کہانی ہو گی۔ اس کا ٹائٹل تائی جان ہی لکھیں گی اور ہر معاملے میں اپنی چلانے والا ارتضیٰ تائی جان کے سامنے کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔"

"قسم سے فارس! بڑا فالتو وقت ہے تمہارے پاس جانے کون کون سے زمانوں کی کہانیاں لے آتی ہو۔" میں کبھی کبھی چڑ جاتی۔

"کہانیاں کبھی بھی پرانی نہیں ہوتیں۔ صرف کردار بدل جاتے ہیں۔" فارس کہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سورج غروب ہونے کو تھا۔ مجھے یہ منظر ہمیشہ ہی اداس کر دیتا تھا۔ اس لیے میں گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھا سخت اور کھردرا ہاتھ۔ میں نے ایک دم جھٹکے سے سر اٹھایا تو ماہ نور کھڑی تھی۔

"کیا ہوا آپ کو؟ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟" اس کے لہجے میں میرے لیے فکر تھی۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔ تم بیٹھو نا۔"

"نہیں! سردی ہو رہی ہے۔ میں سوپ بنانے جا رہی تھی۔ تو سوچا آپ سے پوچھ لوں، آپ کو کون سا سوپ پسند ہے۔"

"بھئی! ہمیں تو سیدھا سادا سوپ ہی بڑی مشکل سے بنانا آتا ہے۔ چکن کارن سوپ اور تمہیں؟"

"مجھے تھائی سوپ، بہت سارے دیسی سوپ اور اس کے علاوہ۔"

"ارے! بس بس۔ سلیقہ مند بی بی!" میں نے ہاتھ جوڑے۔ "یہ ساری چیزیں تم نے کہاں سے بنانا سیکھ لی ہیں۔ کوکنگ کلاس جوائن کی تھی؟"

"نہیں! وہ جو کوکنگ شوز آتے ہیں نا، وہیں سے سیکھا ہے۔ وہاں تایا چاچا سب کو ہی بہت پسند آتے ہیں۔ سب ہی لوگ فرمائشیں کرتے ہیں۔" وہ کہہ رہی تھی اور میں اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

دنیا میں ابھی بھی معصوم اور سادہ لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر تائی جان مجھ سے نالاں اور خفا رہتی تھیں۔ تو یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ میں تو ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ جو ماہ نور اپنے ددھیال میں کر رہی تھی۔ پھر

بھی میں نے احتیاطاً" پوچھ لیا۔
"تم یہ سب کچھ اپنی خوشی سے کرتی ہو نا؟ تمہارے اوپر کوئی زبردستی تو نہیں ہے نا؟"
"خوشی کس چیز کا نام ہے حوریہ جی! یہ میں نے بہت پہلے ہی بھلا دیا تھا۔ جن کے سر پر والدین کا سایہ نہ ہو' انہیں خواب' خوشی' خواہش اور ایسے بہت بہت سارے الفاظ جو ڈکشنری میں پائے جاتے ہیں' اپنی زندگی سے نکال دینا چاہیے۔"
"آپ زندگی سے کتنی ہی چیزیں نکال دیں۔ مگر زندگی سے تو نہیں نکل سکتے نا؟"
"کیا مطلب؟" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی۔
"کوئی مطلب نہیں۔" میں نے اس کے سر پر چپت ماری۔
"نہیں! بس آپ پہلے مطلب بتائیں۔"
"کیا بتاؤں۔ میں اگر اتنا اچھا سمجھانے والی ہوتی۔ تو خود اپنے آپ کو ہی سمجھا لیا ہوتا ماہ نور!" میں نے کاہلی سے سر دوبارہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔
"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں نا' ورنہ سچ مجھے تو آپ کی باتیں سننا بڑا اچھا لگتا ہے۔ جب آپ دوسروں کو اتنا اچھا سمجھا سکتی ہیں۔ تو یقین کریں! خود کو بھی سمجھا سکتی ہیں۔ لیکن شاید آپ نے کبھی ایسا چاہا ہی نہیں۔"
"اف اللہ!" میں نے سر تھام لیا "ماہ نور کی بچی! جاؤ یہاں سے۔"
"آپ ناراض ہو گئی ہیں۔ میں آپ کے لیے مزے دار سا سوپ بنا کر لاتی ہوں۔ پھر آپ کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔" وہ شرارت سے کہتے ہوئے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو سب ہی لوگ موجود تھے۔ جب بوا اور ماہ نور نے ٹیبل لگا دی۔ اتنی ساری مزے دار چیزیں تھیں کہ ہم سب لوگ دنگ رہ گئے۔ چائنیز میں سبزیوں کی کٹنگ سے ہی میری جان نکلنے لگتی تھی۔
"اف!" میں نے دماغ سے سارے خیالات جھٹکتے ہوئے اپنا دھیان کھانے میں لگانا چاہا۔ مگر کوئی چیز تھی' جو چبھ رہی تھی۔ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔
"کیوں؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟" تائی جان نے سرد لہجے میں کہا۔
"کچھ نہیں! بس بھوک نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"واہ واہ۔" فارس نے چہک کر کہا۔ "گنیز بک کو کوئی فون کر دے۔ آج ایک نیا ریکارڈ بننے جا رہا ہے ورنہ اپنی حوریہ جی کا تو یہ حال ہے کہ ہم سوچتے ہیں ضرور حوریہ کا انتقال کسی فاسٹ فوڈ سینٹر میں ہو گا۔"
"اور کیا! مجھے تو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ تکہ منہ سے لگا ہو گا کہ آنکھیں بند۔" عمر نے کہا۔ سب ہی لوگ زور سے ہنس پڑے۔
"اس میں ہنسنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ لڑکیوں کو اس طرح کھانا بھی نہیں چاہیے۔ یہ تمیز' تہذیب کے خلاف بات ہوتی ہے۔" تائی جان نے تہذیب کا لیکچر مجھے تہذیب کے پردے ہی میں لپیٹ کر دیا۔ ہنسی مذاق کا ماحول ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ سب نے ہی تائی کے لہجے کی کاٹ کو محسوس کیا تھا۔ لیکن کچھ کہنے کی تو کسی کی بھی ہمت نہیں تھی۔ صرف میں ہی ان کے آگے بول لیتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے ہمارے لیے دوسرے لوگ بولیں۔
میں کمرے میں آئی۔ تو ماہ نور بھی میرے پیچھے آ گئی اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا صرف خاموشی سے بیٹھ گئی۔ جب بہت دیر تک وہ کچھ نہ بولی تو اس کی خاموشی سے گھبرا کر میں خود ہی بول پڑی۔
"کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں۔" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
"تمہاری آنکھوں میں آنسو کس لیے بھئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"آپ پتا نہیں ایسی کیوں ہیں۔ آپ کو میری محبت ذرا سی بھی نظر نہیں آئی۔"
"ماہ نور! قسم سے میرا ریکارڈ لگ جائے گا۔ فوراً" یہ

آنسو پونچھو' صرف تم لڑکا نہیں ہو۔ باقی تو فلمی سین مکمل ہے۔" دل پر جو ہلکا سا بوجھ آ گرا تھا۔ وہ اس کی معصومانہ اور پیاری سی بات سن کر ختم ہو گیا تھا۔
"میں نے اتنی محنت سے بنایا تھا۔ اور آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔" اس کی آواز میں پیار بھرا شکوہ تھا۔
"ارے! وہاں اتنے سارے لوگ تو کھا رہے تھے۔ ماہ نور صرف ایک میں ہی تو نہیں تھی۔"
"پتا نہیں! بس مجھے اچھا نہیں لگا۔ بڑی مامی جان نے آپ کو اتنی ساری باتیں سنا دیں اور وہ بھی بلا قصور۔"
"بلا قصور کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ماہ نور! ہم دونوں کے والدین نہیں ہیں یہ ہمارا قصور ہے نا!" میں تلخ ہوئی۔
"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"
"کیوں؟ میں نے ایسی کون سی انوکھی بات کر دی ہے۔ کم از کم لوگوں کے رویے سے میں نے تو یہی بات سیکھی ہے۔"
"چلیں شکر ہے۔ آپ اداس نہیں ہیں۔ میں آپ کے لیے کھانا لے کر آئی ہوں۔"
وہ جلدی سے سب چیزیں ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔
"چلیں! فٹافٹ شروع ہو جائیں۔ میں نے بھی زیادہ نہیں کھایا تھا۔"
میں نے اس کے ساتھ کھانا تو کھا لیا۔ لیکن .... مجھے یہ صحیح نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی محبت میں باندھ رہی تھی اور مجھے رشتے نبھانے نہیں آتے تھے۔ رشتے' محبتیں آپ کو کمزور کر دیتی ہیں اور مجھے کمزور نہیں بننا تھا۔
"ایک بات کہوں ماہ نور؟"
"جی! بولیے۔" اس نے اپنی گھنی پلکوں کو میری سمت اٹھایا۔
"اف خدایا!" میں گڑبڑا گئی۔ "ماہ نور! تمہاری آنکھیں بڑی خوب صورت ہیں۔"
"جی! مجھے پتا ہے۔" نہ اس نے بلاوجہ کی انکساری دکھائی' نہ شرمائی خاموشی سے اعتراف کر لیا۔
"ایک بات بتاؤ! وہاں تمہارے ددھیال میں تمہارے رشتے کی کہیں بات چلی۔ بھئی! اتنے سارے کزنز ہیں۔ پھر سگے تایا وغیرہ ہیں اور اتنی پیاری شکلوں کو کون چھوڑتا ہے۔"
"جو موتی راہ میں رل جائیں۔ پھر ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔" اس نے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے نرمی سے کہا۔ اس کے لہجے میں' میرے جیسی تلخی نہیں تھی۔
"اب تم مجھے حیران کر رہی ہو۔"
"حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں تو آپ کو دیکھ کر حیران ہوتی ہوں۔ جس چیز نے مجھے بزدل اور کمزور کر دیا۔ اسی چیز نے آپ کو مضبوط بنا دیا۔"
"ہاں! اتنا مضبوط کہ لگتا ہے کہ انسان کی جگہ کسی پتھر کے مجسمے سے سر پھوڑ رہے ہیں۔" ارتضیٰ نے اندر آتے ہوئے کہا۔
"آپ بھی نا بس ارتضیٰ بھائی! ایسی باتیں کرتے ہیں کہ بندے کو ہنسی آ جائے۔"
"اچھا! یہ تو بڑے کمال کی اطلاع دی ہے آپ نے کہ ہنسی آتی ہے۔ ورنہ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ لوگ ایسا دانت پیستے ہیں کہ ان کی پوری شکل ہی خوفناک ہو جاتی ہے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر جتایا۔
"ارتضیٰ! جاؤ یہاں سے۔" میں نے چڑ کر کہا۔
"دیکھا! مل گیا نا ثبوت؟" وہ ماہ نور کی طرف مڑا۔ وہ زور زور سے ہنس رہی تھی۔
"چلو بھئی ہنس لو۔ سنا ہے ہنسنے سے خون بڑھتا ہے۔ مگر کاش! یہ بات کسی دوسرے بندے کی سمجھ میں بھی آ جائے۔" اس نے مجھے تپانے کی کوشش کی میں نے گھور کے دیکھا تو وہ ہنستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کو کھانے کے بعد تائی جان نے سب کو بڑے

کمرے میں طلب کر لیا۔ یہ تائی جان کا پسندیدہ کمرا تھا۔ ساری عدالتیں یہیں پر لگا کرتی تھیں۔ پتا چلا کہ ماہ نور کے چچا اور تایا اسے لینے کے لیے آرہے ہیں۔

"اب کیا ہوگا۔" اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔

"میری مانو! تو اسے واپس بھیج دو تاکہ تائی جان کے دماغ میں جو کیڑا مچل رہا ہے۔ وہیں پر سکڑ جائے۔" فارس نے میسج بھیجا' جو میں نے ڈیلیٹ کر دیا۔ میں نے ماہ نور کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

اسی رات اس کے سر میں درد اٹھا۔ جو کہ بہت شدید تھا۔ اس کے لیے ہم لوگوں نے اسے کافی پریکٹس کروائی تھی۔ پھر بھی ہم لوگ ڈر رہے تھے کہ کہیں عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

"قسم سے حوریہ! کسی کو بھی پتا لگ گیا نا تو...... ہم لوگوں کی بری طرح پٹائی ہو جائے گی۔" وہ ڈری ہوئی تھی۔

"کسی کو کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

میں جا کر ماہ نور کے چچا کے پاس بیٹھ گئی۔

"ماہ نور کے سر میں بہت درد رہنے لگا ہے۔ کیوں دادی جان؟" میں نے گواہی کے لیے دادی کو بھی گھسیٹ لیا۔

"ہاں ہاں! بچی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" دادی جان فکر مند ہو گئیں۔

"دادی جان! سٹی اسکین کروالیں۔ پتا چل جائے گا۔ اس کے سر میں کیوں درد رہنے لگا ہے۔" میں نے معصومیت سے تجویز دی۔

"سٹی اسکین...... چچا جان بدک گئے۔ وہ تو بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا' کم از کم پتا تو چل جائے گا نا! یہ آئے دن سر میں درد کیوں رہنے لگا ہے۔" میں نے لہجے میں فکر سمو کر کہا۔

"اچھا! وہاں تو ایسی کوئی شکایت نہیں کی اس نے۔"

"کی بھی ہو گی...... تو آپ کو کون بتاتا چچا! عورتیں بیماری کو کہاں اتنی اہمیت دیتی ہیں۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔" چچا کھڑے ہو گئے۔ ابھی تو میں چلتا ہوں۔ تھوڑا کام سے جانا ہے۔ ماہ نور کو پھر آکر لے جاؤں گا۔" چچا نے عجلت میں کہا اور چلے گئے۔

"تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔" شام کو ارتضیٰ نے خفگی سے کہا۔

"کیوں اب کیا ہو گیا؟" میں انجان بن گئی۔

"وہ اچھا خاصا جا رہی تھی۔ اس کو سکون سے جانے دیتیں۔ کیوں بہانے بنا کر روکا جبکہ میں تمہیں بتا بھی چکا تھا کہ سارے بڑے کیا سوچ رہے ہیں۔"

"دو الگ چیزوں کو ایک ساتھ نہیں جوڑو ارتضیٰ!" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "وہ کیا کہتے ہیں کہ اگر کسی کو تم سے کوئی توقع ہے یا مان ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ تم پر اللہ کی رحمت ہے۔"

"میرا دماغ نہیں کھاؤ۔ جاؤ یہاں سے۔" اس نے غصے سے کہا میں بڑبڑاتے ہوئے جلدی سے ہٹ گئی۔

"لڑکوں میں ذرا بھی عقل نہیں ہوتی۔ اگر تائی جان کے دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ انہیں ماہ نور کو بہو بنانا ہے تو اب اس میں میرا کیا قصور؟"

"تم کیا سوچ رہی ہو با آواز بلند؟" فارس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"کچھ نہیں! دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہی تھی۔"

"کیا نتیجہ نکلا؟"

"کچھ نہیں! دفع ہو جاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"خیریت تو ہے...... ارتضیٰ کبھی تمہارے اوپر اس طرح غصہ نہیں ہوتا اور ابھی وہ بھی غصے میں تھا اور اب تم۔"

"اس دنیا میں سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہی تو ہو رہا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"مرو تم۔" فارس نے بے زاری سے کہا۔ تو اندر آتی ہوئی ماہ نور ایک دم چونک گئی۔

"ہائے نہیں۔" اس نے بے اختیار فارس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ "آپ حوریہ کو اس طرح نہیں کہیے۔"

"کیوں؟ اس میں سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کیا؟

"یہ بات نہیں ہے۔" اس نے انگلیاں چٹخائیں۔
"ماہ نور!" میں نے اسے آواز دی۔
"جی!" وہ میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔
"اف!" میں نے سر پیٹ لیا۔ "ہر وقت اتنی مودب نہ رہا کرو۔ تمہیں کچھ پتا ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟"
"نہیں!" اس نے اپنی خوب صورت سی گردن نفی میں ہلائی۔
"اچھا!" میں نے گہری سانس لی۔ "تمہاری اور ارتضٰی کی بات چیت یا منگنی۔" اس کے چہرے کا رنگ اتنی تیزی سے بدلا کہ میں اپنا جملہ بھی مکمل نہیں کر سکی۔
"کیا واقعی؟" وہ صبر والی لڑکی تھی۔ مگر اس وقت کی بے تابی نے اس کی آنکھوں میں چھپے جذبے کو عیاں کر دیا تھا۔
"ہاں! اور ایسا بالکل پہلی دفعہ ہے کہ ہماری تائی جان نے کوئی صحیح فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اس کے گالوں کو تھپتھپایا۔
"ویسے تمہارے ددھیال والے سلطان راہی تو نہیں بن جائیں گے کہ نہیں! یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" میں نے سلطان راہی کے انداز میں بڑھک ماری۔
"پتا نہیں..." اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک لہر سی نظر آئی۔
"اللہ پر بھروسا رکھو۔ سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔"
"تمہارے ساتھ رہ کر تو کچھ بھی بہتر نہیں ہو گا۔ اپنے ہی رنگ میں رنگ لو گی بی بی! تم تو..." تائی جان پتا نہیں کس وقت ادھر آئی تھیں۔ انہیں غالباً "ٹرنک سے کچھ نکالنا تھا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ آئیں اور سیدھے ایک بڑے ٹرنک کا ڈھکنا اٹھایا۔ میری شامت آئی تھی، جو میں اس صندوقوں والے کمرے میں آگئی تھی۔ تائی جان کو ہر تھوڑے دنوں بعد صندوق سے کچھ نہ کچھ نکالنے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور اب تو خیر موقع بھی تھا۔

"شاید انہیں اپنا بارات کا غرارہ ہی نکالنا ہو... ماہ نور کو منگنی میں پہنانے کے لیے۔" مجھے ایک دم یہ خیال آیا اور پھر میں نے یہ بات پوچھ بھی لی۔ جواباً" تائی جان نے ٹرنک میں سے منہ نکال کر مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔
"تمہاری زبان بہت چلنے لگی ہے۔"
"مگر تائی جان! میں نے تو سوال پوچھا تھا۔"
"سوال! کسی اور کو بے وقوف بنانا تم میرا مذاق اڑا رہی تھیں۔ تمہارا مطلب ہے کہ میں کنجوس ہوں؟ ماہ نور کے لیے نئے کپڑے نہیں لے سکتی؟ تو اب میں تمہیں دکھاؤں گی۔ سنو ماہ نور! ذرا میرے کمرے میں آنا۔" ان کا انداز فیصلہ کن تھا۔ انہوں نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً" گھسیٹتے ہوئے لے گئیں۔
"بیٹھو!" انہوں نے اپنے کمرے میں رکھے صوفے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "میں بہت دنوں سے تم سے کہنا چاہ رہی تھی کہ یہاں آکر تمہارے بڑے پر پرزے نکل آئے ہیں۔ تم نیک اور سعادت مند لڑکی تھیں... اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ ارتضٰی اور تمہاری شادی کا فیصلہ ٹھیک رہے گا، مجھے بدتمیز لڑکیاں بالکل بھی پسند ہیں۔ حوریہ ایک سخت بدتمیز لڑکی ہے۔ ماں باپ کے مرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بے سر کی فوج بن جائے اور بڑوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت اور عزت نہ رہے۔"
"مگر بڑی ماں! حوریہ بالکل ایسی نہیں ہے۔" ماہ نور نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔
"ماہ نور! زبان چلانا مجھے بالکل پسند نہیں ہے میں نے ابھی بتایا ہے تمہیں۔"
"جج... جی!"
ماہ نور ڈر کر چپ ہو گئی۔
"تم بھی بن ماں باپ کی بچی ہو۔ مگر اللہ بخشے! اسمہ تمہاری بڑی اچھی تربیت کر گئی ہے۔ ماشاء اللہ سے!"
ماہ نور کا دل چاہا کہہ دے کہ بڑی ماں! چپ رہنا تربیت نہیں ہوتی ہے۔ بزدلی اور کم ہمتی ہوتی ہے لیکن ابھی ابھی انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں لڑکیوں کا

زبان چلانا پسند نہیں ہے۔
"میں جاؤں؟"
"بیٹھو! میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے ابھی۔"
"جی بولیں!" وہ مودب ہو کر بیٹھ گئی۔
"صوفے پر تو بی بی! تم ایسے بیٹھی ہو جیسے میں نے تمہیں سزائے موت سنا دی ہو۔ حالانکہ میں نے تم سے صرف یہ کہا ہے کہ جیسی ہو ویسی ہی رہو۔ کسی کو دیکھ کر اپنے رنگ ڈھنگ نہیں بدلو ورنہ پھر شاید مجھے اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔ اب جاؤ۔" انہوں نے تکیے کے نیچے سے تسبیح نکالتے ہوئے رعونت سے کہا۔
ماہ نور نے باہر آکر گہری سانس لی۔ اتنی دیر سے وہ سانس روک کر بیٹھی ہوئی تھی۔
"حد ہو گئی۔" اس نے اپنے آپ کو جھڑکا "انسان کو انسان سے اتنا بھی نہیں ڈرنا چاہیے کہ ڈھنگ سے سانس بھی نہ لے سکے۔ کاش! بہادری اور ہمت کا بھی کوئی کیپسول ہوتا کہ بندہ وہ کھا لیتا اور سارے مسئلے حل ہو جاتے۔" لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو بری طرح جھڑک دیا۔
"بس رہنے دو ماہ نور! تم جیسے بزدل لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ ایسے کیپسول تمہیں سو، ہزاروں کی تعداد میں کھانے پڑتے۔ پھر بھی شاید تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوتا۔" اپنی سوچ پر ماہ نور کو خود ہی ہنسی آگئی۔
اور جس وقت وہ اکیلی کھڑی ہنس رہی تھی، ارتضٰی کمرے سے باہر آیا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے حیرت سے کہا۔
"جج... جی! کچھ نہیں۔" اس نے وہاں سے دوڑ لگائی۔ "توبہ! ماں بیٹا سب بڑے خوفناک ہیں۔ بھلا بتائیں ہنسنے بولنے پر بھی پابندی۔" اس نے فارس کو ساری بات بتائی۔
"سوچ لو! آگے پوری زندگی پڑی ہے۔" فارس نے اسے ڈرایا۔
"فارس! اسے ڈراؤ نہیں... جو لوگ پہلے ہی وقت و حالات کے مارے ہوں انہیں سہارے کی ضرورت

ہوتی ہے... اور ماہ نور! ارتضٰی بہت اچھا ہے۔ بہت خیال رکھنے والا۔ سب کی فکر کرنے والا۔"
"اور محبت کرنے والا... یہ بھی تو اسے بتاؤ حوریہ!" فارس نے خفگی سے کہا۔
"مجھے فارس کی باتیں کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔" ماہ نور نے چپکے سے مجھ سے کہا۔
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
"یہ آپ کو بہت ڈانٹتے ہیں اور کچھ ایسی باتیں بھی کرتے ہیں، جو میرے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ کیا میں نا سمجھ ہوں۔ یا کم عقل؟" وہ اداس ہو گئی۔
"تم کچھ بھی نہیں ہو۔ فارس کی بچی کو بلاوجہ بے سروپا کی باتیں کرنے کا شوق ہے۔ تم بتاؤ! تائی جان نے کیا کہا؟" ماہ نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سر جھکائے لکیریں کھینچتی رہی۔
"کچھ زیادہ سخت شرائط عائد کر دی ہیں کیا؟"
"آپ کو یہ بھی پتا چل گیا؟" اس نے سر اٹھا کر حیرت سے مجھے دیکھا۔
"اس میں پتا نہ چلنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے چہرے پر ساری باتیں لکھی ہوتی ہیں۔"
"مگر یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ بلاوجہ کسی انسان سے دشمنی باندھ لینا۔"
"تم یہ بات تائی جان کے منہ پر کر سکتی ہو؟"
"نہیں بابا۔" ماہ نور نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"حوریہ اور تائی جان کی دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے جو بھی بات بری لگتی ہے، یہ ان کے منہ پر کر دیتی ہے۔ اس لیے اس موضوع کو جانے دو۔ گھر میں بہت ساری ایسی چیزیں ہیں۔ جو صرف تائی جان کی پسند ناپسند پر چل رہی ہیں اور ہم میں سے کسی کی اتنی ہمت نہیں چاہے وہ ہمارے والدین ہی کیوں نہ ہوں کہ وہ ان کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جا سکیں۔ لڑکیوں کی زیادہ تعلیم وقت کا ضیاع ہے، لڑکیوں کو ذرا سی بھی آزادی دینے کا مطلب ہے کہ آپ نے ان کو بے حیائی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ یہ سارے فرمودات تائی

جان کے ہیں۔۔۔ اور حوریہ ان فرمودات کی زد میں سب سے زیادہ آجاتی ہے۔" فارس نے پوری تقریر جھاڑی اور چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

میں سر کو دونوں گھٹنوں میں رکھے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ جب ارتضیٰ نے مجھے چونکا دیا۔
"کیا کر رہی تھیں؟"
"کچھ نہیں۔"
"تم سے بندہ یہی امید رکھ سکتا ہے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔" اس نے طنز کیا۔
"اب اتنی رات کو میں کیا کروں۔" میں چڑ گئی۔ "ابھی سب کو کافی، چائے دے کر آئی ہوں۔"
"کیوں؟ تمہیں ایگزامز کی تیاری نہیں کرنی ہے؟ پچھلے سمسٹر میں بھی تمہارے خراب نمبر آئے تھے۔ گھر کے کاموں سے باہر نکل جاؤ۔" اس نے ڈانٹا۔
"اور نکل کر کہاں جاؤں، یہ بھی ساتھ بتا دیتے۔" میرا لہجہ اچھا خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بھی ارتضیٰ تھا برداشت اس میں بھی بہت تھی۔
"گھر کے کاموں کے لیے تم کوئی ہیلپر وغیرہ رکھ لو۔ بہت آسانی ہو جائے گی۔" اس نے یوں کہا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ مگر میری نگاہوں میں تائی جان کا سراپا گھوم گیا۔
"میری آسانی سے کسی کو بڑی پریشانی ہو جائے گی اس لیے یہ، ہمدردی کا چیپٹر کلوز کر دو۔" میں جھلا گئی۔
"میں اب صرف ہمدردی ہی کر سکتا ہوں۔" ارتضیٰ کے لب بھینچ گئے۔ "محبت کرنے کا حق تم نے خود کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔"
"ارتضیٰ!" میرے سر میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے، وقت کا کوئی لمحہ میرے اور اس کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ نہ میں اسے پورا دیکھ سکی۔ نہ سن سکی مجھے لگا۔ اب جو کچھ بھی تھا۔ وہ امانت میں خیانت تھا اور مجھ سے تو کبھی چھوٹی سی خیانت بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ یہ تو پھر بڑی بات تھی۔
"تم نے میرا ساتھ نہ دے کر اچھا نہیں کیا حوریہ! اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"
اس کے چہرے پر دکھ کی ان گنت لکیریں تھیں اور میرے سامنے چپ کا راستہ تھا اور چپ اپنا بھید کسی کو نہیں دیتی۔ اپنے اسرار کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔

☼ ☼ ☼

"تم کم از کم اپنی تعلیم تو دوبارہ شروع کر سکتی ہو۔ فی زمانہ میٹرک انٹر کی کیا اہمیت ہے؟" میں نے ماہ نور کو سمجھایا تو فارس نے گھور کر مجھے دیکھا۔
"بہتر ہو گا کہ تم کوئی این جی او جوائن کر لو۔ اس سے تمہیں ایک پلیٹ فارم بھی مل جائے گا۔"
"میری سمجھ میں ان کی بات نہیں آئی۔" اس نے چپکے سے مجھ سے کہا۔
"اور میری بات؟ کیا وہ بھی سمجھ میں نہیں آئی؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔
"مگر وہ بڑی ہائی۔۔۔" بولتے بولتے وہ اٹک گئی۔
"ہم تمہیں تائی جان سے جنگ کرنے کے لیے تھوڑی کہہ رہے ہیں مجھے لگتا ہے تم ذہین ہو۔ بہت جلدی کور کر لو گی۔ کسی بھی پرائیوٹ انسٹی ٹیوٹ میں بی ایس سی یا بی اے میں ایڈمیشن لے لو۔" میں نے اسے راستہ دکھایا۔
"اور فیس۔۔۔؟"
"فیس کا کیا مسئلہ ہے۔ ارتضیٰ تمہارا ایڈمیشن کروا دے گا اور فیس تمہارے چچا وغیرہ دے دیں گے۔ تمہارے ابا کی دکانوں کا کرایہ بھی تو وہی لوگ لیتے ہیں۔"
"آپ ایسا مشورہ نہ دیں۔ جس سے چچا مجھے واپس ہی نہ لے جائیں۔" وہ ڈر گئی۔
"تمہیں اس وقت تک کوئی نہیں لے جا سکتا۔ جب تک تم خود نہ چاہو۔ آئی سمجھ میں بات؟" میں نے خفگی سے کہا۔
"تمہاری باتیں، ہماری سمجھ میں بڑی مشکل سے آتی ہیں۔ اس کی سمجھ میں اتنی جلدی کہاں کچھ آئے گا۔" فارس نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ پھر ایک دم ہی اس کا موڈ تبدیل ہو گیا۔
"ارتضیٰ زبردست کلیکشن لے کر آیا ہے۔"
"سچ؟" میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ ارتضیٰ کی قسمتی تھی کہ میوزک میں ہم دونوں کی یکساں پسند تھی۔ اور آج کل تو مجھ پر کلاسیکل غزلوں کا جیسے بھوت سوار تھا۔ ابھی پرسوں ہی میں نے ارتضیٰ کی گاڑی میں اپنی پسندیدہ غزل کو بجتے سنا تھا۔ تب سے میں اسے حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھی۔
"تم چوری کرو گی؟" فارس نے میرے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ تو مجھ سے تصدیق چاہی۔
"ہرگز نہیں۔۔۔ بس بغیر بتائے اٹھا لیں گے۔ پھر سن کر چپکے سے واپس رکھ دیں گے۔" میں نے اطمینان سے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔
"اچھا!" فارس نے دانت پیسے "اور اس سارے پروسس کو ڈکشنری میں کیا کہتے ہیں؟"
"کچھ بھی کہتے ہوں۔" میں نے جا گرز میں پاؤں اٹکائے "تم بس اپنا منہ بند رکھو گی۔ زیادہ میر جعفر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"کسی دن تم رنگے ہاتھوں پکڑی جاؤ۔ پھر پتا چلے گا۔ کیسی گٹ لگتی ہے۔" وہ جل کر بولی۔
"اچھا!" ماہ نور نے آنکھیں پھاڑیں۔ "ارتضیٰ بھائی ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔ کیا وہ واقعی حوریہ کی پٹائی کریں گے؟"
"ہرگز نہیں۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ۔ اس کی باتوں میں نہیں آیا کرو۔ یہ یوں ہی بکتی رہتی ہے۔"
"ویسے ایک بات بتاؤ ماہ نور! اس دفعہ اب تک تمہارے ددھیال سے کوئی لینے نہیں آیا۔ ورنہ تمہارا تو ایک مہینہ بھی گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔" فارس کو اچانک خیال آیا۔
"ہاں! اس دفعہ شاید ان لوگوں نے سوچا ہو کہ گدھے کو تھوڑا آرام کرنے دیا جائے۔"
"دیکھا یہ بات۔۔۔ میں تم سے اس دن کہہ رہی تھی نا۔ تو تم نے کہا کہ میں کام اپنی خوشی سے کرتی ہوں۔" میں نے اسے جتایا۔
"ہاں!" ماہ نور کے لہجے میں سادگی تھی۔ "کیونکہ پہلے مجھے پتا نہیں تھا کہ کام کرنے اور جانوروں کی طرح بوجھ اٹھانے میں فرق ہوتا ہے اور نہ ہی مجھے یہ پتا تھا کہ آرام کرنے سے جسم کو کتنا سکون ملتا ہے۔ سچ میرا ذرا دل نہیں چاہ رہا کہ میں واپس اس جگہ جاؤں جہاں جسم کی ہڈیاں تک چیخ جاتی ہیں۔"
آج اس نے یوں پہلی دفعہ اظہار کیا تھا۔ ورنہ وہ چپ چاپ اپنا ایک ہفتہ گزار کر چلی جاتی تھی اور ہمیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا اور جو کچھ آج پتا چلا تھا۔ وہ اتنا تکلیف دہ تھا کہ ہم اسے دو بول تسلی کے بھی نہ دے سکے۔
"تو بس تم واپس نہیں جانا۔" میں نے سیدھا سادہ حل پیش کیا۔
"نہیں! یہ آسان نہیں ہے۔"
"ایسا مشکل بھی نہیں ہے بس! تمہیں خود کو ہمت کا سبق پڑھانا ہو گا۔"
"یہ اتنا آسان سبق نہیں ہے۔" ماہ نور کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔
"اگر پہلے سے ہر چیز کو فرض کرنا ہے۔ تو پھر بہتر ہے کہ ایک دفعہ بیٹھ کر دل و دماغ کو اچھی طرح سمجھا لو کہ زندگی کو اسی طرح گزارنا ہے۔۔۔ اور اگر نہیں تو پھر ہمت و حوصلے کا سبق یاد کر لو۔" میرا لہجہ بہت سخت تھا۔ فارس نے مجھے ٹوک دیا۔
"ذرا نرمی سے بات کرو۔"
"زندگی کی ہر چیز میں نرمی نہیں چلتی۔ میں اس کو یہی سکھانا چاہتی ہوں۔ آج اس کی نانی جان زندہ ہیں۔ وہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ یہ بزرگ بھی بہت بڑی طاقت ہوتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا فارس! میری بہت ساری چیزوں پر اعتراض ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر تائی جان کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ لیکن دادی جان نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا۔ کبھی نہیں ڈانٹا۔ ماہ نور

نے اپنے زخم ہم لوگوں کو کبھی نہیں دکھائے۔ تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کو زخم لگے ہی نہیں ہیں۔" میں کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔ مجھے لگا۔ میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہوں۔

"ماہ نور! اب اگر تمہارے تایا تم کو لینے کے لیے آئیں نا۔ تو تم جانے سے انکار کر دینا۔"

"تم پلیز! مولا جٹ نہیں بنو..... اور نہ اس بے چاری کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاؤ۔" فارس گھبرا کر بولی۔ پھر وہ ماہ نور سے مخاطب ہوئی۔

"دیکھو ماہ نور! تم اس کی باتوں میں بالکل نہ آنا۔ یہ زندگی کے بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں اور ایک دم نہیں کیے جاتے۔ ہم سب تمہیں ضرور سپورٹ کریں گے۔ لیکن فیصلہ تمہارا اپنا ہونا چاہیے۔"

"اور فیصلہ کرنے کا بہترین طریقہ پتا ہے کیا ہے..... ایک دفعہ فیصلہ کر لو۔ پھر اس پر ڈٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ جس وقت میں نے یہ جملہ کہا۔ اسی وقت مجھے لگا جیسے دروازے پر کوئی کھڑا ہے۔ میں نے چونک کر دیکھا اور سانس میرے اندر ہی گھٹ گئی۔

دروازے پر تائی جان کھڑی تھیں۔ پتا نہیں ہماری گفتگو کا کتنا حصہ انہوں نے سنا تھا اور کتنا نہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ہمیں کچھ بھی پتا نہیں چل سکا۔

"ماہ نور! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو طور طریقے سے رہنا اور اگر تمہیں حوریہ کی طرح بگڑنا ہی ہے تو بی بی! اپنے ددھیال واپس جاؤ۔" تائی ماں نے اسے ہمارے سامنے ہی ٹھیک ٹھاک جھاڑ دیا اور خود ـــــ واپس چلی گئیں۔ ماہ نور بھی خاموشی سے اٹھ کر ان کے پیچھے چلی گئی۔ میں اور فارس ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھتے رہ گئے۔

"لو جی! قصہ ختم۔" میں نے ہاتھ جھاڑے لیکن اگلے ہی لمحے کسی خیال کے تحت بولی۔

"پتا نہیں قصہ ختم ہوا ہے یا شروع۔"

"اچھا زیادہ فلسفی نہیں بنو۔" فارس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "تمہاری باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں۔ کاش! تم بھی کبھی سمجھ میں آجاؤ۔"

☼ ☼ ☼

تائی جان شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ جب ارتضیٰ اور عمر وغیرہ بہت ساری کھانے پینے کی چیزیں لے آئے۔

"اتنی مہربانی کس لیے؟" فارس نے شاپر کے اندر منہ گھساتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں اب سوال جواب نہیں کرو۔ بس! کھالو فٹافٹ۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میرا خیال ہے' یہ منگنی سے پہلے ہی ہم لوگوں کو ٹریٹ دے رہا ہے۔"

"یہ بیٹھے بٹھائے کس کی منگنی ہو رہی ہے؟" عمر نے چونک کر پوچھا۔

"تائی جان سوچ رہی ہیں کہ بس اب ان کے بیٹے کے سہرے کے پھول کھل جانے چاہئیں۔" فارس نے ارتضیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے سچ! کتنا مزا آئے گا نا بڑے عرصے بعد گھر میں کوئی ہلا گلا ہو گا۔" فارس کے اپنے ہی تبصرے جاری و ساری تھے۔

میں نے ایک نظر ارتضیٰ کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بھی حیرانی کا تاثر تھا۔ گویا اسے بھی کچھ علم نہیں تھا۔ ایک دم میری نظر ماہ نور پر گئی۔ وہ سر نیچے کیے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ مجھے یاد آگیا۔ کہ ارتضیٰ سے اس کے متعلق بات کرنی تھی۔ اس وقت تائی جان بھی نہیں تھیں سو موقع اچھا تھا۔

"ارتضیٰ! ماہ نور کو فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لینا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ میری بات سن کر ماہ نور فارس اور عمر کھسک لیے۔

"ایک دم بیٹھے بٹھائے یہ تعلیم بالغان کا پروگرام خیریت؟"

"ہاں خیریت۔ ابھی اس کا جانے کا پروگرام نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ اپنی تعلیم ہی مکمل کرے۔"

"تم تو اس طرح بات کر رہی ہو جیسے ماہ نور کی اتھارٹی تمہیں مل گئی ہو یا تم اس کی دادی اماں لگ گئی ہو؟"

"ارتضیٰ! فضول باتیں نہیں کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"فضول حرکتیں تو تم کرنے لگی ہو۔ ابھی میری منگنی کی بات چل رہی تھی۔ لیکن تمہاری صحت پر تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔"

"تمہاری منگنی اور میری صحت کا آپس میں کیا تعلق ہے بھئی؟" میں نے انداز ہلکا پھلکا رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔

"میری منگنی اور تمہارے دل کا بھی کوئی تعلق ہے کہ نہیں؟ وہ بھی بتا دو۔" ہمیشہ نرمی سے بات کرنے والے ارتضیٰ کا لہجہ آج دہکا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو آگئے۔

"بند کرو یہ رونا۔" اس نے ناراضی سے کہا' جواباً وہ آنسو جو آنکھوں میں تھے۔ پھسل کر گالوں تک آگئے۔

"دیکھو حوریہ! ایک تو میں ویسے ہی پریشان ہوں۔ اس پر تمہارے آنسو..... کیا ضروری تھا کہ میں سب کچھ اپنے منہ سے کہتا۔ تم بڑی کوڑھ مغز ہو۔ زندگی بھر سوائے لڑنے جھگڑنے کے تم نے کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔" اس نے شکوہ کیا۔

"اپنی امی کی زبان نہیں بولو۔ وہ بھی ہر وقت مجھے کوئی نہ کوئی نصیحت کرنے کو تیار رہتی ہیں۔"

"حوریہ!" اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"اچھا اچھا تائی امی۔ سوری! غصے میں دھیان نہیں رہا۔ ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ تائی امی کی زبان نہیں بولو۔"

"بات تو سن لو پوری۔" وہ جھنجلا گیا "امی کل کہہ رہی تھیں کہ ماہ نور سے منگنی....." ادھورا جملہ بول کر خاموش ہو گیا۔

"تو پھر؟"

"تمہارا سر۔"

وہ غصے میں سرخ چہرہ لیے پلٹ گیا اور میں وہیں اندھیرے میں کھڑی رہ گئی۔ تنہا اندھیری شام کے نیچے مجھے لگا کہ یہ وقت یہ موسم اور یہ گزرے کچھ لمحے ساری زندگی یونہی میرے دل دماغ پر نقش رہیں گے۔ میری زندگی میں کوئی دوسرا لمحہ ایسا نہیں آئے گا۔ جو پھر سے مجھے جینا سکھا دے۔ جو پھر سے مجھے روشنیاں عطا کر دے۔ اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہاں سے وہاں تک۔

تھوڑی دیر بعد فارس آگئی۔

"کیا واقعی جو کچھ میں نے سنا ہے' وہ صحیح ہے؟"

اب مجھے کیا پتا کہ تم نے کیا سنا ہے۔" میں نے بڑی کوشش کر کے اپنے لہجے کو سرسری رکھا۔

"ایسا ہو نہیں سکتا کہ ارتضیٰ نے تمہیں نہ بتایا ہو۔" اس نے مجھے شکی نظروں سے دیکھا۔

"وہ تو ہزار باتیں بتاتا ہے۔ مجھے کیا پتا' تم کون سی بات کر رہی ہو۔"

"ضروری نہیں تھا تم مجھ سے بھی جھوٹ بولتیں ـــــ کاش! اس وقت ایک دفعہ تم نے اپنا چہرہ بھی دیکھ لیا ہوتا۔" اس کی بات سن کر میں نے سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

پرائیوٹ یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہو گئے تھے۔ ارتضیٰ نے ماہ نور کا ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ تائی جان بہت آڑے آئیں۔ ناراض ہونے کی دھمکی دی۔ لیکن ارتضیٰ نے ان کی نہیں سنی۔

"اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش چھوڑ کر آپ کی بات مان لی ہے نا۔ اب آپ کیا چاہتی ہیں کہ آپ کی ہر بات چپ چاپ سن لوں؟" اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ تائی جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ساری چیزیں بخیر و خوبی ہو گئی تھیں۔ ماہ نور بہت خوش تھی۔ اس کی منگنی کے بارے میں اس کے ددھیالی رشتہ داروں کو بہت سارے اعتراضات تھے۔ ماہ نور کی بڑی تائی اور چھوٹی تائی کو اعتراض تھا کہ ابھی ماہ نور سے بڑی بہنیں یعنی ان کی بیٹیاں موجود ہیں۔ ایسے میں چھوٹی کی شادی کی بات کرنا۔

منگنی پر واقعی تائی جان نے بڑا خرچا کیا تھا۔ ارتضیٰ نے کسی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ تائی جان کی اپنی خواہشات اور اپنے ارمان تھے میں کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ جہاں تک ہو تا وہ سب کچھ کرتی جس سے دوسرے خوش رہیں۔ مگر یہاں اس بے مہر دنیا میں کسی کو خوش کرنا کہاں آسان ہو تا ہے۔ فارس کا منہ جو سوجا تھا۔ وہ سوجن اترنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ارتضیٰ کا منہ اس طرح سوجا ہوا نہیں تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کی خاموشی اس کے ہونٹوں کی جامد چپ سے میں پریشان ہو گئی تھی۔ بندہ لڑے 'شکایت کرے' نہیں تو کم از کم فارس جتنا منہ ہی سجالے۔ لیکن اس طرح سے نہیں مارے جہاں سب سے زیادہ تکلیف ہو۔ مگر ارتضیٰ سے اس وقت کوئی بھی بات کرنا مشکل تھا۔ اس کے لہجے سے شعلوں کی تپش آنے لگی تھی اور پیشانی پر مستقل بل۔ ماہ نور مجھ سے چپکے سے کہتی۔

"میرا خیال ہے۔ سوتے وقت بھی ان کی پیشانی کے بل نہیں جاتے ہوں گے۔"

"تم بہت بک بک کرنے لگی ہو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"مجھے ماہ نور کے جملے سے تکلیف پہنچی تھی۔" فارس کا لہجہ آزردہ تھا۔

"اس قدر تکلیف کی بھی بات نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے تو کوئی بات بھی تکلیف کی نہیں ہوگی، تمہیں کیا مسئلہ تھا حوریہ! کیوں تم نے مرتضیٰ کے ساتھ اس طرح کیا؟"

"کوئی کسی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا جو ہے تقدیر ہے۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

"بے کار کی باتیں مت کرو۔ اب بھی بہت کچھ ہے جو بگڑنے سے بچ سکتا ہے۔"

وہ کہہ رہی تھی۔ جبکہ میں سوچ رہی تھی کہ سنوارنے کو اب کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ دل ہے کہ اپنا کام کیے جا رہا ہے یعنی دھڑکنے کا اور شکر ہے اللہ کا کہ یہ سارا کام آٹومیٹک طریقے سے ہوتا ہے۔ ورنہ بڑی پریشانی ہو جاتی۔ میں نے آنسو کے گھونٹ حلق میں اتارے یا دل میں کچھ یاد نہیں لیکن آنسو روکنے میں کامیاب رہی۔

"تمہارے لیے فارس! یہ سب کہنا بہت آسان ہے۔ تمہارے ماں باپ ہیں۔ بہن بھائی، پوری ایک فیملی۔ جو کسی بھی وقت تمہیں سپورٹ کرنے کو تیار ہو گی۔ وہ غلط بات کہنے والے کا منہ بھی توڑ سکتے ہیں اور ہاتھ بھی۔ اور میں، میں اس جگہ آکر بہت اکیلی پڑ جاتی ہوں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ تم سب لوگوں سے زیادہ بہادر ہوں۔ لیکن بات پھر میرے کردار پر آئے گی۔ ماں کی تربیت پر آئے گی۔ خون پر آئے گی۔ میں کہاں کہاں زخم کھاؤں گی۔ مجھے یہ بتادو۔ تائی امی کا مجھ سے خون کا رشتہ نہ سہی 'انسانیت کا تو ہے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے صرف ایک رشتہ قائم کیا ہے اور وہ نفرت کا ہے۔ چلو! میں نفرت بھی سہہ سکتی ہوں۔ مگر تذلیل نہیں۔ یہ میرے کردار کو گوارا نہیں ہو گا۔ بس یہ اتنی ہی کہانی ہے۔"

☼ ☼ ☼

ہال کمرے میں سب ہی لوگ موجود تھے۔ جب تائی جان چھوٹے چھوٹے مخملیں ڈبے پکڑے اندر داخل ہوئیں۔ فارس نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے ڈبے سنبھالے۔

"تائی جان! یہ کیا ہے؟" سب ہی مارے تجسس کے آگے کو جھک آئے۔

"بس دیکھ لو۔" ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ آخر انہوں نے خود ہی ڈبے کھول کر ان کے اندر موجود کنگن کی رونمائی کروائی۔ اندر بڑے خوب صورت سے نازک سے چاندی کے کنگن تھے۔

"اتنے سارے ایک وقت میں ماہ نور پہنے گی کیا؟" ہم سب کو ہی حیرت ہوئی۔

"ماہ نور کیوں؟ اس کے لیے تو میں سونے کا بنواؤں گی۔ ابھی تو یہ تم سب بہنوں کے لیے ہے۔ نیگ کے طور پر۔"

"ہائے یچ!" سب کی ہی چیخ نکل گئی۔
"اف!" فارس نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ "آج تو حاتم طائی کی روح بھی قبر میں تڑپ رہی ہوگی۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کے پیچھے تائی جان کی نیت کیا ہوگی۔"
"مجھے کیا پتا فارس!" مجھے غصہ آرہا تھا۔ مجھے یہ کنگن نہیں چاہیے تھے۔ اب بھی دل میں جس کے نام سے درد کی ٹیس اٹھتی تھی۔ آج اسی کے نام کے نیگ وصول کرنا اور اتنے لوگوں کے بیچ میں منع کرنے پر تماشا بننا۔ میری ہتھیلیاں پسینے میں نم ہو گئیں۔ ڈبوں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ جب اچانک ہی زوبی نے کہا۔
"تائی جان! ابھی ہم چار لوگ ہیں... اور کنگن تو اب تین ہی رہ گئے ہیں۔"
"اچھا اچھا۔" ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر آئے۔ کنگن اور میرے حوالے سے شاید ان کے ذہن میں کوئی بات ہو۔ وہ بہنوں کو نیگ دے رہی تھیں۔ کمال سادگی سے لیکن میں یہ کنگن نہیں لے سکتی تھی۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا اور میرے اللہ کو یہ بات پتا تھی۔ لیکن دنیا تو واقعی آپ کو دکھاوے سے ہی جانتی ہے۔ میں نے دوبارہ وہی بات سوچی۔
دل میں آج بھی جس کے نام سے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوں۔ آج کسی اور رشتے سے میں کیسے نیگ لے سکتی ہوں۔ کچھ وقت گزر جائے گا تو پھر یہ دل سنبھل ہی جائے گا۔ لیکن ابھی میرے ہاتھ خالی تھے۔
"تائی جان!" میں اٹھ کر ان کے پاس آئی۔ "آپ یہ ان لوگوں کو دے دیجئے میرا بعد میں کچھ بھیجئے گا۔" کہنے کے ساتھ ہی میں باہر نکل آئی۔ مبادا وہ کوئی اصرار کرنے لگیں۔
باہر نکلتے کے ساتھ ہی اچھی خاصی ٹکر نے حواس گم کر دیے۔
"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔" ارتضیٰ نے مجھے گھورا۔
"کیوں میں نے کیا کیا ہے۔ ایک تو خود آندھی طوفان کی طرح آرہے تھے پھر قصور بھی میرا۔" میں نے ماتھے کو دباتے ہوئے کہا۔
"زیادہ چوٹ لگ گئی ہے کیا؟" اسے اچانک میری فکر ہوئی۔
"لگی بھی ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ خیر! کمرے میں جانا ہے تو چلے جاؤ۔" میں نے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ مگر پھر اچانک مجھے کچھ یاد آیا تھا۔
"اور ہاں!" ماہ نور کو میتھس میں مشکل ہو رہی ہے۔ تم اسے تھوڑا سمجھا دینا۔"
"تم سمجھا دو۔ اچھا تو سمجھا لیتی ہو۔" اس نے یہ جملہ اگر طنزیہ کہا ہوتا تو پھر میرا اس کا جھگڑا ہو جاتا۔ لیکن اب اس کی ہر بات کی تہہ میں کسی درد کی ایک تلخی موجود ہوتی اور میں چپ ہو جاتی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی کہہ دیا۔
"اچھا! ٹھیک ہے۔ آج شام کو سمجھا دوں گا اور تمہاری اسٹڈیز ٹھیک جا رہی ہیں؟"
"ہاں!" میں نے آہستہ سے کہا۔
"یہ اتنی آہستہ آواز میں ہاں سے کام نہیں چلے گا۔ تمہاری اسٹڈیز زبردست ہونی چاہئیں۔ ہم سب کو ہی بڑی امیدیں ہیں۔"
"ہم سب کون؟" میرا لہجہ تیکھا ہو گیا۔
"ہم سب۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ "تمہیں دیکھ کر ہی ان لڑکیوں کو آگے بڑھنا ہے۔ جنہیں پتا نہیں کن رسم و رواج کے تحت جہالت کے اندھیروں میں رکھا جا رہا ہے۔"
"اور یہ کون کر رہا ہے ارتضیٰ؟" میرا لہجہ طنزیہ اور کچھ جتاتا ہوا تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔
"کوئی بھی کر رہا ہو۔ لیکن تم نے بھی اسی ماحول میں رہ کر ۔۔۔ یہ سب کچھ کر ہی لیا نا! چاہے وہ ایجوکیشن ہو، ڈرائیونگ یا کچھ اور۔۔۔"
"اور بدلے میں، بہت کچھ کھو بھی دیا ہے۔ اگر ترازو کے پلڑے میں نفع نقصان رکھوں۔ تو پتا نہیں چلے گا کہ نفع کہاں پر ختم ہوتا ہے اور کہاں سے نقصان شروع ہوتا ہے۔" میں یہ بس سوچ کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے اپنے چچا سے اپنی یونیورسٹی فیس کی بات کی تھی۔ اس کے اندر بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ کیونکہ یہ ساری باتیں اس نے خود ہی کی تھیں۔ ہم میں سے کسی کو شامل کیے بغیر اور چچا نے ایک ہفتے کا وقت مانگ لیا تھا۔ ان دنوں ہمیں بھی باتیں کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ صبح کی گئی تین بجے تک آتی۔ پھر اپنے اسائنمنٹ پروجیکٹ لے کر بیٹھ جاتی۔ اس نے پڑھائی دو سال کے وقفے کے بعد شروع کی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ذہین تھی اور اپنی ذہانت سے ہی اس نے جلدی کور کر لیا تھا۔ میتھس میں وہ ارتضیٰ سے مدد لے لیتی تھی۔
چھ مہینے تک سلسلہ ٹھیک چلا۔ مشکل جب ہوئی۔ جب دوسرے سمسٹر کے لیے اس کو پچاس ہزار روپے کا فیس واؤچر ملا۔ یہ ایک خطیر رقم تھی فرسٹ سمسٹر کا تو ارتضیٰ نے ہی سب کچھ کیا تھا۔ لیکن اب میں نے تو کہا۔ ارتضیٰ سے بات کر لیتے ہیں۔ مگر وہ اکڑ گئی۔
"میں ابھی ارتضیٰ بھائی کی ذمہ داری نہیں ہوں۔"
"کچھ تو خیال کرو لڑکی! اب تو ارتضیٰ بھائی نہیں کہا کرو۔" فارس نے ڈانٹا۔
"بس وہ عادت بھی تو پڑ گئی ہے نا اور پھر ان کو دیکھ کر ڈر بھی لگتا ہے۔"
"تو اس کا آسان طریقہ ہے۔ منگنی توڑ دو۔"
"فارس! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" میں نے اسے گھورا۔
"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "میں نے چچا جان کو فون کر دیا ہے۔ انہوں نے کل آنے کو کہا ہے۔"
"چلو! ٹھیک ہے۔" مجھے اس کے لہجے کا یقین اچھا لگا۔ شکر ہے دنیا میری طرح نہیں سوچتی۔ ہر چیز کا بس تاریک پہلو۔
اس کے چچا چھٹے روز آئے۔ بہت پریشان نظر آرہے تھے۔
"نمنہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تمہاری چچی نے بلایا ہے۔"
اور یہ ایسی بات تھی کہ ہم اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں بھی ابھی ایک مہینہ کی چھٹیاں تھیں اس کی پڑھائی کا نقصان بھی نہیں تھا۔ وہ چلی گئی۔ لیکن پھر کافی دن تک کوئی اطلاع ہی نہیں آئی۔ ہم سب کو ہی اس کا انتظار تھا۔ روز فون کرتے۔ مگر وہ فون پر بھی نہیں ملتی تھی۔ دادی جان بھی پریشان تھیں۔ دو ایک دفعہ انہوں نے کہا بھی تو تائی نے انہیں چپ کروا دیا۔
"وہ کسی غیر کے گھر میں نہیں ہے ۔۔۔ ان ہی لوگوں کے پاس ہے۔ جن کے پاس ہمیشہ سے رہتی آئی ہے۔" اس بات پر بے چاری دادی خاموش ہو گئیں۔ مجھے ارتضیٰ پر بھی غصہ آرہا تھا۔
اسے کچھ تو خیال ہونا چاہیے تھا اور وہ تو بہت خیال رکھنے والا بندہ تھا۔ مگر اب تو مزاج آسمان پر ہی رہنے لگا

تھا۔ پہلے میں اس سے ہر بات کر لیتی تھی۔ مگر اب تو کوئی بات کہنے سے پہلے خود مجھے دس دفعہ سوچنا پڑتا تھا۔ لیکن آج میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ آفس سے آجائے تو اس سے بات کروں گی۔ کیونکہ دادی جان کو بھی اس نے ٹال دیا تھا۔

رات کو کافی بنا کر اپنے کمرے میں لانے کے بجائے میں وہیں اس کے اسٹڈی روم میں چلی گئی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مجھے باتیں کرنے کے لیے تمہید کا سہارا لینا پڑا ہو۔ لیکن آج میری زبان بار بار اٹک رہی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے؟ جو بات ہے' بتاؤ!" اس نے ڈپٹ کر کہا۔ تو میں نے جلدی سے کہا۔

"ارتضیٰ! تمہیں پتا ہے' ماہ نور کہاں ہے؟"

"کیوں' تمہیں نہیں معلوم کیا؟" اس کا لہجہ اب بھی لاتعلقی لیے ہوئے تھا۔ میرے دل کو تکلیف تو بہت پہنچی لیکن میں نے نظر انداز کر دیا۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہاری اس سے فون پر بات ہوئی ہے کیا؟"

"میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ میں اسے فون کرتا پھروں۔"

بالآخر ضبط مجھ سے رخصت ہونے لگا۔ خود کو پڑھائے گئے سارے سبق بھول کر میں نے تلخ لہجے میں اسے یاد دلایا کہ ماہ نور اس کی منگیتر ہے۔

"اچھا! جن لوگوں نے اسے میری منگیتر بنایا ہے۔ ان ہی لوگوں سے خیریت بھی لے لو۔" وہی سرد لہجہ۔ اس کو تو میں کیا کہتی۔ جی چاہا کہ قریب رکھا پیپر ویٹ اٹھا کر اپنے سر پر مار لوں۔ میں غصے میں جانے کے لیے مڑی۔ تو اس نے ایک دم روک لیا۔

"بات تو پوری کر جاتیں۔"

"اور کیسے بات پوری کی جاتی ہے؟ اور اس طرح بی ہیو کرنا' تمہاری تو کبھی بھی ایسی عادت نہیں تھی۔"

"پہلے ایسے حالات بھی نہیں تھے۔ مجھے تھوڑا وقت لگے گا۔ شاید پھر میں بھی صحیح ہو جاؤں۔" وہ یہ کہنے کے بعد خاموش ہو گیا اور میں بھی چپ رہ گئی۔

ہر دفعہ گھوم پھر کر کوئی ایسی بات سامنے آجاتی۔ جس کے نہ آغاز کا مجھے پتا ہوتا تھا اور نہ انجام کا صرف ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ بے شک دل کو جتنا کوڑے مار کر اپنے حق میں کرنے کی کوشش کر لو وقت آنے پر وہی سب سے پہلے بے مہر بن جاتا ہے۔

"اور کتنا وقت ارتضیٰ؟" میں نے ہی اس بے مہر خاموشی کو توڑا۔ "دو مہینے ہو گئے ہیں تمہاری اور ماہ نور کی منگنی کو اور آج بھی تمہیں اس کی پروا نہیں ہے۔ ماہ نور نے اب تک زندگی کو تلخیوں اور پریشانیوں میں گزارا ہے اور اگر تم ایسی راہ پر چلتے رہے۔ تو شاید اس کی آگے کی زندگی بھی اسی طرح گزرے۔" میں نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"تم بتا دو! تمہیں کس وقت چلنا ہے۔ میں لے جاؤں گا۔" اس کے لہجے میں نرمی کا تاثر تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دوسرے دن جانے کا طے کر لیا۔

☼ ☼ ☼
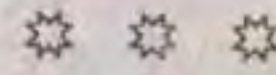
حیدر آباد جاتے جاتے سب سچ مچ پسینے پسینے ہو گئے۔

"کتنی گرمی پڑتی ہے حیدر آباد میں۔" فارس نے دوپٹے سے چہرے کو ہوا دی۔

"اچھا! اب زیادہ گرمی کا شور نہیں مچاؤ۔ یہاں بھی انسان ہی بستے ہیں۔" ارتضیٰ نے ڈانٹا۔

اور جس وقت ہم لوگوں نے ماہ نور کو دیکھا۔ اتنے حیران ہوئے کہ ہمارے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں سکا اس کا گلابی رنگ سنولا گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں کھردرے اور سخت لگ رہے تھے۔

"ماہ نور! سب خیریت تو ہے نا؟" فارس بھی فکر مند ہو گئی۔ ارتضیٰ کے چہرے پر بھی پریشانی تھی۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے

بولی۔

"حمنہ کی طبیعت خراب ہے۔ اور چچی جان کو تو گٹھیا کا مرض ہے۔ سارے گھر کی ذمہ داری مجھ پر آپڑی ہے۔"

"لیکن تمہارا سمسٹر ڈراپ ہو جائے گا۔ اس طرح تو پانچ سال میں بھی بی اے نہیں کر سکو گی۔" مجھے غصہ آنے لگا۔ "تم نے یہ بتایا تھا اپنے چچا جان کو؟"

"چچا خود اتنے پریشان ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔ مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس رہنے دو' پچھلی مرتبہ جب ہم لوگ آئے تھے تو ان کے پاس ایک گاڑی تھی۔ آج دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ تو پھر کس بات کی پریشانی؟ تمہاری فیس کے متعلق انہوں نے کیا فرمایا ہے؟ وہ بھی بتا دو۔"

"تمیز سے۔" ارتضیٰ نے تنبیہہ کی۔

"جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں' میں ان کا ادب اور احترام نہیں کر سکتی۔" میرا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"میں نے چچا جان سے دکان کے کرائے کی بات کی تھی کہ آپ اس میں سے میری فیس دے دیں۔ تو انہوں نے کہا کہ حالات کی وجہ سے دکان نقصان میں جا رہی ہے۔ الٹا ان پر قرضہ چڑھ گیا ہے۔" اس نے سر جھکا کر اتنی آہستہ آواز میں بتایا۔ گویا سارا اسی کا قصور ہو۔

"یہ اتنی دیر سے میں کس فیس کی بات سن رہا ہوں؟" ارتضیٰ نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"ماہ نور کے سیکنڈ سمسٹر کی فیس۔" میں نے اسے بتایا۔

"پرسوں فون آیا تھا یونیورسٹی سے' میں نے کل ہی جمع کروا دی ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تو تم یہ بات کل نہیں بتا سکتے تھے؟" فارس جھنجلائی۔

"یہ کون سی ایسی بات تھی۔ جو میں ڈھول پیٹ کر بتاتا اور پھر دوسری بات یہ کہ تم تینوں کے ذہنوں میں کیا چل رہا ہوتا ہے' اس کا علم مجھے کیسے ہو سکتا ہے۔"

"چلو! اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔" میں نے چٹکی بجائی۔ "اب واپس کراچی چلو۔"

"چچا' تایا وغیرہ نہیں جانے دیں گے۔" اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"مگر کیوں؟" مجھے غصہ آگیا۔

"حمنہ کی طبیعت۔۔۔" اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔ "ابھی وہ صحیح طرح چل پھر بھی نہیں سکتی۔۔۔ تو اس طرح اچھا نہیں لگتا۔" وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہم لوگوں کو چپ ہونا پڑا۔

"چلو! ٹھیک ہے۔ پندرہ بیس دن میں۔ دادی جان اور ارتضیٰ آکر تمہیں لے جائیں گے۔"

ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت اس کی چچی آگئیں ارتضیٰ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ماہ نور پر چبھتی ہوئی۔

"ایک گھنٹہ ہو گیا ہے تمہیں یہاں بیٹھے ہوئے۔ مہمان آئے تھے۔ ان کے کھانے کی فکر تو کر لیتیں۔" انہوں نے آتے ہی ماہ نور کو سنایا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔

"چچی جان! ہم لوگ یہاں ماہ نور سے ہی ملنے آئے ہیں اور رہی کھانے کی بات تو ابھی جاتے ہوئے ہوٹل سے کھا لیں گے۔ اس کی فکر نہ کریں۔"

"نہیں بھئی آخر کو داماد پہلی دفعہ آئے ہیں۔ ایسے کیسے بھیج دیں۔" داماد کے لفظ پر ارتضیٰ کے تاثرات بگڑ گئے۔

"چچی جان! ماہ نور کو آپ لوگ کب تک بھجوا دیں گے؟ دادی نے بلوایا ہے۔"

"ہمارا تو کوئی ارادہ نہیں ہے اسے بھجوانے کا۔ تھوڑے دنوں کے لیے تم لوگوں کے پاس کیا گئی۔ ماشاء اللہ سے تم لوگوں نے اسے اپنے جیسا بنا لیا۔ اپنے چچا سے کہہ رہی ہیں کہ دکانوں کے کرائے سے ان کی فیس دی جائے۔" چچی کا انداز طنزیہ تھا۔

"تو آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟" میں نے فارس کی نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ "فیس مانگنے پر یا دکان کے کرائے سے فیس مانگنے پر؟ اور دونوں میں کوئی ایسی غلط بات نہیں۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ ماہ نور کو آپ لوگ زبردستی نہیں رکھ سکتے۔ یہ

وہیں پڑھے گی اور وہیں سے اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

"ایسے کیسے ہو جائے گی۔" چچی نے جھنجلا کر کہا۔

"تاکہ کل کو جہیز کے لیے بھی کہہ دو کہ دکان کے کرائے۔"

"پلیز! آپ سب لوگ خاموش ہو جائیں۔" ارتضیٰ نے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اور فارس گرتے پڑتے اس کے پیچھے بھاگے۔ ہمیں لگا کہ کہیں وہ ہمیں چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے۔ اس کا غصہ اسی قسم کا تھا۔

"تم لوگوں نے مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟" ہمارے گاڑی میں بیٹھتے ہی ارتضیٰ برس پڑا۔

"ہم نے تو کہا تھا۔ کہ ارتضیٰ سب کچھ کر لے گا۔ لیکن ان محترمہ کے اندر بھی خودداری کے جراثیم بہت زیادہ ہیں۔ اس نے کہا۔ میں ابھی ارتضیٰ کی ذمہ داری نہیں ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"ٹھیک کہا تھا اس نے۔ میرا ہی دماغ خراب ہے۔ ویسے تم لڑکیوں کا دماغ زیادہ خراب ہوتا ہے۔ ہر وقت عزت بے عزتی، خودداری، ان چکروں سے اپنی زندگی کو نکال نہیں سکتیں کیا؟" ارتضیٰ نے گیئر بدلتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہارا خیال اپنی جگہ درست ہے۔ مگر ایک لڑکی کی زندگی میں ان لفظوں کی اہمیت ضرور ہونی چاہیے ورنہ۔" ارتضیٰ نے غصے سے میری بات کاٹ دی۔

"شٹ اپ! کوئی ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر فارس نے مجھے آنکھ کے اشارے سے چپ کرا دیا۔

"وہ غصے میں بھوت بنا ہوا ہے۔ وہ سوچ رہا ہو گا۔ اس کی زندگی میں دو لڑکیاں ہیں اور اتفاق سے دونوں ہی نیم پاگل ہیں۔" فارس نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میں اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

آج بڑی تھکن ہو گئی تھی۔ یہ وہ تھکن تھی۔ جو ہر روز سے کہیں زیادہ تھی۔ آج اسے وہ سب لوگ لینے آئے تھے۔ جنہیں اس کی زندگی میں ایک خاص مقام تھا ان لوگوں کے جانے کے بعد چچی جان نے اسے بہت ڈانٹا تھا اور جو چیز روزانہ تکلیف سے برداشت ہوتی تھی، آج اس نے خوشی خوشی برداشت کی تھی۔ چچی کیا کچھ بولتی رہیں۔ اس کے کانوں نے کچھ نہیں سنا۔ حمنہ کو کھانا پسند نہیں آیا۔ اس نے پوری ٹرے الٹ دی۔ اس بات پر بھی ماہ نور کو زیادہ غصہ نہیں آیا۔

جاتے وقت حوریہ نے چپکے سے اپنا سیل اسے تھما دیا تھا۔ جسے اس نے اسی وقت چھپا لیا تھا۔

لیکن اس پورے دن کی خوشی کو چچا جان نے خراب کر دیا، وہ بہت گرجے۔ ان کا خیال تھا کہ اس نے ان لوگوں کو بلایا ہے۔

"میں کیوں بلاؤں گی۔ جبکہ مجھے ابھی جانا بھی نہیں ہے؟" اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"ابھی نہ آئندہ کبھی..... چھ مہینے میں ایڈمیشن بھی لے لیا..... اور پھر فیسوں کا تقاضا..... پیسے درخت پر لگتے ہیں کیا؟ اس کے بعد منگنی کا شوشا تمہارے ننھیال میں سب ہی لوگ بہت چالاک ہیں۔ سارے کام پلاننگ سے ہو رہے ہیں۔" وہ اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ سناتے رہے۔

ماہ نور کمرے میں آ گئی۔ اس کے لیے ان کا یہ رویہ نیا نہیں تھا۔ مگر دل کو تکلیف ہمیشہ نئے سرے سے ہی ہوتی تھی۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی۔ پتا نہیں انسان کا دل سب چیزوں کا عادی کیوں نہیں ہو جاتا۔ زندگی پہلے جبر کی طرح نہیں لگتی تھی۔ مگر اب جبر لگنے لگی تھی۔ آنکھوں کو روشنیوں کا عادی ہونا ہی نہیں چاہیے۔

روشنیوں پر اسے ایک دم ارتضیٰ کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ جب وہ کراچی گئی تھی اور اس نے ارتضیٰ کو دیکھا تھا۔ تو جو چیز اسے سب سے زیادہ اچھی لگی تھی۔ وہ ارتضیٰ کی آنکھیں تھیں۔ شوخ اور چمکتی ہوئی۔ روشن آنکھیں۔ لیکن اب اسے لگتا تھا کہ ان آنکھوں کی روشنی کہیں گم ہو گئی ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے۔ وہ سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

کل مجھے اسائنمنٹ جمع کروانا تھا۔ میں تندہی سے نوٹس میں سر گھسائے اسے پڑھ رہی تھی کہ ایک دم وہ بھاگتی ہوئی اندر آئی۔

"حوریہ! تم نے کچھ سنا؟"

"کیا ہوا؟" میں ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی بڑی بات ہو گی۔ ورنہ فارس اس طرح گھبرائی نہیں تھی۔

"ماہ نور کو ٹارگٹ کلنگ میں گولی لگ گئی ہے۔ وہ اپنی چچی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی حمنہ کو لے کر۔"

"کیا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اب یہ مت کہو! سب ہی کچھ ہو رہا ہے۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔

دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ سب ہی لوگ پریشان تھے۔ ابھی فی الحال دادی جان کو نہیں بتایا تھا۔ لیکن کب تک؟ بتانا تو تھا۔

اب کے حیدر آباد کا سفر خاموشی کا سفر تھا۔ ہم سب ہی لوگ بہت چپ تھے۔ صرف تائی جان تھوڑی تھوڑی دیر بعد ارتضیٰ سے کچھ پوچھ لیتی تھیں۔ اور ارتضیٰ بھی "ہوں ہاں" میں جواب دے کر چپ ہو جاتا۔

"ہم پچھلے ہفتے ہی تو گئے تھے کاش! اسی وقت ضد کر لیتے..... زبردستی اسے لے آتے۔ تو یہ حادثہ تو نہیں ہوتا۔" فارس کے لہجے میں افسوس تھا۔

"جن حادثوں کو ہونا ہوتا ہے، وہ تو ہو ہی جاتے ہیں کب اور کیسے، سب ہی کچھ تو طے شدہ ہوتا ہے۔" آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار حلق میں اٹک جاتی تھی۔

ایک نظر میں نے ارتضیٰ کے چہرے کی طرف ڈالی۔ آج پہلی دفعہ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ لیکن پریشان تو ہم سب ہی تھے اب آگے کیا ہو گا۔ کسی کو کچھ بھی پتا نہیں تھا۔

ماہ نور کو دیکھا۔ اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا گلابی رنگ بالکل زرد تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ گولی ٹانگ میں لگی تھی۔ کافی خون ضائع ہوا تھا ہم میں سے کوئی بھی اسے نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا۔

"اتنے سارے لوگ تھے۔ کسی کو بھی گولی نہیں لگی۔ کراس فائرنگ کی زد میں اسی کو آنا تھا۔ جس کی زندگی میں پہلے ہی کوئی خوشی نہیں تھی۔

اور اللہ نہ کرے کہیں یہ عمر بھر کو معذور ہو گئی تو؟" میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ارتضیٰ ڈاکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ ماہ نور کی چچی، تائی جان سے کہہ رہی تھیں کہ "اس مہنگائی کے زمانے میں ہاسپٹل اور ڈاکٹر بندے کو مار دیتے ہیں۔ اس قدر خرچا ہو رہا ہے کہ کیا بتاؤں۔"

مہنگائی پر باتیں کرنا تو تائی جان کا بھی پسندیدہ موضوع تھا۔ لیکن مجھے اور فارس دونوں کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ باتیں ماہ نور کے حساس دل کو کس طرح زخمی کر رہی ہوں گی۔ دو دفعہ فارس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ہمیں ان کی چچی کو یاد دلانا پڑا کہ جب ہم لوگ ماہ نور کو لینے آئے تھے۔ آپ اس وقت جانے دیتیں۔ تب شاید ایسی صورت حال پیدا ہی نہیں ہوتی۔

"بات تو تب بھی وہی تھی بی بی! اس وقت بیگم صاحبہ کو فیس کے پیسے چاہیے تھے۔"

"آپ لوگوں کو صرف پیسے نظر آ رہے ہیں، یہ نہیں سوچ رہے ہیں کہ خدانخواستہ اگر وہ معذور ہو گئی.....؟ تو پھر زندگی بھر اسے بیٹھ کر سنبھالتے رہیے گا۔"

ارتضیٰ اس وقت اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر میں نے جلدی سے اپنا منہ بند کیا۔ لیکن پھر بھی اس نے کچھ نہ کچھ تو سن ہی لیا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے کے تاثرات فوراً" بدلے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا حوریہ کہ تمہیں ہر جگہ

سے برائیاں سمیٹنے کا شوق کیوں ہے؟" وہ میرے قریب آکر آہستہ سے غرایا۔ اس کی بات صرف میں نے ہی سنی میں ڈر گئی۔

"مگر میں صحیح بات کر رہی تھی۔" میں منمنائی۔

"ایک تو تم اور تمہاری صحیح بات' اب خاموش رہنا۔ ماہ نور کو لے جانے کی بات بالکل نہیں کرنا۔ آیا سمجھ میں؟"

اور یہ بالکل پہلی دفعہ تھا کہ مجھے ارتضٰی پر حیرت ہوئی تھی۔ آخر وہ اس طرح کیسے کر سکتا تھا منگیتر ہونے کے ناتے' انسانیت کے ناتے' میں تو اس سے کہنے والی تھی کہ ماہ نور کو کراچی لے جاتے ہیں۔ مجھے حقیقتاً" ارتضٰی پر افسوس ہوا تھا۔ لیکن اب میں اس سے پہلے کی طرح لڑ کر باتیں نہیں سنا سکتی تھی۔

ماہ نور کو بہت ساری تسلیاں دینے کے بعد جب ہم ہاسپٹل سے باہر نکلے تو شام ڈھلنے کو تھی۔ وہاں اس جگہ ماہ نور کے پاس بہت کچھ ایسا تھا۔ جسے ہم اس کے پاس ہی چھوڑ کر جا رہے تھے۔

احساس تنہائی' درد کی چبھن' تکلیف' چچی کی طنزیہ باتیں اور شاید کچھ اور بھی ایسا' جسے ہم نہیں سمجھ سکے تھے۔

واپسی کا سفر پہلے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ تائی کافی چپ تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے انہوں نے باتوں کا سارا اسٹاک ختم کر لیا ہو اور اب بولنے کو کچھ نہیں رہا ہو۔

"یہ پریشان ہیں کہ اب اپنے بیٹے کی منگنی کو کس خانے میں فٹ کریں گی۔" فارس نے مجھے ٹیکسٹ کیا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ ورنہ بتا دو کہ ابھی پٹنا ہے یا گھر جا کر۔" اس جملے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کی بک بک بند ہو گئی۔

"ویسے کیا ہم ماہ نور کو لے کر نہیں آسکتے تھے؟ مجھے اسے دیکھ کر بڑی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ کتنی پھرتیلی اور کرنے کام والی لڑکی تھی۔ علم حاصل کرنا اس کے لیے وبال جان ہو گیا۔" فارس کو افسوس ہوا۔

"اچھا! اب تعلیم کو کچھ نہیں کہو۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔

"ہمیں کچھ عادت ہو گئی ہے۔ اپنی غلطیوں یا کوتاہیوں کو کسی نہ کسی جگہ ایڈجسٹ کرنے کی اور جہاں تک اس کو کراچی لانے کی بات ہے۔ دیکھو! سارے بڑے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔" میں اسے بتاتے بتاتے رک گئی کہ ارتضٰی نے مجھ سے اسپتال میں کیا کہا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ اب تائی جان اس منگنی کو قائم رکھیں گی۔ وہ تو نارمل لوگوں سے بھی خوش نہیں رہ پاتیں۔ یہ تو پھر ان کے لیے بڑا جھٹکا ہو گا۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ ہو سکتا ہے ایسا کچھ بھی نہ ہو۔" کبھی کبھی ہم دوسروں سے زیادہ خود کو تسلی دے رہے ہوتے ہیں۔ میرا بھی یہی معاملہ تھا۔ میں فارس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی ہاں سارے معاملے میں صرف ایک بات خوش آئند تھی۔ کہ تائی جان کچھ بھی کر لیں۔ ابھی دادی زندہ ہیں اور تائی اپنی من مانی نہیں کر سکتی ہیں۔

☼ ☼ ☼
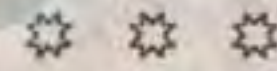
ہم لوگوں کے مڈ ٹرم بھی شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے ساری باتوں کو دماغ سے نکال کر پڑھائی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ماہ نور سے فون پر اب بات چیت ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹروں نے گھر جانے کی اجازت تو دے دی تھی مگر ابھی وہ زیادہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ گولی نے اس کی ہڈی کو نقصان پہنچایا تھا اگر وہ دواؤں سے ٹھیک نہیں ہوتی تو پھر آپریشن کرنا پڑتا۔ ہم لوگ اسے یہاں سے تسلی ہی دے سکتے تھے۔ سو وہی کرتے تھے۔ لیکن وہ دن بدن زیادہ حساس ہوتی جا رہی تھی۔

"حور جی! زندگی بڑی مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ میرے پاس کچھ بھی ایسا نہیں جس کی وجہ سے میں کسی کے لیے اہم ہوں۔ میرے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔"

"یہ دعوا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے دنیا کا کون سا کام رک جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کو چھوڑو جتنا جینا ہے' اچھا جینا ہے۔" میں اسے تسلی دیتی۔

"دوسروں کی باتیں سہنا آسان نہیں ہوتا۔ سچ میں یہاں اب لیٹے لیٹے سوچتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ آپ بڑی بہادر ہیں۔"

"اچھا!" میں ہنس پڑی۔ "عرف عام میں بہادر کو ڈھیٹ کہا جاتا ہے۔ مجھے بھی کچھ ایسے ہی لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے۔"

"ان لوگوں کی آنکھیں نہیں ہیں۔"

"آنکھیں ہونا اتنا ضروری نہیں ہے.... جتنا دل اور عقل کا ہونا۔ وہ انسان کے پاس ضرور ہونی چاہیے۔ خیر تم بتاؤ! کیا کرتی رہتی ہو۔ لیٹنے کے علاوہ۔" میں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"میرے پاس کچھ اور کرنے کو رہ گیا ہے کیا؟" اس نے الٹا مجھ سے ہی پوچھ لیا۔

"ماہ نور! اپنے اوپر ترس نہیں کھاؤ۔"

"میں نہیں کھاتی اپنے اوپر ترس' یہاں پر بہت سارے ایسے لوگ ہیں۔ جو یہ کام بخوبی کر لیتے ہیں اور وہ ترس بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی طنز کے پردوں میں لپٹا ہوا۔ کبھی حقارت کی تہوں میں چھپا ہوا۔ میں نے زندگی میں بڑے خواب دیکھ لیے تھے حور جی! اپنی آئندہ زندگی کے حوالے سے' اپنی تعلیم مکمل کرنے کے حوالے سے۔ مستقبل ایک دم بہت روشن اور چمک دار ہو گیا تھا۔ پلکوں تلے صرف اور صرف چمکتے خواب... مگر پتا نہیں قسمت کو خوابوں سے کیا دشمنی ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں رہنے دیا اس نے اور اب میں صرف مرنا چاہتی ہوں۔" وہ باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔

میرے اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ کبھی کبھی حوصلوں کو بڑی مشکل سے اکٹھا کرنا پڑتا ہے اور اب اس کے لیے اپنے حوصلوں کو آزمانا تھا۔

"ماہ نور! تم ہم لوگوں کے پاس کراچی آجاؤ۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ارتضٰی کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حد ہو گئی تھی بے حسی کی۔ ایسی امید تو کبھی بھی ارتضٰی سے نہیں رہی تھی۔ "اور میرا نہیں خیال کہ اب تمہیں کوئی روکے گا۔"

"اب کوئی نہیں روکے گا۔ میں اب کسی کے کام کی نہیں رہی نا۔" اس کے لہجے میں بے حد مایوسی تھی۔

"پھر وہی فضول بات۔ ہمت کو آزماؤ دیکھو! یہ تمہیں کہاں تک لے کر جا سکتی ہے۔"

پھر اس سے تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد بلکہ سمجھانے کے بعد میں ارتضٰی کی طرف آگئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے میری اتری شکل دیکھ کر لیپ ٹاپ بند کیا۔

"میں بہت پریشان ہوں ارتضٰی!"

"کوئی نئی بات کرو۔ تم ہمیشہ ہی پریشانیاں لے کر آتی ہو۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"ارتضٰی پلیز۔ مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرو۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"تم مجھے جانتی ہو حوریہ! میں ایسا نہیں ہوں اور نہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہوں۔ لیکن ہر چیز اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ خیر! چھوڑو ان باتوں کا اب فائدہ بھی کیا۔ بتاؤ! کیا پریشانی ہے۔"

"میں نے تمہارے منع کرنے کے باوجود بھی ماہ نور کو کہہ دیا کہ ہم لوگ اسے کراچی لے آتے ہیں۔ وہ وہاں بہت تکلیف میں ہے۔ تم ان لوگوں کا مزاج جانتے تو ہو۔ اب ڈانٹنا نہیں۔"

"اور تمہیں جیسے میری ڈانٹ کی بڑی پروا ہے نا۔ چلو! تم نے اچھا کیا۔"

"تو پہلے کیوں منع کیا تھا؟" میں الجھ گئی۔

"اس لیے کہ اب ہم اپنی شرائط پر ماہ نور کو واپس لے کر آئیں گے کہ وہ اب واپس وہاں نہیں جائے گی۔ ان لوگوں کے درمیان جو آج اسے ایک ناکارہ بوجھ کی طرح اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ فیصلہ اب ان لوگوں کو کرنا ہو گا اور جو کچھ بھی ہو گا۔ ماہ نور کے حق میں ہو گا۔ تم پریشان نہ ہو اور مجھے چائے کا ایک کپ بھجوا دینا' سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی

تھیں۔ جس پر میں نے پہلے دھیان نہیں دیا تھا۔

"تم اب بہت چائے پینے لگے ہو۔ ارتضٰی! یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

زندگی میں ایک بری بات یہ بھی سہی۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"اور ایک بات اور ارتضٰی! اگر تم تھوڑے سے بھی ٹھیک ہو جاؤ تو میں خود کو مجرم سمجھنا چھوڑ دوں گی۔" میں نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

"اور میں ایسا نہیں چاہتا۔" اس نے بغیر اسکرین سے نظریں ہٹائے مجھے جواب دیا۔ "تمہیں احساس ہونا چاہیے ایک ساتھ تین لوگوں کی زندگی برباد کرتے ہوئے۔۔۔ کچھ تو ایسا ہو جو تم بھی محسوس کرو۔"

"کیا کرتے تم ارتضٰی! زندگی کو میرے لیے مشکل ہی بناتے نا اور ان سب چیزوں کے باوجود بھی تائی جان نہیں مانتیں۔ اتنا تو میں بھی ان کو جان گئی ہوں۔"

"وہ میرا مسئلہ تھا۔ تمہارا نہیں اور میں تمہاری زندگی بھی مشکل نہیں بناتا۔ اتنا تو تم مجھے بھی جانتی ہی ہوتا۔"

"اب سب کچھ جان گئی ہوں۔ اپنے مقدر کے سوا۔ بس اس کی خبر نہیں ہو سکی۔" میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور باہر آ گئی۔

دوسروں کو ہم کتنی نصیحت کرتے ہیں۔ بہادر بننے کی مضبوط نظر آنے کی اور جب خود پر بات آتی ہے تو نہ ہم بہادر نظر آتے ہیں اور نہ ہی مضبوط اور اپنے دل میں پڑے واہموں اور اندیشوں کی وجہ سے زندگی کو بھی نہیں آزماتے۔

"اب جو کچھ ہو چکا' وہ نہ واپس آ سکتا ہے۔ نہ پلٹ سکتا ہے۔" بے آواز گرتے ہوئے آنسوؤں کی دھند میں میں نے سوچا۔ "جو کچھ پیچھے ہو چکا ہے۔ تقدیر جو کچھ لکھ چکی ہے۔ وہ اب مٹ نہیں سکتا اور شاید یہ اب خیانت بھی ہو۔ اس لڑکی کے ساتھ۔ جو پہلے ہی وقت و حالات سے لڑ رہی ہے۔" یہ سوچتے ہی میں نے اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑ ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

اب سارے مہرے پلٹ چکے تھے۔ ہم لوگوں کو ماہ نور کے ساتھ بڑا دماغ لگانا پڑا اور وہ صحیح بھی ہو گئی۔

وہ جو اسے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کبھی دوبارہ شروع نہیں ہو پائے گی۔ تو وہ نئی زندگی بھی بالآخر شروع ہو ہی گئی۔ ہاں اس چکر میں یہ ضرور ہوا کہ میری پڑھائی بھی ڈسٹرب ہوئی اور میرے نمبرز بھی خراب آئے۔

"اگلے سمسٹر میں زیادہ محنت کر لوں گی۔" میں نے فارس کو تسلی دی۔

"تم اپنی پڑھائی کو ٹائم دو۔ ماہ نور اب بہتر ہو گئی ہے۔ اپنا خیال رکھ سکتی ہے۔"

"اس میں ماہ نور کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں خود ہی بہت ڈسٹرب رہی۔"

"ہاں! جیسے ہماری آنکھیں تو ہیں نہیں اور تم ڈسٹرب کیوں رہیں حوریہ؟"

"پتا نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

بعض سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا جیسے فارس کا یہ سوال۔۔۔ اس کے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ سو میں نے بات ہی پلٹ دی۔

"فارس! کل تم ماہ نور کو فزیو تھراپسٹ کے پاس لے جانا اور پوچھ لینا کہ اب اور کتنے دن آنا ہے میں نہیں جاسکوں گی۔ لگ رہا ہے مجھے بخار آنے والا ہے۔"

"تمہیں بخار ہو رہا ہے؟" فارس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم بالکل اپنا خیال نہیں رکھ رہی ہو۔ میں تمہارے لیے چائے اور کوئی دوا لے کر آتی ہوں۔" وہ فکر مند ہو گئی۔

"نہیں دوائی نہیں۔ پچھلی دفعہ بھی میرے حلق میں اٹک گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو گئی تھی۔"

"ضروری نہیں کہ جو ایک دفعہ ہو چکا ہو۔ دوبارہ بھی ہو۔" فارس نے ڈپٹا "تم ٹیبلٹ منہ میں رکھتے ہی فوراً "پانی پی لینا۔"

"بس مجھے یہی ڈر تھا۔" میں نے منہ بنایا۔ "تمہیں پتا ہے مجھے دو دن سے بخار تھا۔ مگر اس دوائی کی وجہ سے میں برداشت کر رہی تھی۔" میں نے منہ بنایا۔

"حد ہو گئی۔ اپنے اوپر ظلم کرنے کا تمہیں بڑا شوق ہے۔" ابھی آدھا جملہ اس کے منہ میں تھا کہ ماہ نور اندر داخل ہوئی۔ اس کی چال میں ابھی بھی واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ بہت دیر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتی تھی۔

شروع میں یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ بہت گھبرائی تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ سب لوگ میری طرف گھور گھور کر دیکھیں گے۔"

"تو منع کر دینا کہ گھور گھور کر نہیں دیکھیں۔" فارس نے سادہ سا حل پیش کیا۔ "ایسے ہی دیکھ لیا کریں۔۔۔ سرسری سا۔"

"بس! آپ ہر بات کا مذاق نہیں اڑایا کریں۔ حور جی! آپ بتائیں۔ میں کیا کروں۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

فارس' زینی' ارتضٰی ہم سب ہی لوگ اس کو معذوری اور بے چارگی کے اس فیز سے نکالنا چاہ رہے تھے اور کسی بھی حادثے کے اثرات اتنی جلدی کہاں جاتے ہیں۔ بڑا وقت لگتا ہے۔ ان کو بھولنے میں بھلانے میں۔ پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر تھی مگر نارمل سے ابھی بھی بہت دور۔

ارتضٰی نے اسے لا کر میرے حوالے کیا تھا۔

"حوریہ! آج دوسری دفعہ میں نے اسے غور سے دیکھا ہے۔ پہلی دفعہ ہاسپٹل میں دیکھا تھا۔ یہ تو مجھ سے کافی چھوٹی ہے۔ عمر کے لحاظ سے بھی اور شاید ذہنی لحاظ سے بھی۔ اور جس رشتے کو توڑنا پہلے مجھے آسان لگ رہا تھا اس کی حالت دیکھ کر تو وہ فیصلہ کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ بہت پریشان ہو گیا ہوں۔"

"پریشان ہونا چھوڑ دو ارتضٰی! مجھے لگ رہا ہے ان شاء اللہ ماہ نور بالکل صحیح ہو جائے گی۔ مگر تمہارا یہی حال رہا تو مجھے ڈر ہے کہ تم ضرور اپنے آپ کو کچھ کر لو گے۔" مجھے اس کی فکر ہوئی تھی۔

"تو خوش ہو جانا۔ سب کچھ تمہارے حسب منشا ہی ہو گا۔" اس کا لہجہ پھر تلخ ہو چلا تھا۔

اور میری سزا ختم نہیں ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور یونیورسٹی سے آ کر بڑے مزے مزے کے قصے سناتی تھی۔ اس نے بھی شاید وقت و حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ پہلے کے مقابلے میں لوگ بھی سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ ماہ نور کو سب لوگ نارمل ہی لیتے۔ کوئی ہمدردی نہیں کرتا اور یہ چیز اس کے لیے بڑی بہتر ثابت ہو رہی تھی۔ ہم لوگ بھی کوئی رعایت نہیں کرتے تھے' جو کچھ وہ کر سکتی تھی' وہ سارے ہی کام اس سے کرواتے۔ وہ دوبارہ سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر دوبارہ سے گلابی رنگ کھلنے لگا تھا۔

مگر اب تائی جان کا رویہ اس کے ساتھ عجیب ہو گیا تھا۔

بعض لوگوں کی فطرت میں تحکم' جلد بازی اور خود غرضی۔ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنا شامل ہوتا ہے وہ سب کچھ اپنی خواہش' خوشی کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں دوسروں کی مرضی خواہش اور خوشی ان کے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔

جیسے تائی جان مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ پہلے انہوں نے اپنی مرضی چلائی۔ جب ارتضٰی اس منگنی پر راضی نہیں تھا اور جب ان کی خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو انہوں نے ماہ نور سے بے زاری اور لاتعلقی کا رویہ اختیار کر لیا۔

اور۔۔۔ ایسا صرف اس لیے تھا کہ ابھی وہ اپنے معاملات زندگی کو پہلے کی طرح نہیں چلا سکتی تھی لیکن یہ حادثہ تو شادی کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔

تو کیا اس وقت وہ ارتضٰی کو علیحدگی کا مشورہ دیتیں؟

میں جتنا اس موضوع پر سوچتی۔ اتنا ہی الجھ جاتی۔ لیکن ایک بات جس سے دل مطمئن ہو جاتا تھا۔ وہ ارتضٰی کا رویہ تھا۔ انسانوں کے اندر بہت ساری کمزوریاں' خامیاں ہوں۔ مگر انسانیت ہو ضرور اور اچھی بات تھی کہ ارتضٰی میں یہ خصوصیت بہت زیادہ

تھی۔ اس نے کہا تھا' پہلے وہ خود رشتہ توڑنا چاہتا تھا۔ اب مشکل ہو گیا ہے۔
اور مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ ڈراما کب تک چلے گا بی بی؟"
میں اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھی۔ جب تائی جان نے ایک دم تلخ آواز میں کہا۔
"جی! کون سا ڈراما؟ ٹی وی تو بند ہے۔" میں نے سر اٹھا کر تعجب سے کہا۔
"کب تک ان ڈاکٹروں کا خرچا برداشت کرنا پڑے گا؟"
"کون سے ڈاکٹر تائی جان؟" کہتے ہی میری نگاہ فزیو تھراپسٹ پر گئی۔ وہ ماہ نور کو ایکسر سائز کروا رہی تھی۔
اب اس سوال کا میں کیا جواب دیتی۔ اس لیے خاموش رہی۔
"مجھے سب سمجھ میں آرہا ہے۔" ان کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔ کیا سمجھ میں آرہا ہے یہ تو میں ان سے نہ پوچھ سکی لیکن اتنا تو کہہ ہی دیا۔
"تائی جان! آپ کی بہو کا علاج ہو رہا ہے۔"
"بہو؟" ان کے تاثرات ایسے بگڑے کہ مجھے حیران ہونے کا موقع بھی نہ مل سکا۔
"میرے اتنے اچھے بیٹے کے لیے یہی معذور لڑکی رہ گئی ہے؟" وہ تنک کر بولیں۔
"تائی جان!" میں لرز کر رہ گئی۔ "کچھ تو اللہ سے ڈریں۔ وہ معذور نہیں ہے اور جو بھی کمی رہ گئی ہے۔ وہ دور ہو جائے گی اس کا علاج ہو رہا ہے۔"
"علاج ہو رہا ہے یا میرے بیٹے کے پیسوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ اس کے سگے رشتہ دار اس کا پیسہ دبائے میں بیٹھے ہیں۔ بھئی! ان سے پیسوں کا تقاضا کیوں نہیں کرتے؟"
"تو سوتیلے تو ہم لوگ بھی نہیں ہیں اور بے فکر ہو جائیں! سب کچھ دادی جان نے کیا ہے۔"
"مجھے بے وقوف مت بناؤ اور میں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے، بہت پر نکلتے جا رہے ہیں۔ ہر وہ کام جس سے منع کیا جاتا ہے تمہیں وہ ضرور کرنا ہوتا ہے۔ تمہاری حرکتیں تمہارے تایا اور دادی کو تو نظر ہی نہیں آتیں لیکن میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔"
"مگر کون سی حرکتیں' کچھ پتا تو چلے۔" میں الجھ گئی۔
"کل تم گاڑی لے کر کیوں باہر گئی تھیں؟"
"مجھے کچھ کام تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"ایسا کیا کام تھا جو بتایا نہیں جا سکتا۔ تمہیں تو صرف اس گھر کے اصولوں کو توڑنا ہے اور بس۔" وہ اب چھوٹی سی بات کو اچھال رہی تھیں۔
"انسانوں کو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ اصول انسانوں کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی تائی جان یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔"
"اور بڑی بات کیا ہوتی ہے بی بی! کیا گھر سے بھاگ جانا؟" ان کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ ان کی آواز چبھنے کی حد تک کانوں میں لگ رہی تھی۔ لیکن ان کے منہ سے نکلنے والے ان دو لفظوں نے جیسے مجھے تیز دھوپ میں لا کھڑا کیا ہو۔
کچھ لفظ ایسے زخم دے جاتے ہیں۔ جن کا مداوا نہیں ہو سکتا۔
فارس اندر آئی تو میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔
"کیا ہوا ابھی تھوڑی دیر پہلے تائی جان آئی تھیں! لگ رہا ہے۔ انہوں نے کان کھینچے ہیں۔ تب ہی چہرہ کوئی اور کہانی سنا رہا ہے۔ لیکن یار! فکر نہیں کرو۔ ابھی پہلے وہ کچن میں بھی آئی تھیں اور انہوں نے تیل زیادہ خرچ ہونے پر ہم لوگوں کو بھی ایک لیکچر دیا ہے۔ کہو تو وہ تقریر دل پذیر تمہیں بھی سناؤں۔"
"تیل زیادہ خرچ ہونے پر لیکچر سننا اور اپنی ذات کی تذلیل ہوتے دیکھنا اور کردار کو بیچ میں لا کر ایسی باتیں جن سے دل زخمی ہو جائے۔۔۔ دونوں چیزیں برابر نہیں ہو سکتیں۔"
"زیادہ سیریس بات ہو گئی کیا؟" فارس نے پوچھا پھر میری شکل دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اس دن ارتضٰی گھر میں ہی تھا۔ ان دنوں ماہ نور ٹرم کی وجہ سے دیر سے گھر آرہی تھی۔ موقع اچھا تھا۔ تائی جان نے ارتضٰی کو بلا کر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ ان کے پاس اپنے حساب سے بڑی ٹھوس وجہ تھی۔ ارتضٰی کی فرماں برداری اور سعادت مندی مسلم تھی۔ جس کا ماں ہونے کے ناتے وہ بڑا بھرپور فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔ لیکن تقدیر ہر دفعہ وہ کچھ نہیں لکھتی جو آپ چاہتے ہیں۔
ارتضٰی نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ سیدھے اور صاف لفظوں میں اور تائی جان کو یقین نہیں آتا تھا کہ ارتضٰی ان کا بیٹا ان کو کسی بات کے لیے انکار بھی کر سکتا ہے۔ انہوں نے تو جب اس کا دل نوچا تھا وہ تب بھی خاموش رہا تھا۔
تو پھر آج کیوں؟ ان کی ہر بات کے جواب میں اس کے پاس خاموشی تھی۔ کہا تو صرف اتنا کہ میں پہلے آپ کی بات مان سکتا تھا۔ مگر اب نہیں۔
"اب کیا ہو گیا؟ کیا وہ اتنی حور پری ہے کہ تمہیں معذوری بھی نظر نہیں آرہی؟"
"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا اور پلیز! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اب مجھ سے کوئی بحث نہ کریں۔" وہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔
گھر میں اچھی خاصی ٹینشن پھیل گئی تھی۔ ماہ نور یونیورسٹی سے آئی تو پریشان ہو گئی۔
"کوئی خاص بات ہوئی ہے؟"
"نہیں۔" فارس نے مختصر جواب دیا۔
"سب لوگ بہت چپ چپ ہیں۔"
"ہم لوگ تو ویسے بھی بڑے چپ چپ رہتے ہیں۔ تم نے شاید ابھی غور کیا ہے۔"
"کیا بات ہے۔ کوئی میری بات کا صحیح جواب نہیں دیتا۔ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" اس نے دھمکی دی۔
"ناراض ہونے سے پہلے جا کر اپنی ایکسر سائز کرو۔ ورنہ پھر تمہاری ڈاکٹر ڈانٹے گی۔" میرے ٹوکنے پر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔
"ایک بات بتاؤں آپ لوگوں کو۔"
"نہیں بتاؤ۔ مجھے لگ رہا ہے۔ ہم لوگوں کی کوئی تعریف ہونے والی ہے۔" فارس نے عاجزی سے کہا۔
"میں زیادہ تو نہیں جانتی۔ لیکن ایک بات مجھے اور میرے دل کو بڑی اچھی طرح سے پتا ہے کہ آپ سب لوگ اور خصوصاً" حور جی اس دنیا کے لوگ نہیں ہیں۔"
"یہ تعریف ہے یا ہمیں بھوت پریت بنانے کی کوشش ہے؟" فارس نے منہ بنایا۔ ماہ نور ہنس پڑی۔ لیکن پھر فوراً" سنجیدہ ہو کر بولی۔
"لیکن میرا سوال اپنی جگہ پر ہے۔ گھر میں کوئی بات ہوئی ہے۔ ابھی آتے ہوئے میں نے بڑی مامی کو سلام کیا تو انہوں نے جواب بھی نہیں دیا۔ آج آپ کی تائی امی کا موڈ زیادہ خراب ہے۔"
"ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ' جو کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"مگر میں ان کی فکر نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر ارتضٰی بھائی کی امی پریشان ہوں تو وہ خود بھی بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ بڑی محبت کرتے ہیں اپنی امی سے۔"
"چھوڑو ماہ نور اس گھر میں سب ہی لوگ ایسی محبت کر رہے ہیں' جس سے دوسروں کو تکلیف ملے دکھ ملے اور پلیز ارتضٰی کے ساتھ بھائی نہیں لگایا کرو۔" فارس نے اس کی کلاس لی۔
"تو اور کیا کہوں۔ جب بچپن میں نانی جان کے ساتھ ارتضٰی بھائی آتے تھے۔ مجھے تب بھی ان سے ڈر لگتا تھا۔ اور آج بھی۔ اور سچ بتاؤں' مجھے تو وہ کبھی منگیتر بھی نہیں لگے۔ کبھی جو انہوں نے ڈھنگ سے دو باتیں کی ہوں۔ ہاں! یہ ہے کہ اب کبھی کبھار میری خیریت ضرور دریافت کر لیتے ہیں یا پھر ڈاکٹروں کے پاس لے جانا۔ بس جی بات ختم۔" اس نے دونوں ہاتھ ملا کر جھاڑے۔

سچ بتاؤں۔ ان کی اگر دوستی ہے۔ تو حمد جی سے ان کی تو ڈانٹ بھی سن لیتے ہیں باقی تو کوئی ان کے سامنے بول بھی نہیں سکتا۔

میں نے اسی وجہ سے یونیورسٹی میں بھی کسی کو نہیں بتایا کہ میری منگنی ہو گئی ہے۔ منگیتر ایسے کھڑوس تو نہیں ہوتے۔"

"ماہ نور! چپ کرو۔" میری آواز خود اتنی تیز تھی کہ میں ڈر گئی "جاؤ! اپنے کمرے میں۔ بہت باتیں کرنے لگی ہو۔"

"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ اپنا غصہ دوسروں پر کیوں اتار رہی ہو؟" فارس نے مجھے لتاڑا۔

"مجھے کسی پر غصہ نہیں ہے فارس! میں تقدیر کے چکروں میں الجھ گئی ہوں۔ تھوڑا وقت لگے گا مگر میں نکل ہی آؤں گی۔"

"ویسے تمہیں نہیں لگتا کہ اگر ارتضیٰ تائی جان کی بات مان لیتا تو بڑا اچھا ہو جاتا' ہر چیز اپنے صحیح ٹھکانے پر پہنچ جاتی۔" فارس کو بڑی دور کی سوجھی تھی۔

"فارس! تمہارا دماغ کچھ زیادہ ہی چلتا ہے۔ میں تائی جان کے نزدیک جتنی ناپسندیدہ ہوں۔ یہ کبھی بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے تم اپنے دماغ پر زیادہ زور نہیں ڈالو۔"

میں نے ساری بات تائی جان پر رکھ دی۔ اگر میں اسے بتاتی کہ ارتضیٰ اگر اس طرح کرتا تو ایسے شخص کو پھر میں نہیں جانتی تھی۔ محبت بڑی چیز سہی مگر انسانیت کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ فارس کی بڑبڑ پھر کون سنتا۔ اس لیے میں خاموش رہی۔

☼ ☼ ☼
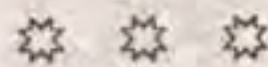
وہ ایک گرم دن تھا۔ اور ہم سب ہی لوگ کچن میں مصروف تھے۔ کام کو بھگتا رہے تھے۔

"قسم سے آدمی کو اتنا امیر ضرور ہونا چاہیے کہ بندہ گرمی میں ایک شیف رکھ سکے۔" زینی کی ساری باتوں کی تان یہیں آکر ٹوٹتی تھی۔

"تمہاری فرمائشیں سنتے سنتے بڑھاپا آگیا۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"بڑھاپا اگر ایسا ہو تو ساری دنیا اس کی تمنا کرے" فارس نے میرے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"کیا کر رہی ہو؟" میں نے جلدی جلدی بال پیچھے
"کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ تمہارے بالوں میں نرمی اور کتنی چمک ہے۔"

"زندگی جب اندھیروں میں بھٹک رہی ہو تو بالوں کی چمک' آنکھوں کے اجالے بھی کام نہیں آتے۔"

پندرہ دن پہلے میرا ایم بی اے مکمل ہو گیا تھا اور ... جان نے دادی جان سے کہہ دیا تھا کہ اب بس حور کی فکر کریں۔ جو بھی اچھا رشتہ آتا ہے دیکھ کر شادی کی تاریخ رکھ دیں اور مجھے لگا کہ تائی جان بیک وقت دو محاذوں پر کام کر رہی ہیں۔ ایک طرف وہ چاہتی تھیں کہ ارتضیٰ اور ماہ نور کی منگنی ختم ہو جائے اور دوسری طرف وہ میرا رشتہ بھی کہیں نہ کہیں طے کرنے کے چکر میں تھیں۔ اب کے ان کا ارادہ اپنے میکے سے ... لانے کا تھا۔ ہم لوگوں نے خود ہی کچھ سنا تھا کہ تائی جان کا اپنے بھانجی کے لیے ارادہ ہے۔

اور فارس کا خیال تھا کہ جو خوبیاں وہ اپنی بہو میں چاہتی ہیں ایسی بہو انہیں آرڈر پر ہی بنوانی پڑے گی ویسے تو ملنا مشکل ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ... نور پر ہی اکتفا کریں۔ ڈاکٹرز یقین دلا رہے تھے کہ ماہ نور چھ آٹھ مہینے تک بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور یہ ... فارس کہتی تھیں۔

"ماہ نور تو چھ آٹھ ماہ میں ... مان لیتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن ان لوگوں کے متعلق ہم کیا کریں جن کے متعلق ہمیں لگتا ہے کہ وہ کبھی صحیح نہیں ہوں گے۔"

☼ ☼ ☼

بہت دیر سے ہی سہی مگر ماہ نور نے تائی جان کے رویے کو سمجھ لیا تھا اور کچھ اور بھی۔ اور اس دن پہلی دفعہ۔ وہ مجھ سے ناراض ہوئی۔ اس نے کہا تھا۔

"آپ اچھی نہیں ہیں حور جی! میں آپ کو ...

سمجھتی تھی اور آپ نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اپنی کوئی بات مجھ سے شیئر کرلیتیں۔ مجھے زندگی میں جھوٹے سہارے نہیں چاہیے تھے۔

ارتضٰی بھائی جتنے بھی اچھے تھے۔ مگر میں ایک اجنبی آدمی کو لے کر کیا کروں گی۔ زندگی اجنبیوں کے ساتھ نہیں گزاری جاسکتی۔ ابھی میرا انٹرن شپ ہو جائے گا تو بس پھر آگے کی زندگی دیکھی جائے گی اور بے شک ایک چیز میں واپس لوٹا رہی ہوں۔ لیکن جو دوسری چیز میرے پاس ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی دولت نہیں کرسکتی اور وہ ہے میری تعلیم۔ میں آج کھڑی ہو سکتی ہوں کیونکہ میرے پاؤں کے نیچے زمین ہے اور یہ اسی تعلیم کا بخشا ہوا اعتماد ہے کہ غلط یا صحیح مگر میں فیصلہ کر سکتی ہوں۔"

اس نے اپنی انگوٹھی اتار کر دادی جان کو دے دی۔

"یہ آپ بڑی ماں کو دے دیجئے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر اس کے لہجے میں ایسی مضبوطی تھی کہ میں سر اٹھا کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

دادی جان نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ یوں بھی وقت و حالات کو دیکھ ہی رہی تھیں۔ پھر ایسے میں ماہ نور کو سمجھانے کا بھی کوئی جواز نہیں رہ جاتا تھا۔

ہر چیز پلٹ پلٹ کر واپس آرہی تھی۔ منزل تک جانے میں راستے کے گرد و غبار، مشکلیں سب ہی ختم ہوتی جارہی تھیں۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ ان سب میں خود منزل بھی کہیں چھپ گئی۔ نہ وہ نظر آتی تھی۔ نہ دکھائی دیتی تھی۔

جو راستوں میں ٹھہر گئی ہے۔ وہ شام دکھ ہے۔
یہ جو تم محبت نبھاتے ہو تو اس محبت کا نام دکھ ہے۔

مجھے وہ بہت کچھ یاد آکر رہ جاتا جو تائی جان میرے ساتھ کرچکی تھیں۔ اپنے رویے سے۔ اپنے لفظوں سے۔

ایک وقت ہوتا ہے۔ جب دل سب کچھ برداشت کرلیتا ہے اور ایک وقت جب برداشت کی ہوئی ساری چیزیں زہر بن جاتی ہیں اور زہر بہت تھوڑی مقدار میں بھی ہو تو وہ زہر ہی ہے۔

دل کو جتنا پتھر کا بنالو۔ وہ بن تو نہیں جاتا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک گرم دن تھا۔ شہر کے حالات بے حد کشیدہ تھے۔ وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ فارس نے کانوں میں ایم پی تھری لگایا ہوا تھا۔

"اس طرح کرنے سے تمہیں لگ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہو رہا ہے؟" میں نے اس کے کانوں سے ہیڈ فون کھینچا۔

"جو کام لوگ خود کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کو اس سے کیسے روک سکتے ہیں؟ تم نے بھی آنکھیں اور کان بند کرکے یہی سمجھا ہوا ہے نا کہ سب صحیح ہے۔" فارس نے مجھے جتایا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔" ماہ نور کے نہیں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ پھر میں ہوں۔ میں ساری زندگی کسی کی نفرت کا سامنا کرکے نہیں جی سکتی۔ مجھ میں اس والی بہادری موجود نہیں۔ آئی سمجھ میں بات؟"

"مگر ارتضٰی نے کہا ہے کہ وہ سب ٹھیک کرے گا۔"

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ نفرت بڑی بری چیز ہے فارس! یہ سب کچھ ختم کردیتی ہے۔ ساری اچھائیوں کو دھند لادیتی ہے۔ اور تائی جان نے بھی مجھ سے زمانوں کی نفرتیں باندھ لی ہیں اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہ بلاوجہ ہے۔ ہو سکتا ہے میرا بھی قصور ہو۔ انہیں لگتا ہو میں کوئی بدتمیز، خود سر لڑکی ہوں۔ جس نے اس گھر کے اصول توڑے ہوں۔ یا اپنی بات منوائی گئی ہو۔ لیکن فارس! میری نیت خراب نہیں تھی۔ میں صرف یہ بات سوچتی تھی، جتنی گھٹن ہم برداشت کرچکے ہوں۔ کل زیبا، ضیا اور آنے والا کوئی دوسرا برداشت نہ کرے۔"

اسی وقت میرے سامنے کی سپاٹ دیوار پر کسی سائے کے نقوش غائب ہوئے۔ میں ایک دم تیزی سے مڑی۔

"فارس! یہاں کون تھا؟"

"تائی جان۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم مجھے بتا نہیں سکتی تھیں؟ پتا نہیں انہوں نے کیا سوچا ہوگا میرے اور ارتضٰی کے بارے میں۔" میں اس پر خفا ہوئی۔

"بتا سکتی تھی۔ لیکن میرے دل نے کہا۔ نہ بتانا زیادہ مناسب ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"ایک تو تم اور تمہارا دل۔" میں نے دانت پیسے۔

اسی وقت باہر سے شور کی آواز آئی۔ ہم دونوں ایک دم بھاگے۔ وہاں پر سراسیمگی سی تھی۔ تائی جان اوندھے منہ کاؤچ پر گری ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"پتا نہیں۔ صبح سے کہہ رہی تھیں کہ طبیعت خراب ہے سینے میں درد سا لگ رہا ہے۔ ابھی تمہارے پاس یہی کہنے گئی تھیں کہ کچھ ہلکا پھلکا سا بنادو مگر ایک دم۔ اچانک پتا نہیں کیا ہوا۔" سب اپنی بول رہے تھے اور میری نظر ان کے چہرے پر تھی۔ ان کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ایک دم کوئی گھنٹی میرے اندر بجی۔

"ارتضٰی کو یا کسی کو بھی فون کرو۔ ان کو فوراً" اسپتال لے جانا پڑے گا۔"

"شہر کے حالات خراب ہیں۔ کوئی بھی ایک گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔" فارس نے مایوسی سے کہا "فائرنگ بھی ہو رہی ہے اس لیے۔ ایمبولنس کو بھی اندر نہیں آنے دیا جائے گا۔"

"فارس! مجھے ہارٹ اٹیک کا خطرہ لگ رہا ہے۔ میں گاڑی نکالتی ہوں۔ تم سب مل کر کسی طرح تائی جان کو گاڑی میں ڈالو۔"

ہمیشہ میرے گاڑی چلانے پر سب مذاق اڑاتے تھے اور تائی جان کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے انار کلی کی طرح دیوار میں زندہ چنوا دیتیں مگر اس وقت سب لوگ خاموش تھے حتیٰ کہ وہ قہر بھری آنکھیں بھی خاموش تھیں۔

اور انسان کتنی عجیب چیز ہے۔ شدت سے میرا دل چاہا کہ تائی جان اٹھ جائیں۔ وہ آنکھیں، شعلے برساتی آنکھیں ہی سہی مگر انہیں کھول لیں۔

ہم محبتوں کی طرح نفرتوں کے بھی عادی ہو ہی جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وقت ہر شے کی شدت کم کرتا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

تائی جان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اور ان کے ٹھیک ہونے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ کی زندگی اللہ نے اس بچی کے ذریعے بچالی۔ دو منٹ بھی لیٹ ہو جاتے تو پھر ہم لوگ کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ آپ ساری زندگی کے لیے اس کی قرض دار ہو گئی ہیں۔ اس کو دعا دیجئے۔"

پتا نہیں کتنا مشکل مرحلہ ہوگا۔ مگر میری طرح تائی جان بھی اس مرحلے سے گزر گئیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد انہوں نے ارتضٰی سے کہا۔

"خوش رہنے کی دعا دینا میرا کام ہے۔ مگر خوش رکھنے کی ذمہ داری تو تمہاری ہی ہوگی۔" اپنے حساب سے انہوں نے ساری زندگی کا قرض ایک لمحے میں اتار دیا تھا۔

جانے انہوں نے اپنا قرض اتارا تھا یا انہوں نے مجھے دل سے تسلیم کرلیا تھا۔

مجھے دونوں میں سے کسی چیز پر بھی شک نہیں تھا۔ کیونکہ ایک دل تو ہر سینے میں دھڑکتا ہی ہے۔

ناولٹ

بشریٰ احمد

"شاہو کی دولہن ہے بہت خوب صورت۔" دولہن رخصت کروا کر اپنے گھر لائے اسے ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہوا تھا مگر اس ڈیڑھ گھنٹے میں بھی اس نے کوئی ڈیڑھ درجن بار یہ جملہ سن لیا تھا۔ دولہن بڑے کمرے میں عورتوں میں گھری بیٹھی تھی، کچھ رشتہ دار خواتین تھیں تو کچھ محلے کی شوقین مزاج عورتیں جو شاہنواز کی دولہن دیکھنے کے شوق میں صبح کا انتظار نہ کر پائیں اور رات کو ہی امڈی چلی آئیں.... بتول بی بی بیٹیوں کے سامنے ناک چڑھا کر ان خواتین پر ناگواری کا اظہار کر چکی تھی۔

"منہ دکھائی کے نام پر جیب سے پھوٹی کوڑی نہیں نکل رہی اور اس کلموہی کے پاس بیٹھ کر اس کی خوب صورتی کے قصیدے اس رفتار سے پڑھ رہی ہیں کہ دماغ عرش تک جا پہنچے گا۔"

اسے بیاہ کر لائے انہیں ذرا سی دیر ہوئی تھی مگر کلموہی کے خطاب سے فٹ نواز دیا تھا۔ حالانکہ دولہن اس کی اپنی منتخب کردہ تھی۔ شاہنواز چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ سب سے بڑی شبانہ اس کے خود کے چار بچے تھے۔ تین سال سے بیوگی کی چادر اوڑھ کر ماں کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ اگر وہ بیوہ نہ ہوتی تو کچھ عرصے میں طلاق یافتہ کا ٹھپہ لگوا کر بھی اس نے میکے ہی لوٹنا تھا کہ اس کی بد زبانی ضرب المثل تھی۔

دوسرے نمبر کی ندرت جو شبانہ سے محض دو برس چھوٹی تھی عمر کی بتیس بہاریں دیکھ چکی تھی مگر خود کو بائیس سے اوپر کا سمجھنے کو تیار نہ ہوتی۔ بد زبانی اور بد لحاظی میں اپنی بڑی بہن کا پرتو تھی اور شاید اس میں ان کا اتنا قصور بھی نہ تھا کہ یہ اوصاف انہیں وراثت میں بھی ملے اور تربیت بھی اسی نہج پر ہوئی۔

بتول بی بی نہایت اکھڑ، جھگڑالو اور بد مزاج عورت تھی۔ اس کا میاں صابر نام کا نہیں حقیقت میں صابر تھا۔ بچوں کی خاطر اس بد مزاج عورت سے نباہ کر گیا اب تو خیر صابر کو دنیا سے رخصت ہوئے بھی ایک عرصہ بیت چکا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ساری ذمہ داری شاہنواز عرف شاہو کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔

چھوٹی سی کریانے کی دکان' چھوٹی عمر میں ہی اس نے اس خوبی سے سنبھالی کہ بتول بی بی کو صابر کے "گزرنے" کا ذرا سا غم بھی جاتا رہا۔ چند سالوں میں وہ ایک چھوٹی دکان کے بجائے دو بڑی دکانوں کا مالک بن گیا تھا۔

بتول بی بی کے کان میں جب یہ طعنہ پڑنے لگا کہ وہ بیٹے کی کمائی کی خاطر اسے ساری عمر کنوارا ہی رکھے گی تو اس نے بادل نخواستہ بہو ڈھونڈنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اگرچہ لوگوں کے طعنے اس پر رتی برابر اثر انداز نہ ہوتے تھے۔ مگر وہ جہاں دیدہ عورت تھی' اس سے پہلے جوان ہوتا بیٹا اپنے منہ سے اپنی شادی کی بات کرتا یا خود ہی کہیں آنکھ مٹکا چلا لیتا۔ اس نے اس کی شادی کو ہی ترجیح دی حالانکہ اس بارے میں اس کا خدشہ بے بنیاد تھا۔

شاہنواز طبعاً" شریف شخص تھا۔ اس کا سارا دماغ صرف کاروبار بڑھانے کے طریقوں پر چلتا تھا۔ اس کی خود کی خواہش تھی کہ پہلے بہنوں کے فرض سے فارغ ہولے پھر اپنے بارے میں سوچے۔ شبانہ تو خیر بیوہ تھی خود عقد ثانی کے لیے راضی ہو بھی جاتی تو کوئی دوسرا بھڑوں کے اس چھتے کو اٹھا کر اپنے گھر لے جانے کی ہمت نہ کرتا۔ ندرت بھی تیس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی مگر اس کے لیے بھی کوئی بھولا بھٹکا رشتہ گھر کی دہلیز پار نہ کرتا۔ خاندان والوں سے بتول بی بی نے بنا کر رکھی نہیں اور آس' پڑوس کے محلے دار اور جاننے والے اس کی بیٹیوں کے گنوں سے واقف تھے سو کہیں سے رشتہ آنے کی کوئی امید نہ تھی۔

تیسرے نمبر والی شمسہ ناک' نقشے میں بہنوں سے مختلف تھی۔

تین کریمیں لگا لگا کر رنگ بھی چٹا سفید کر لیا تھا۔ اپنے آپ کو کرینہ کپور اور ایشوریہ سے کم نہ سمجھتی۔ بہنوں کا حشر دیکھ کر اپنے اخلاق بھی بہتر بنانے پر توجہ دی۔ محلے کے جوان لڑکوں کی ماؤں' بہنوں سے خوب اخلاق سے پیش آتی مگر جب دال نہ گلی تو سیدھی انگلی کے بجائے ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس کا اخلاق ان ماؤں کے بیٹوں کے لیے وقف تھا۔ محلے کے تین لڑکوں سے وہ بیک وقت نہایت کامیابی سے معاشقہ چلا رہی تھی' اسے پتا تھا کہ سیدھے طریقے سے رشتہ آنا ناممکن ہے' وہ تو شادی کے لیے گھر سے بھاگنے تک کو سنجیدہ تھی' یہاں وہ تینوں لڑکے اسے اس معاملے میں کچھ غیر سنجیدہ لگ رہے تھے سو آج کل وہ اپنے چوتھے شکار کی تلاش میں تھی جو موبائل میں بیلنس ڈلوانے اور چھوٹے موٹے تحفے دلوانے کے بجائے اس کے ساتھ گھر بسانے پر بھی راضی ہو جائے۔

تلاش ہنوز جاری تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ ایک دن اسے اپنا گوہر نایاب مل کر رہے گا۔ سب سے چھوٹی شازیہ ابھی واقعی چھوٹی تھی۔ پچھلے دو سال سے نویں جماعت میں فیل ہو رہی تھی' ٹی وی ڈرامے اور فلمیں اس کی کمزوری تھی۔

اسکول سے آکر بستہ پھینک اور ریموٹ سنبھال کر بیٹھ جاتی صرف اس وقت اٹھتی جب گلی سے گول گپوں کے ٹھیلے یا پاپڑ کرارے والے کی آواز سنتی۔ چٹور پن میں اس نے اپنی بہنوں کو بھی مات دے رکھی تھی۔ اٹھان اس کی بھی اچھی تھی مگر گلے میں دوپٹا ڈالے وہ گلی میں شتر بے مہار پھرتی تھی۔ ایک دو بار کسی پڑوسن نے نیک نیتی سے بتول بی بی کو اس بارے میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر بتول بی بی نے اس پر بے چاری پڑوسن کے وہ لتے لیے کہ اسے اپنی نیک نیتی نری حماقت لگنے لگی۔

شاہنواز کا بڑی بہنوں کے علاوہ چھوٹی بہنوں پر بھی بھائیوں والا کوئی رعب یا زور نہ چلتا تھا۔ اس کی حیثیت صرف پیسہ کمانے والی مشین کی سی تھی۔ وہ خود بھی گھریلو معاملات سے لاتعلق رہتا تھا۔

مگر جب سے ماں بہنوں نے اس کے لیے لڑکی دیکھنے کی مہم شروع کی تھی تب سے اسے گھر میں کچھ دلچسپی محسوس ہونا شروع ہوئی۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر ماں بہنوں کی باتوں پر دھیان دینے لگا۔ جن لڑکیوں کا وہ گھر واپس آکر نقشہ کھینچتیں' شاہنواز کا تخیل ان کا سراپا تراشنے لگتا۔ فطری جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگے۔

اس کے اپنے دل میں بھی شادی کی خواہش پوری طرح پروان چڑھنے لگی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی ماں بہنوں کی تیزی' طراری کی شہرت اس تیزی سے پھیلتی جارہی تھی کہ اس سے پیشتر وہ لڑکی کے سانولے رنگ' چھوٹے قد یا موٹے نین نقش کو بنیاد بنا کر انکار کی لذت محسوس کرتے۔ ان ہی سانولی رنگت' چھوٹے قد اور موٹے نین نقش والی لڑکیوں کے گھر والوں کی طرف سے انکار سننے کو مل جاتا حالانکہ شاہنواز خوش شکل تھا۔ ایف اے پاس تھا۔ کھاتا کماتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی شرعی عیب میں بھی مبتلا نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کے رشتے کی بیل منڈھے نہ چڑھ رہی تھی۔

بتول بی بی کو آخر تنگ آکر رشتے کروانے والی' وچولن کی مدد لینا پڑی۔ کچھ تگ و دو کے بعد آخر بتول بی بی کو من پسند رشتہ مل ہی گیا۔

شہربانو ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کے ماں' باپ کو مرے ایک مدت ہو گئی تھی۔ وہ چچا کے گھر رہتی تھی۔ چچا محنت مزدوری کر کے اپنے آٹھ بچوں کے ساتھ شہربانو کی کفالت بھی کر رہا تھا۔ بتول بی بی کو رشتے کے کوائف پتا چلے تو لڑکی کو دیکھے بنا ہی اس نے رشتہ اوکے کر دیا۔ اسے ایسے ہی طبقے کی لڑکی درکار تھی جو ساری زندگی سر جھکائے اس کی اور اس کی بیٹیوں کی خدمت میں گزار دے اور ماتھے پر بل نہ لائے۔ نخرے بیکے والی بہو نرا درد سر ہی ثابت ہوتی تھی۔ اسے بہو کی خوب صورتی سے بھی کوئی سروکار نہ تھا اسے خدشہ تھا کہ خوب صورت بہو بیٹے کو اپنے جال میں نہ پھانس لے۔

شہربانو کے چچا کے گھر جانے سے پہلے اسے گمان تک نہ تھا کہ وہاں گدڑی میں لعل دیکھنے کو ملے گا۔ بتول بی بی اور اس کی بیٹیاں کسی کم صورت' یتیم پھر بے چاری سی لڑکی کا تصور لے کر وہاں پہنچی تھیں۔ رنگ اترے کپڑوں میں وہ بے چاری سی تو لگ رہی تھی۔ مگر اس بے چارگی میں بھی اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کشمیری سیبوں جیسے گال' رس بھرے ہونٹ' غلافی آنکھیں اور ستواں ناک' تیسرے نمبر والی شمسہ جس کو اپنی گوری رنگت پر بڑا مان تھا۔ شہربانو کے ساتھ بیٹھی نرا پھیکا شلجم دکھائی دے رہی تھی۔

شہربانو کے چچا' چچی نے اپنے تئیں خاصا اہتمام کر رکھا تھا مگر وہ ماں بیٹیاں نخوت سے منہ بنائے بیٹھی رہیں۔ اس کچے پکے گھر میں انہیں اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے رویے سے چچا' چچی کے چہروں پر مایوسی جھلکنے لگی مگر جاتے سمے بتول بی بی نے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر شہربانو کی ہتھیلی پر رکھا تو شہربانو کے چچا' چچی پر گویا شادیٔ مرگ طاری ہو گیا۔ گھر آکر بیٹیوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

"ہمارا تو خیال تھا' آپ چٹا انکار کر کے آؤ گی۔ وہ کوئی گھر ہے بھائی کو بیاہنے جوگا۔"

"گھر بے شک جیسا بھی ہو بھابھی تو پریوں جیسی ہے۔" سب سے چھوٹی شازیہ ماں بہنوں کی نظر میں عقل سے کوری تھی اور اس وقت بھی اس نے یہ بات کر کے گویا اس بات کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

"خبردار' جو شاہو کے سامنے اس کی خوب صورتی کا تذکرہ کیا۔ شادی کے بعد بھی میرا بیٹا میری آنکھوں سے دیکھے گا۔ اسے بیوی کے حسن سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔"

"ہاں' اماں! ایسا ہی تو تیرا بیٹا اندھا ہے نا۔ سچ تو نے بہت غلطی کی اور میں تو کہوں گی کہ بہت جلد بازی سے کام لیا۔ شادی کے بعد اکلوتا بیٹا ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اکلوتی بہو وہ بھی اتنی حسین' بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔" سب سے پہلا اعتراض سب سے بڑی شبانہ کی طرف سے آیا۔

"تم سب لوگوں کو اس کی خوب صورتی نظر آرہی ہے بے وقوف لڑکیو! یہ تو دیکھو کہ کیسی بے سہارا سی لڑکی ہے۔ اس کے چاچا' چاچی تو ایک بار اسے سر سے بوجھ کی طرح اتار پھینکیں گے تو پلٹ کر خبر بھی نہ لیں گے۔ ہم اس کے ساتھ سیاہ کریں یا سفید کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو گا۔ مفت کی ملازمہ مل رہی ہے تمہیں۔"

بتول بی بی نے بیٹیوں کو سمجھایا تھا۔
"حسن سے بڑا جادو کوئی نہیں اماں! وہ ملازمہ بن کر رہے گی، یہ تیری خام خیالی ہے۔" ندرت نے طنزیہ لہجے میں ماں کو مخاطب کیا۔
"شاہو کی طنابیں میرے ہاتھ میں ہیں اور وہ اس لڑکی کو کبھی اتنا مان دے گا ہی نہیں کہ اس کا جھکا سر اٹھ سکے۔" بتول بی بی کے لہجے میں بڑا زعم تھا۔

☼ ☼ ☼

اور شہر کے دوسرے سرے پر موجود ایک کچے پکے گھر کے نیم تاریک باورچی خانے میں رات کے کھانے کے لیے روٹیاں پکاتی ہوئی شہربانو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے مستقبل کے بارے میں کیا پیش بندیاں کی جا رہی ہیں۔ اس کے لبوں پر سے تو دھیمی سی مسکان جدا ہی نہ ہو رہی تھی۔
"باجی تو آپ ہی آپ مسکرائے جا رہی ہے۔ بڑی خوشی ہے نا۔" اس کے چاچا کی دوسرے نمبر والی بیٹی نے پوچھا۔
"چل ہٹ۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔" اس نے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا۔
"بچی نہیں ہوں جی۔ اماں، ابا سے رات ہی کہہ رہی تھی کہ شہربانو کے فرض سے فارغ ہو جائیں تو منی اور کاکی کے لیے سوچنا شروع کریں گے۔" اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے بتایا تھا۔ شہربانو کو ہنسی آگئی۔
"بڑا شوق ہے منی! تجھے شادی کا۔"
"اور نہیں تو کیا۔ نئے نئے کپڑے بنتے ہیں شادی پر۔ بری میں میک اپ کا سامان آتا ہے۔ اونچی ہیل والے سینڈل اور پیارا سا پرس بھی۔"
چودھویں سال میں لگنے کے باوجود منی واقعی منی تھی۔ شہربانو نے ایک گہرا سانس اندر کھینچا۔ اسے ان سب چیزوں، جن کا منی نے نام لیا تھا، سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے ایک رشتہ درکار تھا۔ سر کا سائبان۔ پوری دنیا میں اس کا اپنا ہمدرد، ساتھی اور غمگسار۔
بہت چھوٹی عمر میں ماں، باپ کی محرومی سہنے کے بعد وہ چاچا کے در پر آن پڑی۔ ان چاہے بوجھ کو اٹھانا کسی کے لیے بھی اتنا آسان نہیں ہوتا۔ چاچا، چاچی کا رویہ خصوصاً اس کے ساتھ ہی برا نہ ہوتا تھا۔ انتہائی غربت اور اوپر تلے کے بچوں نے ان میاں بیوی کے مزاج میں مخصوص چڑچڑاہٹ پیدا کر دی تھی۔ ان کی اپنی اولاد بھی ان کی مار پٹائی اور طعنوں، کوسنوں سے فیض یاب ہوتی تھی۔ شہربانو کے ساتھ تو یتیم جان کر پھر یہ رعایت برتی گئی کہ کبھی چاچا یا چاچی نے اس پر ہاتھ نہ اٹھایا۔ ہاں ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ کی حق دار ضرور ٹھہری۔
غربت اس کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس کا اپنا باپ مزدور پیشہ تھا مگر اکلوتی بیٹی میں ماں اور باپ دونوں کی جان تھی۔
باپ تعمیراتی کام کے دوران چھت سے گرنے سے دماغی چوٹ کھا کر دنیا سے رخصت ہوا تو ماں یہ صدمہ دل سے لگائے ٹی بی کی بیماری بھی لگوا بیٹھی۔ علاج ممکن تھا مگر شعور اتنا نہ تھا۔ بے قاعدگی سے دوائیاں کھانے کی وجہ سے بیماری اتنی بگڑی کہ پھر شہربانو کی ماں سنبھل ہی نہ سکی یا پھر اسے بھی شوہر کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ قل کے بعد گم صم سی شہربانو کو چچا اپنے ساتھ لے آیا۔ یہاں آکر اسے بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ ناز نخرے اٹھانے والی ہستیاں دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں، سو اپنا غم دل میں دفن کر کے اس نے نئے سرے سے زندگی گزارنے کی ٹھانی۔
وہ فطرتاً بہت صابر، شاکر لڑکی تھی۔ پھر چچا کے گھر آکر اسے استانی ہاجرہ کی صحبت میسر آگئی۔
چچا کے گھر سے دو گھر چھوڑ کر تیسرا گھر استانی ہاجرہ کا تھا۔ استانی ہاجرہ پچاس، پچپن سال کی بے اولاد خاتون تھیں۔ شوہر مسجد کے پیش امام تھے۔ استانی ہاجرہ گھر پر بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ شہربانو کو قرآن پاک مکمل کیے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی منی اور کاکی کو زبردستی وہاں تک لے جانے کی تھی۔ استانی ہاجرہ کلام پاک کے علاوہ بچیوں کو نصیحت آموز باتیں بھی بتاتیں جو ان کی شاگردوں میں سے تو جانے کسی کے پلے پڑتی بھی تھیں یا نہیں۔ شہربانو البتہ بہت دھیان لگا کر ان کی باتیں سنتی تھی۔ اسے اس مہربان چہرے والی عورت سے بہت انسیت اور عقیدت سی ہو گئی تھی۔ استانی ہاجرہ سے بھی اس کا انہماک پوشیدہ نہ رہ پایا۔
"اگر فارغ ہوا کرو بیٹی تو آجایا کرو، میں تمہیں بھی درس دے دیا کروں گی اور صبح گھر کے کام نمٹا کر وہ باقاعدگی سے استانی ہاجرہ کے پاس جانے لگی تھی اور یہاں آنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ زندگی اب تک بس گزرے جا رہی تھی۔ زندگی گزارنے کا صحیح شعور تو یہاں آکر ملا۔ پہلے کبھی کبھار وہ قسمت سے شاکی ہو جاتی تھی لیکن استانی صاحبہ نے اللہ کی نعمتوں کا احساس دلوا کر شکر کرنے کا طریقہ سکھایا۔
"میری بچی! بے شک یتیمی سہنے سے زیادہ مشکل اور کوئی چیز نہیں پھر بھی اس بات کا شکر کر کہ اللہ نے تجھے بالکل ہی بے سہارا اور بے وسیلہ نہیں چھوڑا۔ تجھے ایک ٹھکانا تو مہیا کر دیا جہاں تو عزت سے زندگی گزار سکتی ہے۔ ایک عورت کے لیے اس کی عزت و عصمت کی حفاظت سے اہم کوئی چیز نہیں۔ تیرا چاچا بھلے سے غریب ہے، چاچی تجھے بلاوجہ ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے لیکن اس چار دیواری کے اندر تیری عزت تو محفوظ ہے۔ دو وقت کی روٹی بھی مل رہی ہے اور تن ڈھانپنے کو کپڑا بھی۔ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی یا اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کی خاطر عزت گروی رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ تجھے اللہ نے اتنی خوب صورتی سے نوازا، اس کے باوجود تجھ پر دنیا کی میلی نگاہیں نہیں پڑ رہیں۔ یہ اس ذات باری کا احسان نہیں تو اور کیا ہے۔"
اور شہربانو نے اس دن کے بعد چاچا، چاچی کی کسی بات کا برا نہ مانا تھا۔ وہ ممنونیت کے احساس سے مغلوب ان کی زیادہ خدمت کرنے لگی تھی۔ استانی ہاجرہ کے پاس جانے سے اس کی زندگی میں غیر محسوس طریقے سے سکون اور ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اللہ سے اس کا تعلق ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے وہ کبھی کبھار ہی نماز پڑھتی تھی۔

اب نہ صرف باقاعدگی سے نمازیں پڑھنے لگی بلکہ قرآن پاک بھی دوبارہ صحیح تلفظ سے پڑھا۔ ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھنی شروع کی، چاچا، چاچی کے بچوں کی اخلاقی تربیت کرنے کی بھی اپنی سی کوشش کرتی رہتی۔ چاچی کی زبان کی تلخی بھی اب کم ہوتی جارہی تھی بلکہ اب بھی کبھار وہ اور چاچا اس کے مستقبل کے بارے میں بھی باتیں کرتے۔

"تھوڑا بہت زیور اس کی ماں کا پڑا ہے۔ چار چھ جوڑے اور تھوڑے سے برتن میں اکٹھے کرلوں گی۔ اب تم شہربانو کا کوئی بر ڈھونڈو۔ جوان لڑکی ہے اور ہے بہت خوب صورت۔ وہ تو بچی نیک فطرت کی ہے پھر بھی اسے جلد گھربار کا کرنا ضروری ہے۔ اس کے ہوتے اپنی بچیوں کے رشتے نہیں ہونے والے۔"

چاچی، چاچا سے مخاطب تھی اگر وہ کچھ عرصہ پہلے والی شہربانو ہوتی تو چاچی کے آخری فقرے پر دھیان اٹک جاتا کہ وہ اسے اپنی بیٹیوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھ رہی ہے لیکن اب اسے چاچی کی بات سن کر ان پر پیار سا آیا۔ اس کی ماں کے زیور کو انہوں نے اس کے لیے سنبھال کر رکھا۔

بظاہر جاہل ہونے کے باوجود یتیم کے مال کو امانت سمجھا انہوں نے۔ اور جس طرح شہربانو نے گھر کے کاموں کی ساری ذمہ داری اٹھا رکھی تھی اور چاچی بالکل فراغت کے مزے لوٹتی تھیں تو وہ مفت کی ملازمہ کو سدا گھر بھی رکھ سکتی تھیں لیکن چاچا، چاچی اسے ذمہ داری سمجھتے ہوئے گھربار کا کرنا چاہ رہے تھے۔

استانی جی نے اسے تصویر کا روشن رخ دیکھنا سکھا دیا تھا۔ ان کی صحبت میں وہ شکر کا قرینہ سیکھ چکی تھی۔ بے اولادی کے باوجود استانی ہاجرہ کے منہ سے اس نے کبھی شکوے کا ایک لفظ نہ سنا تھا اور وہ ان کی شاگرد خاص تھی۔ وہ برملا اعتراف کرتی تھیں کہ انہیں آج تک شہربانو جیسا کوئی اور شاگرد نصیب نہیں ہوا۔ وہ ان کی ہر بات کو نہایت دھیان اور توجہ سے سن کر پلو میں باندھ لیتی تھی اور پھر اسی کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتی اور جب سے اس کی بات پکی ہوئی تھی، استانی ہاجرہ ایک ماں کی طرح اسے شادی شدہ زندگی کی اونچ نیچ سمجھانے لگی تھیں۔

"میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں بیٹی! اللہ تعالیٰ نے یہ بہت خوب صورت رشتہ تخلیق کیا ہے لیکن اس کے تقاضے اور ذمہ داریاں بھی ان گنت ہیں۔ شوہر کی خوشنودی کو ہر حال میں مقدم جاننا چاہیے اور خصوصاً" ہمارے معاشرے میں بیاہتا عورت کے کندھوں پر ذمہ داریاں اور ہی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری تو رب کی طرف سے عائد کردہ ہے لیکن اس سے منسلک رشتے اگرچہ وہ عورت کے فرائض میں شامل نہیں۔ لیکن ایک اچھی مسلمان لڑکی جو دین کی صحیح روح سے آشنا ہوگی، وہ اسلام کی اخلاقی اقدار کو لازمی اہمیت دے گی۔ اسلام نے تو پڑوسیوں تک کے حقوق مقرر کر رکھے ہیں پھر ایک چھت تلے رہنے والے تو خصوصاً" ایک دوسرے کے حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ اگر تم شوہر کے دل پر راج کرنا چاہتی ہو تو تمہیں سسرالی رشتہ داروں کو عزت اور اہمیت دینی پڑے گی۔ اصولاً" انہیں بھی تم سے محبت، شفقت اور اپنائیت سے پیش آنا چاہیے۔ لیکن ہمارے معاشرے پر ہندو تہذیب کا رنگ غالب ہے۔ عموماً" بہو کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے لیکن بیٹی یہ ہی اصل امتحان ہے۔

صبر، برداشت اور تحمل صرف کتابوں میں پڑھنے کی باتیں نہیں۔ عملی زندگی میں جب ان کا ثبوت دینا پڑتا ہے تو زندگی بہت دشوار لگنے لگتی ہے، بہت سی عورتیں آخر کار صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتی ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر واویلا کرتی ہیں۔ شوہر کے کان بھرتی ہیں اور اس طرح نہ صرف غیبت کی مرتکب ہوتی ہیں بلکہ اگر شوہر ان کی باتوں میں آکر اپنے خونی رشتوں سے بدظن ہوکر انہیں چھوڑ بیٹھتا ہے تو گناہ گار ٹھہرتا ہے۔ ایسا گناہ جس پر اسے بیوی نے اکسایا اور اگر وہ بیوی کے بجائے اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں کو اہمیت دیتا ہے تو ایسے میں عورت کی حیثیت بے پتوار کی کشتی کی سی ہوجاتی ہے۔ اگر شوہر خود ہی رشتوں میں توازن رکھنے والا ہو تو کیا ہی اچھی بات ہے مگر عموماً" ایسا ہوتا نہیں ہے اس کا جھکاؤ یا تو بیوی کی طرف ہوتا ہے یا ماں، بہنوں کی طرف۔ انتہا میں دونوں ہی غلط ہیں۔

ایک عقل مند عورت ایسی صورت حال کی نوبت ہی نہیں آنے دے گی اور بالفرض محال اگر اسے سسرال میں سخت حالات کا سامنا کرنا پڑے گا تو میاں کے کان بھر کر اسے ان سے بدظن کرنے کے بجائے وہ اس رب کی بارگاہ میں اپنا مقدمہ پیش کرے گی جو یقیناً" سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔"

استانی ہاجرہ اسے اپنے مخصوص دھیمے اور دلنشیں انداز میں سمجھا رہی تھی اور شہربانو حیرت اور استعجاب سے منہ کھولے ایسے ان کی باتیں سن رہی تھیں جیسے وہ کسی اور ہی جہان کی باتیں سنا رہی ہوں۔ شادی کے نام پر ابھی تک تو اس کے ذہن میں صرف ہونے والے جیون ساتھی کا خیال آتا تھا اور ان خیالات پر بھی وہ دل میں چور سی بن جاتی۔ بھلے سے اس کی ماں شگن کا روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ گئی تھیں، مگر نکاح کے بول پڑھنے سے پہلے تک تو وہ اس کے لیے نامحرم ہی تھا نا۔ اس کے خیالوں میں کھوئے رہنا جائز نہ تھا۔ دماغ دل کو ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھاتا مگر دل چوری چھپے اپنی روش پر قائم تھا۔

اس نے اب تک شاہنواز کی کوئی تصویر نہ دیکھی تھی مگر تخیل نے اس کا سراپا تراش لیا تھا۔ وہ اس کے سر کا سائیں بننے والا تھا اور شہربانو نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی خدمت اور اطاعت سے رب کے عطا کردہ اس نئے اور پیارے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دے گی لیکن اب استانی ہاجرہ نے اس کے فہم اور ادراک کا دامن وسیع کرتے ہوئے اسے زندگی کی کچھ اور حقیقتوں سے روشناس کروایا تھا۔

"آپ کی باتیں سن کر تو مجھے ڈر لگ گیا ہے استانی جی! پتا نہیں میں شادی کے بعد نئی ذمہ داریاں نبھا بھی پاؤں گی یا نہیں۔" وہ واقعی خوف زدہ ہوگئی تھی۔

"میری شہربانو بہت عقل و شعور رکھنے والی لڑکی ہے۔ یہ اپنے سے وابستہ سب رشتوں کو بخوبی نبھائے گی ان شاء اللہ۔" استانی ہاجرہ نے اسے دل سے دعا دی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ خود شہربانو کے لیے متفکر تھیں۔

ان کی چچازاد بہن اسی علاقے میں رہتی تھی جہاں شہربانو کا سسرال تھا بلکہ وہ وچولن جس کی وجہ سے یہ رشتہ منڈھے چڑھا تھا، وہ استانی ہاجرہ کی چچازاد بہن کی نند تھی۔ اپنی بہن کی زبانی استانی ہاجرہ کو شہربانو کے سسرال کے بارے میں جو کچھ سننے کو ملا، وہ خوش کن نہیں تھا۔ استانی ہاجرہ غیبت سننے سے اجتناب کرتی تھیں وہ اپنی بہن کو ٹوکتی رہ گئیں مگر وہ مختصر سی ملاقات میں بھی انہیں ان لوگوں کے متعلق بہت کچھ بتا گئی تھی۔

"اس بچی کو اکثر آپ کے گھر دیکھا ہے آپا! بس اسی لیے اس سے ہمدردی سی ہو رہی ہے۔ لڑکا تو خیر ٹھیک ہے مگر اس کی ماں بہنیں توبہ! ان سے زیادہ بدزبان، لڑاکا اور جھگڑالو عورتیں میں نے اپنی زندگی میں اور نہیں دیکھیں۔ کسی بھینگی، کانی کا رشتہ بھی نہیں مل رہا تھا انہیں۔ ثریا نے لے کے اس یتیم بچی کو پھنسوا دیا۔"

اس نے وچولن کا نام لیا تھا۔

"اچھا جو ہوگیا، اللہ اسی میں بہتری پیدا کرے۔" استانی ہاجرہ نے رسانیت سے کہا تھا۔

شاہ نواز کی ماں، بہنوں کی بدمزاجی کی شہرت چاچا، چاچی تک بھی جا پہنچی تھی۔ چاچی کو تو خیر ایک ملاقات میں ہی ان کی تیزی طراری کا اندازہ ہوگیا تھا لیکن اب دوسروں کی زبانی بھی اتنا کچھ سننے کو ملا تو کچھ پریشان ہو گئی۔

"منی کے ابا! کہیں ہم یتیم بچی کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر رہے۔ یہ تو بے زبان گائے ہے۔ شاہ نواز کی ماں بہنیں اسے سالم نگل لیں گی۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے میری بھتیجی سے ہمدردی کا زیادہ ہی بخار چڑھنے لگا ہے۔ بے وقوف عورت! اللہ کا شکر کیا کر کہ زبردستی کا جو ڈھول ہمارے گلے پڑا تھا اس سے چھٹکارے کا کوئی سبب تو بنا۔ لڑکا ہوتا تو ہمارے کسی کام جوگا تو ہوتا۔ وہ پیسے بھی کما کر لاتا اور

ایک بیٹی بھی بیاہ دیتے اس کے ساتھ۔ یہ تو صرف سر پر بوجھ ہی تھی۔ جوان بچی کی ذمہ داری میں کب تک اٹھائے رکھتا اس مالک کا کرم کہ مناسب وقت پر اپنے گھر بار کی ہو رہی ہے پھر کیا کمی ہے اس لڑکے میں۔ کیسا سوہنا گبھرو جوان ہے۔ کھاتا کماتا ہے۔ تیری بے زبان گائے کو وہاں کم از کم اچھا کھانے اور پہننے کو تو ملے گا۔ یہاں کیا مل رہا ہے بے چاری کو؟ جو روکھی سوکھی ہم کھاتے ہیں' اس میں سے چار نوالے اسے دے دیتے ہیں۔ میرے بھائی کے گھر غربت تو تھی مگر اسے تو شہزادیوں کی طرح رکھتا تھا وہ۔"

مرحوم بھائی کو یاد کرکے سنگ دلی کا خول چڑھائے چاچا کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا اور اسی شام چاچا نے شہربانو کو شاید پہلی بار خاص طور پر کوئی بات کرنے کے لیے اپنے پاس بلایا۔

"دیکھ پتر شہربانو!" اور شہربانو نے حیرت سے سر اٹھا کر چاچا کو دیکھا۔ اتنی نرمی اور حلاوت سے بات کرنے والا وہ چاچا ہی تھا یا کوئی اور۔

"مہینے بعد تو رخصت ہو کر اس گھر سے چلی جائے گی۔ شادی کے بعد لڑکی کا ماں پیو کے گھر پر سے ہر حق ختم ہو جاتا ہے اور خیر سے تیرے ماں' پیو تو پہلے ہی گزر گزر گئے ہیں۔ یہ غریب چاچا جب تک تیری ذمہ داری اٹھا سکتا تھا اٹھالی۔ شادی کے بعد بھول جائیو کہ تیرا کوئی چاچا بھی ہے اپنے خوند (خاوند) کے گھر کو ہی اپنا گھر سمجھنا۔ ویسے تو تو بہت سمجھ بوجھ اور برداشت والی بچی ہے' لیکن سسرال بڑی اوکھی (مشکل) جگہ ہوتی ہے۔ وہاں بہت برداشت اور صبر سے کام لینا ہوتا ہے۔ اگر پیچھے تگڑے بھائیوں والا میکہ ہو تو عورت اکڑ بھی دکھا سکتی ہے۔ لیکن پتر! تیرا چاچا تو اتنا غریب ہے کہ تیری خیر خبر لینے کو بھی نہیں جا سکتا کیونکہ اس کی جیب میں تو کرائے کے پیسے بھی نہیں ہوں گے۔"

پتا نہیں یہ سب لوگوں کی چھٹی حس تھی یا ان کا وجدان کہ وہ شہربانو کو ایک ہی بات مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوششوں میں اسے ٹھیک ٹھاک خوف زدہ کر چکے تھے۔

☆ ☆ ☆
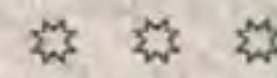
دوسری طرف شاہنواز تھا جو آج کل اپنے دوستوں کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔ اس کے شادی شدہ دوست معنی خیز انداز میں ہنستے ہنستے بہت سے مفید مشوروں سے نوازتے۔ ان کی باتیں سن کر شاہنواز کے رگ و پے میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ جاتی مگر وہ دلی کیفیات کا اظہار کیے بغیر مسکراتے ہوئے ان کے مشورے گرہ میں باندھتا رہتا۔ غیر شادی شدہ دوست صرف رومانٹک ڈائیلاگ رٹوا سکتے تھے جو اس نے سہاگ رات دولہن سے بولنے تھے۔ شاہنواز خود تو فلمیں وغیرہ دیکھنے کا شوقین نہ تھا سو آنکھیں بند کرکے رٹو طوطے کی طرح دوستوں کے یاد کروائے ڈائیلاگ جو انہوں نے خود کسی فلم سے مستعار لیے ہوتے' دل میں دہراتا رہتا۔

شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی اور اسے مہینے کا ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب تک شادی کے بارے میں سوچا نہ تھا' دل و دماغ کوری سلیٹ کی مانند صاف تھے۔ لیکن اب ایک جیتی جاگتی ہستی جو اس کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی تھی۔ اس کا تصور دل میں عجیب نرم گرم سے جذبات بیدار کرنے کا سبب بنا ہوا تھا وہ آج کل بات بے بات مسکرانے لگا تھا۔ اس کی ماں' بہنوں سے اس کی خوش مزاجی چھپی نہ رہ پائی تھی۔

"بھائی تو ابھی سے بدل رہا ہے اماں! کیسے دانت نکلے رہتے ہیں ہر وقت۔" شمسہ نے ماں کو مخاطب کیا۔ بتول بی بی نے اسے کوئی جواب نہ دیا بس گھورنے پر اکتفا کیا تھا اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب دولہا بنا شاہنواز بارات کے ہمراہ شہربانو کے چاچا کے کچے پکے گھر پہنچ گیا۔ شہربانو کے چاچا نے اپنی بساط سے بڑھ کر بارات کے استقبال کا اہتمام کیا تھا۔

استانی ہاجرہ کی ترغیب پر محلے کی بہت سی مخیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے یتیم بچی کی شادی میں ثواب کی نیت سے بہت سا پیسہ اکٹھا کرکے

شہربانو کی چاچی کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا اور اس نے شہربانو کا مقدور بھر جہیز اکٹھا کر لیا تھا۔

"لگتا نہیں تھا' یہ ٹٹ پونجیے اتنا اچھا سامان دے دیں گے۔" شبانہ نے ماں سے سرگوشی کی تھی۔

"اچھا خبردار۔ آئندہ جو اس کے جہیز کی تعریف اس کے یا شاہو کے سامنے کی ہو۔ دونوں کو یہ ہی جتانا ہے کہ جہیز بس گزارے لائق ہے۔" آج کل بتول بی بی کی نعمتیں۔ عروج پر تھیں۔

"میں کوئی پاغل (پاگل) ہوں اماں جو اس نمانی کے سامنے اسی کے جہیز کی تعریف کروں گی۔"

شبانہ نے ماں کی تسلی کروائی تھی۔ دولہن بنی شہربانو سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ محلے کی ایک لڑکی نے اس کا میک اپ کیا تھا۔ بتول بی بی نے بارات والے دن کا لہنگا بہت ہی ہلکا لیا تھا لیکن شہربانو اس معمولی قیمت والے لہنگے اور روایتی سے میک اپ میں بھی شہزادیوں جیسی حسین لگ رہی تھی۔

ذرا دیر پہلے نکاح ہو گیا تھا اور اب شمسہ مسکرا مسکرا کر چھوہارے بانٹ رہی تھی۔ خلاف توقع اس کچے پکے گھر میں اسے دو چار خواتین کافی معزز اور مہذب لگ رہی تھیں شاید' محلے کے کھاتے پیتے گھرانوں کی خواتین غریب پروری میں یتیم بچی کی شادی میں شریک تھیں۔ ان میں سے کسی کو شمسہ اچھی لگ جاتی تو اس کے نصیب ہی کھل جاتے۔ یہ ہی وہ سوچ تھی جو شمسہ کو خوش اخلاقی برتنے پر مجبور کر رہی تھی ورنہ اس کی ماں' بہنیں تو ایسے تیوریاں چڑھائے بیٹھی تھیں جیسے دولہن بیاہنے نہیں' بلکہ خریدنے آئی ہوں۔

شمسہ نے ہی موبائل سے شہربانو کی چند تصویریں اتاریں کہ کیمرا لانے کا تکلف انہوں نے کیا ہی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں شاہ نواز کو سلامی کے لیے زنان خانے میں لایا گیا۔ شمسی اور کاکی نے جوتا چھپائی کے وقت رقم کا تقاضا کیا۔ شاہ نواز اس وقت ذرا سا شوخ ہو رہا تھا۔ اس نے پیسے دینے میں ٹال مٹول سے کام لینا شروع کیا جب بحث ذرا سی بڑھی تو بتول بی بی نخوت سے آگے بڑھی۔

"شاہو! کیا ان بالشت بھر کی لڑکیوں سے ہنسی مخول میں لگا ہوا ہے۔ دے دے' جتنے مانگتی ہیں۔ کوئی کمی ہے ہمارے پاس۔ بے چاریوں کا بھلا ہو جائے گا۔"

"ناں۔ ہم کوئی فقیر ہیں خالہ جی! رکھیں اپنے پیسے اپنے پاس۔" بالشت بھر کی کاکی کو بتول بی بی کا لہجہ اور انداز بہت برا لگا تھا' سو تڑخ کر جواب دیا۔

بتول بی بی اور اس کی بیٹیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہیں دولہن کے گھر والوں سے اس "بدتمیزی" کی توقع نہ تھی۔ ابھی تک تو یہ لوگ بچھے جا رہے تھے سو گردن مزید اکڑی گئی تھی اور اس چھوٹی سی بچی نے سب مہمانوں کے بیچ کیسے تڑخ کر جواب دیا تھا۔

"اے بہن! تمہاری بچی تو بہت زبان دراز ہے۔ ہماری بہو کی تربیت بھی خیر سے تمہارے ہاتھوں انجام پائی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے بتا دو۔ تمیز' تہذیب سکھائی ہے اسے یا سکھانے کا ٹیم (ٹائم) ہی نہیں ملا۔"

بتول بی بی نے ہاتھ نچا نچا کر پوچھا تھا اور اس وقت وہ خود کتنی بد تہذیب لگ رہی تھی' اسے اس کا اندازہ ہی نہ تھا لیکن یہ وقت بڑا نازک تھا۔ شہربانو کی چاچی اس سے بحث مباحثے کے بجائے بڑی عاجزی سے مخاطب ہوئی تھی۔

"معاف کر دیں جی۔ بچی ہے ابھی اور شہربانو کی تو آپ فکر ہی نہ کریں یوں سمجھیں' اس کے منہ میں اللہ نے زبان رکھی ہی نہیں۔"

"گونگی ہے کیا؟" ندرت نے ٹھٹھا اڑایا تھا۔

"او بس کرو بھئی۔ ذرا سی بات کو کیوں بڑھا رہے ہو؟" شاہ نواز نے پاس کھڑی شمسہ سے آہستہ سے کہا۔ شمسہ نے بڑے بھائی کو گھور کر دیکھا تھا مگر پھر اتنے سارے لوگوں میں اپنا امپریشن بہتر بنانے کی غرض سے ماں کو مخاطب کیا۔

"چھوڑیں امی جی! بس آنٹی جی وغیرہ سے رخصتی کی اجازت لیں۔ ٹائم دیکھیں' کتنا ہو گیا ہے۔"

"رخصتی کی اجازت۔" شبانہ نے استہزائیہ انداز میں بہن کو دیکھا۔ شہربانو کا نکاح ہو چکا تھا۔ وہ اب ان

لوگوں کی ملکیت تھی اور شمسہ اجازت لینے کی بات کر رہی تھی۔

"ہاں بہن! خوشی کا دن ہے۔ معمولی باتوں پر دل میلا نہ کریں۔ خیر سے دولہن کو رخصت کروا کر اپنے گھر لے جائیں۔"

استانی ہاجرہ نے بردباری سے بتول بی بی کو مخاطب کیا تھا۔ بتول بی بی نے ایک ٹیڑھی نگاہ استانی ہاجرہ پر ڈالی لیکن پھر شہربانو کی چاچی کو رخصتی کا کہہ دیا۔ چاچی نے جلدی جلدی شہربانو کو چادر اوڑھائی جیسے اسے خدشہ ہو کہ بتول بی بی رخصتی کروانے کا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ استانی ہاجرہ نے شہربانو کو گلے سے لگا کر ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تھا اور شہربانو نے بھی صرف ان ہی کے سینے میں سر چھپا کر آنسو بہائے تھے۔

"یہ کون ہے، جو اتنی سگی بن رہی ہے۔" بتول بی بی نے نخوت سے شہربانو کی چاچی کو مخاطب کیا۔

"شہربانو کی استانی ہیں جی۔" چاچی نے استانی ہاجرہ کی جانب عقیدت سے دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

"اچھا اچھا اور ہاں بری میں ایک استانی کا جوڑا بھی تو لائے تھے ہم۔ اے شبانہ! جوڑا نکال کر دے دیا نا تو نے۔" بتول بی بی کو اچانک یاد آیا۔

"ندرت نے دے دیا ہوگا اماں۔" شبانہ نے بیزاری سے جواب دیا۔ بتول نے سر ہلا دیا۔

"بن ماں باپ کی بچی ہے' اپنی شفقت کے سائے میں رکھیے گا۔" استانی ہاجرہ کو سوٹ سے تو کیا غرض تھی انہوں نے بہت لجاجت سے بتول بی بی کے ہاتھ تھام کر التجا کی۔ اپنی یہ شاگرد بلاشبہ انہیں بیٹیوں کی طرح ہی عزیز تھی۔

"او اچھا استانی جی! اب یوں راستہ روک کر کھڑے کھڑے نصیحتیں ہی کرتی رہو گی یا دولہن کو رخصت بھی ہونے دو گی۔"

بتول بی بی نے کہا تو استانی ہاجرہ شرمندہ سی ہو کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ اگلا مرحلہ دولہن کو گاڑی میں بٹھانے کا تھا۔ شاہ نواز کا ایک دوست گاڑی سجا کر لے آیا تھا ورنہ بتول بی بی کے نزدیک شہربانو جیسی کم حیثیت دولہن کے لیے گاڑی کا تکلف بھی اتنا ضروری نہ تھا وہ تو اسے باراتیوں والی بس میں بھی چڑھا سکتی تھیں۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہو رہا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر شاہنواز کا دوست براجمان تھا۔ ڈرائیونگ وہی جانتا تھا سو اسے اس کی سیٹ سے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ فرنٹ سیٹ پر دولہا کی حیثیت سے شاہ نواز براجمان تھا۔ پچھلی نشستوں کی امیدوار بتول بی بی سمیت اس کی چاروں بیٹیاں تھیں۔

"تم چاروں تو آتے ہوئے بھی ٹھنس ٹھنسا کر آئی تھیں۔ اب مجھے بیٹھنے دو۔ پتا ہے نا مجھے بس کا کتنا دھواں چڑھتا ہے۔ آتے وقت اتنا جی متلا گیا تھا میرا۔" بتول بی بی بیٹیوں کو پیچھے ہٹاتی سب سے پہلے گاڑی میں جا بیٹھی۔

"شبانہ باجی پلیز' آپ تو بس میں بیٹھ جائیں۔ آپ گاڑی میں چڑھیں گی تو پھر آپ کے دو چھوٹے بچے بھی ساتھ گھسیں گے۔" ندرت نے بڑی بہن کو ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں گھسنے سے روکا تھا۔

"دولہن کو تو بیٹھ لینے دو' بے چاری کب سے کھڑی ہے۔" بتول بی بی کی خالہ زاد بہن نے ہی مداخلت کر کے شہربانو کو گاڑی میں بٹھایا تھا۔ ندرت بھی فٹ سے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

"آئیں شبانہ آپا! ہم بس میں ہی بیٹھ جاتے ہیں لوگ بھی کیا سوچ رہے ہوں گے کہ زندگی میں پہلی بار گاڑی میں بیٹھنا نصیب ہو رہا ہے۔"

شمسہ کو ہی آخر کار اپنے امپریشن کی فکر ہوئی تھی۔ وہ شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر باراتیوں والی بس میں چڑھ گئی تھی اور جس وقت وہ شہربانو کو رخصت کروا کر گھر لائے تھے پڑوس کی عورتوں نے گھر پر ہلہ ہی بول دیا سب کو اشتیاق تھا کہ دیکھیں بتول بی بی کیسی بہو بیاہ کر لائی ہے اور بہو دیکھ کر سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

شہربانو کا حسن واقعی بے مثال تھا۔ سب عورتیں برملا اس کے حسن کو سراہ رہی تھیں۔ شاہنواز کے کانوں میں بھی یہ آوازیں پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر مغرور سی مسکراہٹ سج گئی تھی مگر یہ مسکراتا چہرہ اس کی بہنوں کو بے اطمینانی میں مبتلا کر رہا تھا۔

"اماں! شاہو کو تو دیکھو کیسے دانت نکل رہے ہیں اسے اچھی طرح سمجھا دے کہ بیوی کے زیادہ ناز نخرے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔" شبانہ نے ماں کو ایک طرف لے جا کر مخاطب کیا۔

"پتا ہے مجھے۔ تو زیادہ سیانی نہ بن۔" بتول بی بی نے شبانہ کو جھڑک دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ بتول بی بی خود بھی شہربانو کے حسن سے خائف ہو رہی تھی۔ کہیں اس حسن کا جادو اس کے بیٹے کے سر پر چڑھ جائے۔ اسے اس سے پہلے ہی احتیاطی تدابیر کرنا تھیں' سب سے پہلے تو اس نے بہت مشکلوں سے محلے کی عورتوں کو ان کے گھروں کی طرف روانہ کیا جب گھر میں صرف دو چار رشتہ دار خواتین ہی باقی رہ گئیں تو انہیں دلہن کے کمرے میں اکٹھا کر کے کھانے کا دستر خوان وہیں لگوا دیا پھر بتول بی بی کے کمرے میں شاہ نواز کی طلبی ہوئی تھی۔ چاروں بہنیں بھی وہیں موجود تھیں۔

"دیکھ شاہو! دنیا میں بہت کم مائیں میری جیسی ہوں گی۔ میں نے گھر میں جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے ان کے بیاہ سے پہلے تیرے بیاہ کا سوچا' شبانہ تو چلو بیوہ ہے' رب کی مرضی مگر یہ ندرت' شمسہ اور یہ چھوٹی شازیہ بھی اصولاً" مجھے ان کے فرض سے فارغ ہو کر تیرے بارے میں سوچنا چاہیے تھا مگر میں نے تیری خوشی کی خاطر اپنے سینے پر بھاری پتھر رکھا اور تیری دولہن بیاہ لائی۔"

"میں نے کب کہا تھا اماں! تو نے خود ہی۔" شاہ نواز نے بے چارگی سے ماں کو دیکھا تھا۔

"ہاں ہاں۔ تو نے تو کچھ نہیں کہا تھا میرے بچے لیکن میں تیری ماں ہوں۔ تیرے جذبات و احساسات کا خیال رکھنا بھی تو میرا فرض تھا نا۔"

"اماں! کیسی سلیس اردو بول رہی ہیں۔" شازیہ نے شمسہ کے کان میں گھس کر سرگوشی کی۔ بتول بی بی نے کھسر پھسر کرتی بیٹیوں کو گھورتے ہوئے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

"میں نے تجھ پر بھروسا کیا میرے لعل! میرے بھروسے کو توڑا تو سمجھ' وہ دن تیری ماں کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔" بتول بی بی کی آنکھیں ایک دم ہی آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہو اماں!" شاہ نواز نے گھبرا کر ماں کے ہاتھ تھامے۔

"میں بیوہ عورت میرے سینے پر دھری یہ چادر بھاری سلیں اگر شادی کے بعد تو بدل گیا تو ہم تو رل ہی جائیں گے شاہو! بالکل بے آسرا' بے سہارا۔" بتول بی بی دوپٹا منہ پر رکھ کر رونے لگی۔ چاروں بیٹیاں ماں کی پرفارمنس کو انتہائی رشک سے دیکھ رہی تھیں۔

"تو کیوں ہونے لگی بے سہارا۔ میں ہوں نا اماں۔" شاہ نواز نے ماں کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔

"شادی کے بعد سب بدل جاتے ہیں شاہو! بیوی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بیوی کے کانوں سے سنتے ہیں اور بیوی کی زبان بولتے ہیں۔ ماں بہنیں تو بے چاری کسی گنتی شمار میں ہی نہیں آتیں۔" اب شبانہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر بھائی کو مخاطب کیا تھا۔

"میں تمہیں ایسا لگتا ہوں آپا۔" شاہ نواز کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا تھا۔ بتول بی بی نے شبانہ کو گھورا۔

"نہ میرے لعل! تجھ پر تو ہمیں پورا بھروسا ہے لیکن تیری بیوی اللہ جانے کس مزاج کی ہو گی۔ ہم ماں بیٹیوں کو برداشت بھی کر سکے گی یا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرے گی۔" بتول بی بی نے پھر خود پر رقت طاری کی۔

"تو ایسا کیوں سوچتی ہے اماں! اگر اس نے تم لوگوں سے زبان بھی چلانے کی کوشش کی تو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا اسے۔" شاہ نواز کے منہ سے آخر وہ فقرہ نکل گیا جس کو سننے کے لیے یہ بند کمرے کی میٹنگ کی گئی تھی اور اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر بتول بی بی کی رشتے کی بھتیجی نے اندر جھانکا تھا۔

"پھوپھی! اب سونے کا بھی انتظام کر دو۔ بچے ادھر ادھر لڑھکتے ہوئے سوئے پڑے ہیں۔"

"ہاں ہاں کرتے ہیں بستر۔" بتول بی بی نے آنکھ کے اشارے سے بیٹیوں کو تتر بتر ہونے کی ہدایت کی۔ یہ کم بخت بینو پوری فتنہ تھی اگر اندازہ ہو جاتا کہ ماں بہنیں شاہ نواز کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہیں تو چسکے لے لے کر دنیا جہان کو یہ بات بتاتی۔

"اور ہاں' بے چاری دولہن نے شرما شرمی میں دو چار نوالے ہی لیے ہیں۔ تم نے بھی مہمانوں کا کھانا اسی کے کمرے میں لگوا دیا۔ دونوں میاں بیوی اکٹھے کھا لیتے کھانا شانا۔"

بینو کا اشارہ شہربانو اور شاہ نواز کی طرف تھا۔ بتول بی بی نے بینو کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا مگر کچھ بولنے سے پرہیز کیا۔ کل ولیمہ کے بعد سب مہمانوں کو دفعان تو ہو جانا تھا' ان سے منہ ماری کا فائدہ ہی کیا تھا۔

"چل شاہ نواز! جا تو اپنے کمرے میں اور بینو! لے آ اپنے بچوں کو اسی کمرے میں ابھی شمسہ بستر کر دیتی ہے یہیں۔"

بتول بی بی خود بھی کمرے سے نکل گئی تھی۔ شاہ نواز ماں کے کہنے کے باوجود وہیں مسہری کے کونے پر بیٹھا رہا۔ اس کے نرم گرم ارمانوں پر جیسے برف سی پڑ گئی تھی۔ اس کی شادی نے اس کی بیوہ ماں کو کتنے خدشات میں مبتلا کر دیا ہے' وہ بیوی کے ساتھ کیسا طرز عمل اپنائے کہ ان خدشات کا خاتمہ ہو سکے۔ اس کی سوچوں کا تسلسل بینو اور اس کے بچوں کے آنے سے ٹوٹا تھا۔

"جا شاہو! دولہن تیری راہ دیکھ رہی ہو گی۔" بینو نے اسے ہنس کر مخاطب کیا۔ وہ جیسے ایک دم چونکا۔

"پھوپھی نے تیرے لیے ایسی چاند سی دولہن ڈھونڈی ہے کہ ہم تو حیران ہی رہ گئے' اپنی تو پوری برادری میں ایک بھی صورت ایسی نہیں۔" بینو نے فراخ دلی سے شہربانو کے حسن کی تعریف کی تھی لیکن اس بار شاہ نواز اپنی نئی نویلی دولہن کی خوب صورتی کے ذکر پر کچھ چڑ سا گیا۔

"ایسی بھی کوئی حور پری نہیں ہے اگر اس نے تم لوگوں کی باتیں سن لیں تو دماغ عرش پر چڑھ جائے گا۔"

"تو نے ابھی تک اسے غور سے دیکھا بھی ہے۔ گھٹنوں تک گردن جھکائے تو وہ بیٹھی ہے۔ تو جتنی بار بھی کمرے کے باہر سے گزرا' اس پر ترچھی نظر تو ضرور ڈالی ہے لیکن ایک جھلک بھی پوری نہ دیکھ پایا ہو گا۔ اب کمرے میں جا کر اس کا گھونگٹ ہٹا' پھر پتا چلے گا کہ ہماری باتوں سے اس کا دماغ عرش پر چڑھے گا یا تیری تعریفوں سے۔ سچ کیا چاند سا مکھڑا ہے اس کا۔"

بینو نے دوبارہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ شاہ نواز بیزاری سے گردن جھٹکتا کمرے سے نکل گیا۔ اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا کمرے میں داخل ہو کر اس نے چٹخنی چڑھا دی۔ بیڈ کے وسط میں گھونگھٹ نکال کر بیٹھی اس کی دلہن اپنے آپ میں مزید سمٹ گئی تھی۔ شاہ نواز ہولے ہولے قدم اٹھاتا اس کے پاس جا بیٹھا۔

"دیکھو شہربانو! آج تم میری زوجیت میں آئی ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں اور نام کے سوا ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔" شاہ نواز نے اس کا گھونگھٹ پلٹنے سے قبل اسے کچھ باور کروانا ضروری سمجھا تھا۔

"میں تمہارا شوہر ہوں شہربانو! لیکن اس سے بھی پہلے میں اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی بھی۔ زندگی میں اگر کبھی میری ماں کا تمہاری وجہ سے دل دکھایا' تم نے میری بہنوں کے سامنے کبھی زبان درازی کی کوشش کی تو سمجھ لینا' اس گھر میں اس روز تمہارا۔"

"میں آپ کو زندگی میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" شہربانو نے گھونگھٹ پلٹتے ہوئے بے تابی سے اس کی بات کاٹ دی تھی' مکمل جملہ سننے کی اس میں تاب ہی نہ تھی۔ یہ گھر اس کی آخری پناہ گاہ تھا اور سامنے بیٹھا شخص اس کی ذات سے جڑا سب سے معتبر حوالہ بن چکا تھا۔ وہ اس کے سر کا سائیں تھا' اس کا سائبان تھا۔ نکاح کے دو بولوں کے ساتھ اگر اس کی محبت شہربانو کے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی تو اس پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد تو گویا وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔

وہ جس علاقے سے تعلق رکھتی تھی، وہاں آوارہ نظرباز لڑکوں اور بدقماش مردوں کی بہتات تھی۔ لڑکے تھسی پٹی جینز، ٹی شرٹ چڑھائے، بال بڑھائے، ہاتھ میں سستا سا موبائل پکڑے بے ہودہ انڈین گانے سنتے ہوئے سر دھنتے تھے اور لڑکیوں کو چھیڑنے پر کمربستہ رہتے تھے خیر وہاں کی لڑکیاں بھی کم تیز نہ تھیں یا تو پسند کے لڑکے کے ساتھ چکر چلا لیتی تھیں ورنہ چھیڑنے پر کمر پر ہاتھ رکھ کر ہاتھ نچا نچا کر لڑکے کی خوب خبر لے لیتی تھیں۔

شہربانو، چاچا کے گھر کی چار دیواری کو اپنے لیے مضبوط حصار تصور کرتی تھی اس نے کبھی بلاوجہ گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ استانی ہاجرہ کا گھر محلے کا واحد گھر تھا جہاں وہ جاتی تھی وہ بھی منی یا کاکی میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ کر۔ استانی ہاجرہ اور ان کے خاوند کا بہرحال علاقے میں بہت احترام تھا سو ان کی شاگرد خاص لفنگوں کی گفتگو کا موضوع تو ضرور بنی مگر کوئی اسے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔

اور سامنے بیٹھا یہ مرد ان تمام مردوں سے کتنا مختلف تھا جنہیں شہربانو دیکھتی آئی تھی۔ اونچا، لمبا، سلیقے سے بنائے بال، چہرے کے مغرور تیکھے نقوش اور کیسا گمبھیر لہجہ۔ وہ اسے مستقبل کے حوالے سے ڈرانا چاہ رہا تھا مگر ایسا مہذب لہجہ اور انداز۔

شہربانو نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ قسمت اس پر ایسی بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ وہ بن ماں باپ کی، کچے پکے مکان میں رہنے والی لڑکی شاہ نواز جیسے خوبرو اور سلجھے ہوئے شخص کی رفاقت پا کر دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر بجا لا رہی تھی اور سامنے بیٹھا شاہ نواز تو خود اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا۔

ایسا حسن، ایسی معصومیت اور چہرے پر چھائی پاکیزگی۔

وہ اسے پہلی نظر میں جنت کی حور لگی تھی۔ وہ کتنے لمحوں تک اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا اور شہربانو مسلسل اس کی نظریں خود پر مرکوز پا کر بری طرح شرما گئی تھی۔ اس نے غیرارادی طور پر اپنا گھونگھٹ تو خود ہی ہٹا دیا تھا مگر اب شرم اور گھبراہٹ سے برا حال ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد شاہ نواز جیسے حواسوں میں واپس آیا تھا۔ اس کا دل بیوی کے حسن کو سراہنے کی راہ دکھا رہا تھا تو دماغ دل کو ڈپٹ رہا تھا آخر جیت دماغ کی ہوئی پہلی ہی رات بیوی کے حسن کے قصیدے پڑھنے سے اس کا دماغ آسمان پر پہنچ سکتا تھا۔ ماں کا دیا ہوا سبق اسے یاد تھا سو شہربانو سہاگ رات میں شوہر کے التفات اور وارفتگی سے محروم رہی تھی۔

وہ مشینی انداز کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ ایک روبوٹ کی طرح سارے کام انجام دینے والا۔

☼ ☼ ☼

شہربانو کو اپنے روکھے پھیکے، سنجیدہ اور سپاٹ سے شوہر سے ہرگز ہرگز کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ مسرور تھی اور بے تحاشا خوش۔ صبح اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی ساس، نندوں کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس کے چہرے پر جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ اور خوشی سے دمکتا چہرہ۔

"دیکھ لینا! اماں! یہ چڑیل بھائی کو پورے کا پورا اپنے قابو میں کر لے گی۔ پتا نہیں تجھے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا اتنی خوب صورت بہو لانے کا۔"

شبانہ سب سے زیادہ کلس رہی تھی۔ بتول بی بی نے بیٹی کو محض گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔ آج دوپہر کو ولیمہ کی تقریب تھی۔ گھر میں کچھ رشتہ دار اب بھی موجود تھے۔ وہ بیٹی کے خدشات دور کرنے کی کوئی عملی تدبیر نہیں کر سکتی تھی مگر ولیمہ سے اگلی صبح جب صبح آٹھ بجے تک بیٹے، بہو کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا تب اس نے آگ بگولا ہو کر دروازے پر دستک دی اس کا خیال تھا سوئی سوئی آنکھوں والی شہربانو کمرے کا دروازہ کھولے گی تو وہ اس پر چڑھ دوڑے گی۔

دروازہ بے شک شہربانو نے ہی کھولا تھا مگر وہ نہائی دھوئی، نکھری نکھری حالت میں دوپٹے کو سلیقے سے سر پر جمائے کھڑی تھی۔ شاہ نواز البتہ لحاف سر تک تانے گہری نیند سویا ہوا تھا۔

"یہ جوان بچیوں والا گھر ہے بہو! یوں دن چڑھے تک سونا مجھے ہرگز پسند نہیں۔" بتول بی بی نے تیوریاں چڑھا کر اسے مخاطب کیا۔

"اماں! میں تو کب سے جاگ رہی ہوں۔ فجر کے بعد تو مجھے سونے کی عادت ہی نہیں۔ نہا دھو کر میں نے نماز پڑھی، کئی بار باہر آ کر دیکھا مگر آپ لوگ سو رہے تھے تب باہر سے آوازیں آنا شروع ہوئیں تو میں نے باہر آنے کا سوچا مگر شرم کے مارے ہمت نہیں پڑی۔" شہربانو نے دھیمے لہجے میں وضاحت دی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے بعد اسے کبھی بتول بی بی کے سامنے اتنا لمبا جملہ بولنے کا موقع نہیں ملے گا۔

"ہاں ہاں جانتے ہیں۔ تو بڑی نمازن، پرہیزگار ہے۔ فجر کے بعد سونے کی عادت نہیں۔" بتول بی بی نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔ شہربانو ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"اٹھ ہی گئی تھی تو کمرے سے باہر آ کر کچن میں بھی جھانک لیتی۔ یہ شرم ورم کے ڈرامے کر کے اگر گھر کے کاموں سے جان چھڑانے کی کوشش کی تو میں بھی سارا لحاظ بھول جاؤں گی، چل آ باورچی خانے میں۔"

بتول بی بی نے دبی آواز میں اسے مخاطب کیا تھا، بہرحال وہ نہیں چاہتی تھی کہ شاہ نواز کے کانوں میں یہ آوازیں پڑیں۔ شہربانو چپ چاپ اس کے پیچھے کچن میں چلی آئی تھی۔

کچن کی حالت انتہائی ابتر ہو رہی تھی۔ ہر جگہ بغیر دھلے برتن لڑھکتے پھر رہے تھے۔ سنک تو خیر برتنوں سے بھرا پڑا تھا مگر سلیب پر حتیٰ کہ نیچے فرش پر بھی برتن پڑے تھے۔ اسے چاچی کے گھر کا چھپر تلے کچا باورچی خانہ یاد آیا۔ وہ کیسے چمکا کر رکھتی تھی اسے۔

"شاہ نواز کو دیر سے اٹھنے کی عادت ہے۔ نو بجے کے بعد وہ دکان جاتا ہے مگر تجھے اتنی دیر تک خصم کے ساتھ کمرہ بند کر کے پڑے رہنے کی ضرورت نہیں۔ صبح سویرے اٹھ جاتی ہے تو اچھی بات ہے۔ پہلے برآمدے، کچن کی صفائی سے فارغ ہو جایا کر۔ شبانہ کے بچے اٹھ جائیں تو اودھم مچا دیتے ہیں پھر جھاڑو تک دینا مشکل ہو جاتی ہے صفائی کے بعد کچن کی ذمہ داری آج سے تیری ہے۔ شازیہ اسکول جاتی ہے۔ آج تو خیر چھٹی کی ہے، سات بجے اسے ناشتا بنا کر دینا ہے پھر جو جو اٹھتا جائے اس کا ناشتا تیار کرنا ہے۔ ہمارے گھر میں سب کو تازہ کھانے کی عادت ہے اور تو نئی ہے۔ کچھ جانتی نہیں اس لیے آج تو یہ باتیں بتا رہی ہوں۔ بار بار دہرانے کی مجھے عادت نہیں۔"

بتول بی بی نے کہہ کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ بہت مؤدبانہ انداز میں کھڑی ساس کے فرمودات سن رہی تھی۔ بتول بی بی کو یک گونہ تسلی ہوئی۔

"چل شاباش۔ اب برتن مانجھنا شروع کر دے۔ میں لڑکیوں کو اٹھاتی ہوں اتنے تو برتن دھو کر فارغ ہوتی ہے، میں نصرت سے کہہ کر آٹا گندھواتی ہوں پھر تو جلدی سے سب کا ناشتا بنا لے۔"

بتول بی بی نے آخر میں لہجے میں نرمی سموئی تھی۔ شہربانو کے لیے یہ ہی بہت تھا اس نے "اچھا اماں" کہہ کر مستعدی سے برتن سمیٹنے شروع کر دیے۔ کام اس کے لیے کبھی بھی مسئلہ نہ رہا تھا۔ چاچی نے بھی پورا گھر اسی کے سر پر چھوڑ رکھا تھا بلکہ وہاں تو سہولیات کا فقدان تھا۔ نلکا چلا چلا کر برتن کپڑے دھونے پڑتے تھے، یہاں تو ٹونٹی چلا کر کتنی آسانی سے کام نمٹ جاتے تھے اس نے پھرتی سے برتن سمیٹ کر دھونے شروع کر دیے۔ ذرا دیر بعد جمائیاں لیتی شبانہ اپنے چھوٹے بیٹے کو گود میں لیے کچن میں داخل ہوئی۔ شہربانو نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"السلام علیکم آپا!" اس نے فوراً بڑی نند کو سلام کیا۔ شبانہ نے فقط گردن ہلانے پر اکتفا کیا پھر فوراً ہی کچن سے باہر نکل کر ماں کے پاس جا پہنچی۔

"تو نے دو دن کی دولہن کو کچن میں برتن دھونے کھڑا کر دیا اماں۔"

"نہ شبانہ! تجھے کسی طور چین بھی ہے۔ کبھی تجھے لگتا ہے کہ بہو کو ڈھیل دی تو ہمارے سر پر چڑھ کر ناچے گی۔ اب اسے قابو کر رہی ہوں تو اس پر بھی اعتراض۔" بتول بی بی نے بیٹی کو گھورا۔

"توبہ اماں کیسی باتیں کرتی ہو، مجھے بھلا کیا اعتراض

ہوتا۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اگر محلے پڑوس میں سے کوئی آنکلا تو ایویں بلاوجہ باتیں بنائے گا۔"

"محلے والوں کی فکر ہے تو جا اُسے ہٹا کر خود برتن مانجھ لے۔" بتول بی بی نے بے نیازی سے مشورہ دیا پھر شبانہ کے چہرے کے بگڑے زاویے دیکھ کر ہنس پڑی۔

"تیری ماں نے کبھی ان محلے والیوں کو اہمیت دی ہے جو تو پریشان ہو رہی ہے۔ محلے والیوں سے ڈرتی ہے میری جوتی۔ رشتہ داروں کا تھوڑا بہت لحاظ تھا۔ شکر ہے، وہ کل دفعان ہو گئے، اس لڑکی کا کوئی والی وارث ہے نہیں۔ ہم اس کے ساتھ سیاہ کریں یا سفید۔ کون پوچھے گا ایسے ہی تو اس غریب مسکین کو بیاہ کر نہیں لے آئی میں، تیری ماں ہر کام سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔" بتول بی بی نے شبانہ کو مخاطب کیا۔

"اور اگر شاہ نواز کو برا لگا کہ ہم نے شادی کے دوسرے دن ہی اس کی دولہن کو برتن مانجھنے پر لگا دیا تو؟" شبانہ کے خدشے کسی طور ختم نہ ہو رہے تھے۔

"شاہ نواز میرا بیٹا ہے۔ میں جانتی ہوں اسے اچھی طرح۔" بتول بی بی بہت پُریقین تھی مگر ذرا دیر بعد شاہ نواز کمرے سے نکلا تو اس کی متلاشی نگاہیں شہربانو کو ڈھونڈتی رہیں۔ اتنے میں شہربانو باورچی خانے سے باہر نکلی تھی۔

"برتن دھل گئے ہیں اماں! آٹا بھی گوندھ لیا ہے۔ اب یہ بتا دیں کہ پراٹھے بناؤں یا روٹیاں۔" اس نے ساس کے قریب آکر پوچھا تھا۔

"پراٹھے بنا لے۔" بتول بی بی نے جواب دیا وہ "جی اچھا" کہہ کر واپس مڑ گئی تھی۔ اتنے میں شاہ نواز بھی ماں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"میں تو سوچ رہا تھا! اماں! تو اپنی بہو سے پہلے کھیر پکوائے گی۔" اس نے شگفتہ انداز میں ماں کو مخاطب کیا۔ اپنی دانست میں تو اس نے یونہی بات برائے بات کی تھی مگر بتول بی بی کے اپنے دل میں چور چھپا تھا، بیٹے کی بات سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

"تیری جورو کو باورچی خانے میں گھسا دیا، غلطی ہو گئی بیٹے! معاف کر دینا۔ پہلے اس گھنی میسنی نے پاس آکر کتنی معصومیت سے اپنے کام گنوا دیے، ارے چار برتن مانجھ کر احسان نہیں کر دیا اس نے بچیاں آج دیر سے اٹھیں کہ شادی کے ہنگامے میں دو گھڑی آرام کی فرصت نہ تھی۔ آج سو کر تھکن اتار رہی تھیں۔ میں نے بھی یہ سوچ کر نہ جگایا لیکن تیری بیوی کی محتاج نہیں ہوں میں۔ ارے بتول بی بی کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم ہے کہ اپنے گھر کے کام آپ ہی سنبھالے۔ چل لڑکی! نکل باورچی خانے سے تیرے میاں کو برا لگا ہے کہ میں نے کھیر پکوائی سے پہلے تجھے کوئی کام کرنے کو کیوں کہہ دیا۔"

بتول بی بی تن فن کرتی باورچی خانے میں گئی تھی۔ پیچھے پیچھے شاہ نواز تھا۔ وہ ماں سے معافی مانگ رہا تھا۔

"میرا کہنے کا یہ مطلب تھوڑی تھا اماں! بھلا مجھے کیا اعتراض ہو گا شہربانو کے گھر کے کام کرنے پر۔ ظاہر ہے اس گھر کی بڑی بہو ہے۔ گھرداری اسی نے سنبھالنی ہے، کل سنبھالے یا آج۔"

وہ ماں کو منا رہا تھا۔ شہربانو بھی مسلسل گردن ہلا کر شوہر کی بات کی تائید کر رہی تھی مگر بتول بی بی ماش کی دال کی طرح اینٹھے جا رہی تھی۔

"جاؤ بہو بیگم! تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں بنا لوں گی ناشتا۔" بتول بی بی چولہے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ شہربانو کی منت سماجت کے باوجود وہ وہاں سے نہ ہٹی۔

"کہہ دیا نا بھابھی! جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ سامنے کھڑی رہو گی تو بات بڑھتی جائے گی۔"

ندرت نے شہربانو کو مخاطب کیا۔ وہ آنسو پیتی، لب کچلتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ باہر اب بھی یہ ہی شور شرابا جاری تھا۔ شبانہ، ندرت اور شمسہ بھائی سے خفگی جتا رہی تھیں۔ بتول بی بی کی فنکارانہ صلاحیتیں تو خیر آج کل عروج پر تھیں۔

جتنی دیر ناشتے کا دور مکمل ہوا۔ وہ بکتی جھکتی ہی رہی تھی، آخر شاہ نواز نے اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی تھی جب جا کر وہ خاموش ہوئی تھی۔ شہربانو کا دل صبح ہی صبح یہ ہنگامہ دیکھ کر سہما جا رہا تھا۔ سسرال میں اس کی

آئندہ زندگی کیسی گزرنی تھی اس کی جھلک اسے آج نظر آئی تھی۔

شاہ نواز ماں سے معافی تلافی کے بعد باہر چلا گیا تھا اس نے دوبارہ کمرے سے باہر جانے کی غلطی نہ کی اور وہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹکی خود میں باہر جانے کی ہمت پیدا کر رہی تھی۔ اسے بیدار ہوئے بلا مبالغہ ساڑھے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے، رات کی کھائی آدھی روٹی تو شاید آدھی رات سے بھی پہلے ہضم ہو چکی تھی شدید بھوک کا احساس دیگر احساسات پر حاوی ہوا تو وہ پھر کمرے سے نکل آئی۔

شمسہ بے دلی سے برآمدے کی جھاڑو لگا رہی تھی۔ شبانہ، ندرت اور بتول بی بی ایک ہی چارپائی پر سر جوڑے بیٹھی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر تینوں چپ ہو گئیں۔

"کیسی منحوس شکل ہے، پہلے دن ہی گھر میں فساد ڈلوا دیا۔" شبانہ کی بڑبڑاہٹ اس تک صاف پہنچ گئی تھی۔

"لاؤ شمسہ! صفائی میں کر لیتی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں چھوٹی نند کو مخاطب کیا۔ ناشتے کے لیے کچن میں گھسنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ شمسہ تو جھاڑو پھینک کر ایک دم کھڑی بھی ہو جاتی مگر بتول بی بی نے طنز کا تیر چلا دیا تھا۔

"نہ بی بی! نہ۔ اس گھر کے کام تم سے پہلے بھی ہو جاتے تھے۔ اب بھی ہو جائیں گے پھر میاں کے کان بھرو گی کہ ہم نے تمہیں شادی کے دوسرے دن ہی کام پر لگا لیا۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

شہربانو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اپنی صفائی کے لیے اس سے ایک لفظ نہ بولا گیا۔

"اچھا اماں! چھوڑ بھی دو۔ غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے، چل اٹھ شمسہ! بھابھی کہہ رہی ہے تو اس کو کر لینے دے صفائی۔" شبانہ نے بہت تدبر کا مظاہرہ کیا۔

شہربانو نے شکر گزار نگاہوں سے نند کو دیکھا تھا۔ شمسہ بھی جان چھوٹنے پر خوشی خوشی بھابھی کے ہاتھ میں جھاڑو تھما کر کمرے میں گھس گئی۔ جھاڑو دے کر وہ ہاتھ دھونے کے بعد چپ چاپ کچن میں چلی گئی۔ کیتلی میں تھوڑی سی چائے بچی پڑی تھی ہاٹ پاٹ میں سے ایک روٹی بھی برآمد ہو گئی۔ اس کے لیے یہ ہی بہت تھا۔ ناشتا کر کے اس نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ کتنی تگ و دو کے بعد یہ کھانا نصیب ہوا تھا۔ بے تحاشا غربت کے باوجود چاچا کے گھر میں کبھی بھوکے رہنے کی نوبت نہیں آئی تھی پھر اگلے ہی پل اسے استانی ہاجرہ کی بات یاد آئی۔

"شکر گزاری کا وصف اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ ہمیں ایک وقت کھانے کو نہ ملے تو جیسے اللہ تک سے خفا ہو جاتے ہیں بھول جاتے ہیں کہ جس نبی کے ہم امتی ہیں۔ انہوں نے تو پیٹ پر پتھر باندھ کر بھوک کا مقابلہ کیا ہے۔ یاد رکھو! نعمت ملنے پر شکر واجب ہے تو نعمت نہ ملنے پر بھی صبر اور شکر کو ہی اختیار کرنا چاہیے۔ جو شکر کرنا بھول جاتا ہے اللہ کے محبوب بندوں کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے۔"

"اے اللہ تو مجھے ہمیشہ اپنے شکر گزار بندوں میں شامل رکھنا۔"

شہربانو نے بہت جذب سے آنکھیں بند کر کے رب کو پکارا تھا۔ اتنے میں بتول بی بی باورچی خانے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبزی کا شاپر تھا، اس نے ابھی گلی میں سے گزرنے والے سبزی والے سے خریدی تھی۔

"یہ آنکھیں بند کر کے کیا منتر پڑھ رہی ہے۔ لے یہ سبزی بنا۔" بتول بی بی نے اسے کرخت انداز میں پکارا تھا۔ اس نے جیسے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ پھر جلدی سے ساس کے ہاتھ سے شاپر تھاما تھا۔

"شاہ نواز دوپہر کو کسی بھی وقت دکان بند کر کے گھر آسکتا ہے اس کے آنے سے پہلے کھانا تیار ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا اماں۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا تھا۔

وہ پورا دن اس گھر میں اس کی حیثیت کا تعین کرنے

کے لیے کافی تھا۔ وہ لوگ شہربانو کو بہو یا بھاوج نہیں، محض ایک نوکرانی سمجھ کر بیاہ لائے تھے۔

☼ ☼ ☼

شہربانو ماتھے پر شکن لائے بغیر بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرتی تھی مگر جانے پھر بھی کوئی اس سے کیوں خوش نہ ہوتا تھا۔ وہ سب کے لیے اپنی اپنی فرسٹریشن نکالنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ جس کا جی چاہتا بغیر کسی قصور کے اس پر چڑھائی کیے رکھتا۔ اور تو اور سب سے چھوٹی شازیہ بھی اس سے نہایت بدتمیزی سے پیش آتی باقیوں کا تو خیر کیا کہنا۔

شہربانو بے زبان گائے ہی ثابت ہو رہی تھی۔ کبھی کبھار وہ تھکنے لگتی، اس کے اعصاب ہر وقت کی ٹینشن برداشت کرتے ہوئے چیخ چیخ جاتے۔ آخر تھی تو انسان ہی نا۔ لیکن پھر استانی ہاجرہ کی باتیں یاد آتیں تو نئے سرے سے ہمت بندھ جاتی اور وہاں شاہ نواز کی چند لمحوں کی قربت بھی تو اس میں نئی توانائی بھر دیتی تھی۔

رات کو جب وہ بتول بی بی کے پیر دبا کر کمرے کا رخ کرتی تو دن بھر کا تھکا ہارا شاہ نواز سو چکا ہوتا تھا لیکن شہربانو کی آہٹ پا کر اس کی آنکھ کھل جاتی اور جب وہ خمار آلود آنکھوں سے اسے تکتا تو شہربانو کے دل کی دنیا زیر زبر ہو جاتی۔ شاہ نواز اور اس کے مابین اتنے دن گزر جانے کے باوجود تکلف کے پردے حائل تھے۔ میاں بیوی کا فطری تعلق تو قائم تھا لیکن نئے نویلے شادی شدہ جوڑوں والی کوئی بات نہ تھی۔

شاہ نواز اپنے دوستوں کے قصے سنتا تھا۔ بیویوں کا روٹھنا، ناز نخرے دکھانا، لڑنا، جھگڑنا، شہربانو میں ان میں سے کوئی بھی بات نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ اسے کسی کہانی کا پُراسرار کردار لگتی۔ صبح سے شام تک وہ کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کاموں میں جتی رہتی تھی شاہ نواز اس حقیقت سے واقف تھا لیکن اس نے کبھی شہربانو کے لبوں سے حرف شکایت نہ سنا۔ وہ رات کو اس کے پاس آتی تو اس کے لبوں پر مدھر سی مسکان ہوتی۔

بیویاں شوہروں کے کان بھرتی ہیں۔ انہیں ان کے گھر والوں کے خلاف اکساتی ہیں شاہ نواز اس حقیقت سے باخبر ہونے کی وجہ سے منتظر تھا کہ کب شہربانو اس کے گھر والوں کی شکایت اس سے کرتی ہے اگرچہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس کی کسی بھی قسم کی شکایت پر کان نہیں دھرے گا۔

وہ اپنی ماں سے کیے گئے عہد پر قائم تھا اگر اس کی بیوہ ماں اس کی بیوی کو غلط بات پر جھڑک بھی دیتی ہے تو یہ اس کا حق تھا۔ اس نے اپنی جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے بیٹے کا گھر بسایا تھا۔ ان کی یہ اعلا ظرفی وہ کیسے فراموش کر دیتا وہ اپنی ماں کا سہارا اور بہنوں کا مان تھا۔ جورو کا غلام اس کے لیے ایک ایسا طعنہ تھا جو وہ نہ کبھی سن سکتا تھا نہ برداشت کر سکتا تھا سو اس کے گھر والوں کو شہربانو کے ساتھ ہر قسم کا رویہ روا رکھنے کی اجازت تھی۔

جس دن بتول بی بی نے ہنڈیا جل جانے پر شہربانو کی چٹیا کھینچ کر اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کیا۔ اس دن پہلی بار شہربانو کا جی چاہا کہ وہ شوہر کے سامنے ساس کی زیادتی بیان کرے۔ وہ تو چولہے کی آنچ دھیمی کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تھی اور جب چار فرضوں کا سلام پھیرا تو ندرت کو کچن میں جاتے دیکھا۔

"ندرت! چولہا بند کر دینا۔ سالن تیار ہے" بس ہرا دھنیا ڈال کر دم پر رکھا تھا۔"

اس نے ساتھ ہی وضاحت بھی دی۔ اس کا خیال تھا کہ ندرت کھانا لینے ہی کچن میں جا رہی ہے۔ وہ بھوک کی کچی تھی اور گرما گرم کھانے کی شوقین بھی۔ سالن پکنے کے ساتھ ہی پلیٹ میں سالن اور چنگیر میں روٹی رکھ کر پھر سے کمرے میں گھس کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ وہ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے تو یقیناً ٹی وی دیکھنے میں ہی گزارتی تھی۔

ندرت نے بھاوج کے پکارنے پر اسے دیکھا۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا گلابی چہرہ کیسے دمک رہا تھا۔ ندرت ابھی کنگھی چوٹی کر کے کمرے سے نکلی تھی۔ آئینہ اس کی بڑھتی عمر کی صاف صاف چغلی کھا رہا تھا۔

شہربانو کے حسن نے اسے ایک دم سے جلاپے میں مبتلا کردیا۔ اس نے شہربانو کو جواب میں "اچھا بھابھی!" کہا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ نیت باندھ لی۔

ندرت نے پلیٹ میں اپنا سالن نکالا۔ چن چن کر اچھی بوٹیاں ڈالیں اور چولہا بند کرنے کے بجائے آنچ بڑھا دی تھی۔ شہربانو نے دو سنت کے بعد دو نفل کی نیت باندھی ہی تھی کہ ہنڈیا جلنے کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ شبانہ کی فرمائش پر آج اس نے بہت کم شوربے والا تقریباً "بھنا ہوا گوشت بنایا تھا۔ تیز آنچ پر ہنڈیا نے جلنا ہی تھا۔ وہ جتنی دیر میں سلام پھیر کر باورچی خانے میں پہنچی۔ بتول بی بی پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

"تجھے اپنی نمازوں سے فرصت نہیں' ہنڈیا چولہے پر رکھ کر نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ پتا بھی ہے گوشت کس بھاؤ ملتا ہے کلموہی۔" بتول بی بی نے پہلے تو ڈوئی ہی اس کی کمر پر ٹکائی تھی۔

"اماں! میں نے تو ندرت سے کہا تھا کہ وہ چولہا بند کردے۔" اس نے روتے ہوئے وضاحت دی۔

"توبہ! کتنی جھوٹی ہو تم بھابھی۔" ندرت بھی فوراً کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس گواہی کے بعد شہربانو کو آگے نہیں بولنا چاہیے تھا مگر اس نے غلطی کی اور بول پڑی۔

"ندرت! تم نے جواب میں مجھے "اچھا بھابھی" بھی کہا تھا تب ہی میں نے مطمئن ہو کر نیت باندھی تھی۔" اس نے ندرت کو یاد دلانا چاہا اور جب ہی بتول بی بی نے اس کی چٹیا کھینچ کر اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا۔

"میری بیٹی پر الزام لگا رہی ہے ڈائن!" اس نے اپنا ہاتھ گال پر رکھ کر نفی میں گردن ہلادی۔

"نہیں اماں! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تیرا جو بھی مطلب تھا' دفع ہو جا یہاں سے۔" بتول بی بی دھاڑی۔ وہ آنسو پیتی وہاں سے ہٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن اتفاق سے استانی ہاجرہ اور چاچی اس سے ملنے آ گئیں۔ شادی کے بعد وہ صرف ایک بار چچا کے گھر گئی تھی۔ بتول بی بی کے دل میں اس روز جانے کیا نیکی سمائی تھی کہ اسے اس کے میکے ملوانے لے گئی تھی یہ شادی کے تھوڑے دن بعد کی بات تھی' اب تو اس بات کو بھی مہینوں گزر گئے تھے۔ چاچی اور استانی ہاجرہ کو دیکھ کر اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ ان سے مل کر رو پڑی تھی۔

"ایسے نیر بہا رہی ہے جیسے پتا نہیں' ہم نے کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں بنو پر۔" بتول بی بی چمک کر بولی تھی۔ چاچی نے سراسیمہ ہو کر اسے خود سے الگ کیا۔

"بہت دن بعد ملاقات ہو رہی ہے نا' اسی لیے ذرا جذباتی ہو گئی ہے۔" استانی ہاجرہ نے سینے سے چمٹا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے اس کی ساس کو جواب دیا تھا۔

شہربانو' چاچی اور استانی کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

"ماشاء اللہ کیسی اچھی قسمت پائی ہے اپنی شہربانو نے۔ پکا مکان' اپنا الگ کمرہ اور کیسا گبھرو جوان میاں۔ اللہ میری منی اور کاکی کے بھی ایسے ہی نصیب کھولے۔" چاچی اس کے کمرے میں آ کر بے ساختہ بول اٹھی تھی۔ شہربانو کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ چاچی کی دعا کے جواب میں آمین بولے یا نہیں۔

"تو خوش تو ہے نا بانو؟" استانی ہاجرہ بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"پتا نہیں استانی جی۔" شہربانو نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ناشکری نہ بن شہربانو! تجھے تو تیری اوقات سے بڑھ کر ملا ہے۔" چاچی نے اسے فوراً "ٹوکا تھا۔

"میرا رب گواہ ہے چاچی! کہ میں اس سے صبر اور شکر کی توفیق کے سوا اور کچھ نہیں مانگتی۔" شہربانو کی آنکھ سے آنسو ٹپکے تھے۔

"کیوں نہیں مانگتی جھلی! اس رب کے خزانے میں کوئی کمی تھوڑی ہے' جو دل چاہتا ہے مانگا کر اس سے۔ اب تک تیری گود بھی ہری نہیں ہوئی۔ یہ دعا نہیں کرتی کیا۔" چاچی اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی شہربانو کے چہرے پر ایک لمحے کو شرمگیں مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔

"بتول بی بی کچھ اکھڑی سی لگ رہی تھی۔ تیرے ساتھ رویہ زیادہ برا تو نہیں اس کا؟" استانی ہاجرہ کو بالکل ماؤں والے خدشات ستا رہے تھے۔

"استانی جی! آپ نے مجھے ہمیشہ سچ کی تلقین کی۔ غیبت سے منع کیا۔ میری تو زبان بندی ہے جی۔ آپ کی باتوں کا کیا جواب دوں۔" شہربانو ٹوٹے بکھرے لہجے میں بولی۔

"اللہ تجھے استقامت دے شہربانو! اپنا معاملہ اسی کے سپرد کر دیا کر۔ کوئی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور تسبیحات اور درود شریف کا ورد کیا کر۔ اللہ تیرے دل کو سکون سے بھر دے گا۔" استانی ہاجرہ نے اسے سمجھایا۔

"دیکھ لے شہربانو! میں کہتی تھی ناں! کہ تو بہت خوش قسمت ہے۔ ارے استانی جی جیسی ہستی ہر وقت تیرے لیے دعا گو رہتی ہیں۔ سچ بتاؤں تو آج مجھے تیری استانی ہی ساتھ لائی ہیں۔ تجھے تو پتا ہے' میرے پاس تو کرائے کے پیسے تک نہیں ہوتے۔" چاچی نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے تشکر اور محبت سے مغلوب ہو کر استانی ہاجرہ کے ہاتھ تھام لیے۔

"شکریہ استانی جی!" اس کی آنکھیں ان کی محبت پر نم ہو گئی تھیں۔

"کیسا شکریہ' تو بیٹی ہے میری' صرف کہتی نہیں ہوں۔ سمجھتی بھی ہوں۔" استانی ہاجرہ نے اسے پھر سے سینے سے لگا لیا۔

"میں آپ لوگوں کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے پتا تھا کہ سسرال والوں میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں ہو گی کہ اس کے مہمانوں کو چائے پانی کا پوچھ لیں لیکن وہ اپنے مہمانوں کی خود خاطر کر سکتی ہے یہ بھی اس کی بھول ہی تھی۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر چائے کا پانی چڑھایا ہی تھا کہ شبانہ آ گئی۔

"اماں کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے اور تجھے اپنے مہمانوں کی خاطریں سوجھ رہی ہیں۔ سچ سچ بتا۔ شاہو کے موبائل سے فون کیا تھا نا اپنے سگوں کو؟ ابھی تو اماں نے ایک طمانچہ ہی مارا ہے۔ اگر جان سے بھی مار دے گی نا تو تیرے یہ ٹٹ پونجیے رشتہ دار کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے ہمارا۔ آئی بات عقل شریف میں۔" شبانہ نے اس کے ہاتھ سے پتی کا ڈبا کھینچا تھا۔ وہ بنا کوئی صفائی' کوئی وضاحت دیے واپس پلٹ گئی۔ کمرے میں پہنچی تو چاچی چادر اوڑھ چکی تھی اور استانی ہاجرہ برقعہ پہننے والی تھیں۔ اسے دیکھ کر دونوں اس سے نظریں چرا کر رہ گئیں۔ شبانہ کی پاٹ دار آواز یقیناً" ان تک آسانی سے پہنچ چکی تھی۔

"تھوڑی دیر تو بیٹھیے۔ آپ لوگ ابھی آئے' ابھی چل دیے۔" وہ انہیں اتنی جلدی جاتا دیکھ کر بے چین ہوئی تھی۔

"تیری نند اس سے پہلے ہمیں اٹھا کر باہر پھینکے' ہمیں خود چلے جانا چاہیے۔" چاچی کا چہرہ ان کے غصے کا پتا دے رہا تھا۔

"آپ کو غصہ مجھ پر آ رہا ہے یا میری نند پر؟" شہربانو نے ہنس کر پوچھا۔

"تو کتنی ڈھیٹ ہو گئی ہے شہربانو! وہاں گھر میں کبھی میں تجھے ہلکا سا بھی ڈانٹ دیتی تھی تو رضائی میں منہ چھپا کر ساری رات روتی تھی اور اب تیرے کیسے دانت نکل رہے ہیں۔" چاچی نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"تو کبھی کبھار ڈانٹتی تھی نا چاچی! اگر روز ڈانٹتی تو میں اس وقت بھی ڈانٹنے پر رونے کے بجائے ہنس پڑتی۔" اس نے انہیں مخاطب کیا۔ چاچی آبدیدہ ہو گئی۔

"غربت بہت بڑی کمزوری ہے شہربانو۔ اگر تیرا چاچا مال دار شخص ہوتا تو بھلے تیرے ماں پیو سلامت نہ ہوتے مگر تیری اتنی بے قدری نہ ہوتی' اب تو واقعی اللہ کے سوا تیرا کوئی آسرا نہیں۔ برداشت کرتی رہ میری بچی۔"

"اللہ کے آسرے سے بڑھ کر اور کس کا آسرا ہو سکتا ہے۔ شہربانو بیٹی! اپنے سارے معاملات اللہ کے سپرد کر دے۔ زندگی میں آپ ہی آپ سکون آجائے گا۔" استانی ہاجرہ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے نصیحت کی تھی اور استانی ہاجرہ کی تو ہر نصیحت شہربانو کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

نمازیں تو وہ پہلے بھی بہت باقاعدگی سے پڑھتی تھی اب ان میں مزید خشوع و خضوع آگیا تھا۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔ حیرت انگیز طور پر اس وقت اسے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیاں بھی بھول جاتیں اور زیادتی کرنے والے بھی۔ وہ رب سے صرف اس کا قرب مانگتی تھی۔ کیسا پیارا رشتہ جڑ گیا تھا اس کا اپنے رب کے ساتھ اور دل میں عجیب سا سکون اترتا جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے چہرے پر پھیلنے والے اس بے تحاشا اطمینان نے اس کی ساس نندوں کو بے اطمینانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ سارا دن وہ اسے کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کاموں میں جوتے رکھتی تھیں۔ طعنے' تشنیع' طنز کے تیر اور اب تو بتول بی بی اور شبانہ اس پر بلا جھجک ہاتھ بھی اٹھانے لگی تھیں لیکن اس کے اطمینان اور سکون میں آخر کیوں فرق نہ آتا تھا۔ کہیں در پردہ اسے شاہ نواز کی سپورٹ تو حاصل نہ تھی۔ رات کے چند گھنٹے جو وہ اکٹھے گزارتے تھے یقیناً" شہربانو شوہر کے سامنے دکھے دل کے پھپھولے پھوڑتی تھی اور شاہ نواز اسے تسلی دلاسا دیتا ہو گا۔

"جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم کسی کی پروا کیوں کرنے لگی ہو۔ مشکل کے یہ دن جلد کٹ جائیں گے۔ چھوٹی تینوں بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی اماں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہیں کب تک جیئیں گی اور رہی شبانہ آپا تو اماں کے بعد اس کا دم خم بالکل ہی ختم ہو جائے گا۔"

شبانہ کے ذہن کے پردے پر فرضی سین چلتا اور وہ مزید بپھر جاتی۔ اسے شاہ نواز کی لاتعلقی اور شہربانو کی ذات سے روا رکھے جانے والی لاپروائی محض ایک ڈراما معلوم ہوتی۔ بھلا ایسی حسین و جمیل نازک اندام بیوی سے کوئی کس طرح اتنا لاتعلق رہ سکتا ہے۔ یہ میاں بیوی محض گھر والوں کو مطمئن رکھنے کے لیے ڈراما کرتے تھے۔

شبانہ سوچ سوچ کر خود بھی پاگل سی ہو جاتی تھی اور ماں کو بھی مسلسل شہربانو کے خلاف اکساتی رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

شہربانو ناکردہ گناہوں کی سزا بھی بہت خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی لیکن پھر گھر میں کچھ انوکھا ہونا شروع ہو گیا۔

بتول بی بی نے سالن میں مرچ زیادہ پڑ جانے کی پاداش میں شہربانو کی چٹیا کھینچ کر اسے تھپڑ رسید کیا تھا اور اسی دن شام کو جب وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے شمسہ سے کوئی بات کر رہی تھی۔ شبانہ کا لڑکا بھاگتا بھاگتا اس سے ٹکرایا اور گرم گرم چائے نے بتول بی بی کا ہاتھ جلا دیا۔ یہ اتفاقی حادثہ تھا۔ کسی نے کچھ نہ سوچا مگر جب ایسے اتفاقی حادثے بار بار رونما ہونے لگے تو گھر بھر میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

بتول بی بی کے بٹوے سے ندرت نے پیسے اڑا کر الزام شہربانو پر دھرا۔ اس کی لاکھ صفائیوں کے باوجود مجرم وہی قرار پائی اور سزا کی حق دار بھی مگر اگلے دن جب بتول بی بی قریبی محلے کے ایک گھر سے اپنی تازہ نکل جانے والی کمیٹی کی خطیر رقم خوش خوش لے کر آ رہی تھی' ایک نقاب پوش لڑکے نے پستول دکھا کر ساری رقم لوٹ لی تھی۔ ندرت کو اتنا تیز بخار چڑھ گیا کہ اسے غش آنے لگے۔ شبانہ کے سر میں تو مستقل درد رہنے لگا تھا۔

"ارے یہ جادوگرنی ہے' جانے کیا وظیفے کر کے ہم پر پھونکتی ہے۔ ہمیں برباد کر کے چھوڑے گی یہ۔"

بتول بی بی شاہ نواز کے علم میں سارا معاملہ لائی تھی۔ جس دن سے ہاتھ جلا تھا' وہ شہربانو پر دوبارہ ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرپائی تھی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو اماں! شہربانو بھلا کیوں جادو کرنے لگی تم پر۔" شاہ نواز نے پہلی بار اس کی سائیڈ لی۔ شہربانو نے ممنون نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔

"تو نہ مان' جورو کا غلام نہ ہو تو۔ میں پوچھتی ہوں یہ جو ہر وقت مصلیٰ بچھائے کھڑی رہتی ہے تو کیا پڑھتی ہے۔ ہر وقت ہاتھ میں تسبیح اور ہلتے ہوئے لب میری بچیوں کو خوف آنے لگا ہے اس کی صورت دیکھ کر۔ اسے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ بھی لے تو کسی منحوس چکر کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے ہم کیسے اس کے شر سے محفوظ رہیں۔ بس تو اسے فارغ کر دے۔ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے دفعان کر دے۔" بتول بی بی کے کہنے پر شہربانو کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔

"وہم چھوڑ دو اماں! اس جیسی بالشت بھر کی لڑکی کو جادو منتر آتے ہیں اس سے بڑا تو کوئی لطیفہ ہو ہی نہیں سکتا۔" شاہ نواز کو بڑی بے موقع ہنسی آئی تھی اور شہربانو کے سینے میں کب سے اٹکا سانس بحال ہوا تھا۔ بتول بی بی محض پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھی اور رات کو پہلی بار شہربانو نے شوہر سے ڈرتے ڈرتے سوال پوچھا تھا۔

"اگر اماں نے آپ پر دباؤ ڈالا تو کہیں آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟"

"تم میری ماں بہنوں کو خوش رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں شہربانو! شادی کے بعد سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب مجھے تمہارے بارے میں کوئی شکایت سننے کو نہ ملی ہو۔" شاہنواز نے اس کا سوال جیسے سنا ہی نہ تھا۔

"میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی ہوں کہ اماں اور باقی سب لوگ مجھ سے خوش رہیں۔ آپ نے کبھی مجھے ان کی حکم عدولی کرتے دیکھا؟" شہربانو نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا پتا میں سارا دن گھر سے باہر گزارتا ہوں لیکن یہ بات یاد رکھنا شہربانو کہ اس گھر میں تمہیں میری ماں لے کر آئی ہے اگر وہ ہی تم سے خوش نہ رہی تو میں تمہارے بارے میں اس کا ہر حکم' ہر فیصلہ ماننے کا پابند ہوں گا۔"

شاہ نواز نے تو ویسے ہی اسے دباؤ میں رکھنے کی غرض سے بات کی تھی کہیں وہ اس کے دوستوں کی بیویوں کی طرح وقت گزرنے کے ساتھ پر پرزے نہ نکال لے لیکن شہربانو کو تو جیسے اس کی بات سن کر سکتہ ہو گیا تھا۔

"ایک بات یاد رکھیں شاہ نواز! آپ نے مجھے اللہ رسولؐ کو گواہ بنا کر اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔ میں اس گھر کی چار دیواری میں آپ کا اور آپ کے گھر والوں کا ہر حکم مانوں گی۔ مجھ پر کوئی سا بھی ستم توڑ دیں میں اف نہیں کروں گی لیکن اگر آپ نے مجھے اپنی زندگی سے نکالنے کی بات کی تو۔"

وہ بات کرتے کرتے رکی۔ شاہ نواز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کا یہ لہجہ اور یہ انداز اس کے لیے بالکل نئی چیز تھا۔

"اچھا تو کیا کر لو گی تم؟" اس نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا۔ شہربانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر دوبارہ گردن جھکالی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"ہاں! تم نے اپنی دھمکی ادھوری چھوڑ دی۔ میں سننا چاہتا ہوں کہ تم کیا کر لو گی؟" شاہ نواز صاف صاف اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"تو میں مر جاؤں گی شاہ نواز!" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی تھی۔ شاہ نواز قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"دھمکی تو ایسے دے رہی تھیں کہ مجھے جان سے مار دو گی۔"

"میرے بغیر آپ کا خود ہی جینے کو دل نہیں کرے گا۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

اس دھوپ چھاؤں کے منظر کو شاہ نواز نے بہت دلچسپی سے دیکھا تھا اس کا دل چاہا کہ اس کامنی سی لڑکی کو خود سے قریب کر کے اس کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے گھر والے بعض اوقات

اس کے ساتھ بہت زیادتی کر جاتے ہیں، وہ کبھی اس کے سامنے حرف شکایت لبوں پہ نہ لائی تھی لیکن ایک بار پھر شاہ نواز کا دماغ اس کے دل پر حاوی آگیا تھا۔

بیوہ ماں اور بن بیاہی بہنوں کو خوش رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بیوی کو اس کی اوقات میں رکھا جائے۔ باپ کے گزرنے کے بعد اس کی ماں بہنوں کا اس کے سوا تھا ہی کون۔ وہ ماں بہنوں کا دل دکھا کر اپنی عاقبت خراب نہ کرنا چاہتا تھا رہی بیوی تو وہ کون سا اس پر ظلم و ستم توڑتا تھا۔ اس نے آج سے اس پر ہاتھ تک نہ اٹھایا تھا۔ ماں جتنا مرضی اس کے کان بھرتی، وہ ماں کے سامنے اسے جھڑک تو دیتا مگر ماں کی خواہش کے باوجود کبھی اسے مارا پیٹا نہ تھا اس سے زیادہ وہ شہربانو کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ وہ اگر فرماں بردار بیٹا تھا تو اچھا شوہر بھی تھا۔ اس معاملے میں اس کے دل و دماغ مطمئن تھے لیکن اس کی ماں بہنوں کو ہر گزرتے دن کے ساتھ شہربانو سے شکایتیں بڑھتی جارہی تھیں۔

انہیں یقین ہو گیا تھا کہ شہربانو عملیات جانتی ہے اور ان پر جادو کرتی ہے۔ بتول بی بی نے اس کے ہاتھ سے تسبیح تک چھین لی تھی۔ وہ نماز کے بعد دیر تک بیٹھ کر دعا نہیں مانگ سکتی تھی۔ آخری رکعت کا سلام پھیرتے ہی بتول بی بی اسے کسی نہ کسی کام سے اٹھا دیتی لیکن شہربانو کے ساتھ کوئی بھی زیادتی کرتا وہ واقعی کسی نہ کسی انہونی کی لپیٹ میں آجاتا۔ اس صورت حال سے شہربانو خود بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"اے اللہ! میرے حال پر رحم فرما۔ تو جانتا ہے کہ میں تو کبھی ان لوگوں کی کسی زیادتی پر تیرے سامنے کوئی بددعا بھی زبان پر نہ لائی۔ میں تو ہر حال میں تیرا شکر بجا لانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بیتنے والے حادثوں پر مجھے قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ اے اللہ مجھ پر بھی رحم فرما اور ان سب پر بھی۔"

شہربانو کو دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کا موقع نہ بھی ملتا تب بھی وہ دل ہی دل میں اپنے رب کو پکارتی رہتی لیکن اس گھر کے لوگوں کے لیے وہ قطعی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

"جو کچھ کرنا ہے اماں! وہ ہم نے ہی کرنا ہے۔ دیکھ شاہو نے کیسے ہنستے ہوئے اس کی سائیڈ لی تھی۔ یہ بالشت بھر کی لڑکی جادو ٹونا کر ہی نہیں سکتی۔" شبانہ نے بھائی کی نقل اتاری تھی۔

"تو صحیح کہہ رہی ہے شبانہ! اس ڈائن کو گھر سے نکالنا ضروری ہے ورنہ کھا جائے گی ہمیں۔" بتول بی بی نے اپنے ماتھے کی چوٹ سہلاتے ہوئے کہا۔ کل ہی وہ پاؤں پھسلنے سے گر پڑی تھی اور ماتھے پر گومڑ نکل آیا تھا۔

"اور اس ڈائن کو گھر سے نکالنے کے بعد اگر ہم کسی اور مصیبت میں گرفتار ہو گئے تو؟" شمسہ نے چھوٹی ہونے کے باوجود کیا اچھا نکتہ اٹھایا تھا۔

"تو بھگت لیں گے مصیبت۔ ایک دفعہ ہی بھگتنی پڑے گی نا۔ اس جادوگرنی کو گھر میں رکھا تو اس کی نحوست کے چکر سے نکل ہی نہیں پائیں گے۔" شبانہ سب سے زیادہ خدشات میں مبتلا تھی۔

"تو سوچو کوئی ایسی ترکیب کہ ہمیشہ کے لیے اس منحوس شکل سے پیچھا چھڑوا لیں۔"

ندرت نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆
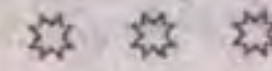
کسی کو ترکیب لڑانے کی ضرورت ہی نہ پڑی خود بخود ایسی صورت حال بن گئی جو سراسر شہربانو کے خلاف جاتی تھی۔ پڑوس میں ایک نیا خاندان آکر آباد ہوا تھا۔ ان کے تیسرے نمبر والے لڑکے سے شمسہ کا زوردار افیئر چل رہا تھا۔ گھر والوں کو اس معاشقے کی کانوں کان خبر نہ تھی ویسے بھی سب کے سب شہربانو والے مسئلے میں ہی الجھے ہوئے تھے۔

اس روز آدھی رات کو شمسہ کو امجد کا میسج آیا۔

"تمہارے سب گھر والے سو چکے ہیں نا جانو؟" اور جانو نے فوراً" ہی "ہاں" لکھ کر بھیج دیا۔

"تو پھر فوراً" اوپر آجاؤ۔" امجد کا اگلا میسج پڑھ کر شمسہ کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔

"میں درمیانی دیوار پھاند کر تمہاری چھت پر پہنچ چکا ہوں جان من اور کتنا تڑپاؤ گی۔ کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی مگر فوراً" مجھ سے ملنے پہنچو' اس سے پہلے کہ کوئی اور جاگ جائے۔"

اور شمسہ دبے پاؤں چلتی کمرے سے باہر نکلی تھی مگر کوئی اور اس سے پہلے جاگا ہوا تھا۔ وہ شہربانو تھی جو صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔ آدھی رات کو یہاں بیٹھ کر کون سا چلہ کاٹ رہی ہو بھابھی؟" شمسہ نے تنفر بھرے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے شمسہ! اندر کمرے میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے۔" شہربانو نے اپنی نم ہوتی ہتھیلیاں آپس میں مسلی تھیں۔ شمسہ کا جی چاہا' اس کی گردن مروڑ دے۔ امجد سے ملنے کا پروگرام چوپٹ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اگر تم ایک مہربانی کرو شمسہ تو کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چھت پر چلو۔ ٹھنڈی ہوا میں تھوڑی سی چہل قدمی کر کے ہو سکتا ہے طبیعت میں کچھ بہتری محسوس ہو۔"

اس نے بہت لجاجت سے شمسہ کو مخاطب کیا۔ اس کی طبیعت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی جیسے کوئی مٹھی میں پکڑ کر دل مسل رہا ہو۔ بے تحاشا گھبراہٹ اور بے چینی نے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔

شمسہ نخوت سے "ہونہہ" کہہ کر واپس کمرے میں گھس گئی۔ اس کا خیال تھا۔ شہربانو تنہا اوپر جانے کی ہمت نہ کرپائے گی اور واپس اپنے کمرے میں چلی جائے گی مگر چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے دروازے کی جھری میں سے باہر دیکھا۔ شہربانو چھت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اتنے میں امجد کا دوبارہ میسج آیا تھا۔

"آخر کب پہنچو گی تم اوپر۔ میری بے قراری بڑھتی جارہی ہے۔"

شمسہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اگر اوپر شہربانو اور امجد کا آمنا سامنا ہو گیا تو؟ شہربانو نے ایک اجنبی کو چھت پر ٹہلتا دیکھ کر یقیناً" زوردار چیخ مارنی تھی اور اگر شاہ نواز وہاں پہنچ کر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو بات کھل جانی تھی۔ منحنی سا امجد تو شاہ نواز کے ایک گھونسے کی تاب نہ لاتے ہوئے جھٹ سے شمسہ کا نام لے دیتا۔ شمسہ محلے کے لڑکوں کی بزدلی سے واقف تھی۔ وہ سارا الزام محبوبہ کے سر پر رکھ کر خود معصوم بن جاتے تھے۔

شمسہ نے بہت تیزی سے صورت حال کا تجزیہ کیا اور پھر برق رفتاری سے شہربانو کے پیچھے زینے کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ زوردار چیخ مارنے کا فریضہ اب شہربانو کے بجائے اس کو انجام دینا تھا اور اس کی چیخ سن کر چند لمحوں میں گھر والے اوپر پہنچ چکے تھے۔ شہربانو متوحش نگاہوں سے شمسہ کو دیکھ کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی تو حواس باختہ امجد بھی اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اپنی چھت سے یہاں کودنا آسان تھا مگر کسی میز' اسٹول یا سیڑھی کے بغیر یہاں سے واپس جانا مشکل کام تھا اگر شمسہ کی مدد شامل حال ہوتی تو وہ شمسہ سے ملنے کے بعد آسانی سے واپس جا سکتا تھا۔

چھت کے ایک کونے میں بنے اسٹور نما کمرے سے یقیناً" کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور برآمد ہو جانی تھی جس پر پاؤں رکھ کر امجد واپسی کا سفر طے کر سکتا تھا۔ لیکن اب صورت حال مختلف تھی جس شمسہ کے پیار اور بھروسے میں اندھا ہو کر وہ یہاں پہنچا ہوا تھا' وہی شمسہ چیخ مار کر اپنے گھر والوں کو اکٹھا کر چکی تھی۔

"مجھے سوتے سوتے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہوئی' میں نے سوچا چھت پر جا کر چہل قدمی کر لوں مگر اوپر آئی تو بھابھی اور یہ......"

اس نے آگے کا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ شہربانو نے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ شمسہ کو دیکھا جس انہونی کے خیال سے اس کا دل بری طرح گھبرائے جارہا تھا۔ وہ آخر ہو کر رہی تھی۔ وہ اپنی صفائی میں کیا کہے۔ اس نے جملے ترتیب دینا چاہے مگر بتول بی بی' شبانہ اور ندرت کی زبان نے پہلے ہی زہر اگلنا شروع کر دیا' وہ شاہ نواز کو شہربانو اور امجد کے معاشقے کی آنکھوں دیکھی

مزید تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔

"ہم نے تو تیری عزت کی خاطر کب سے زبان بند کر رکھی تھی۔ اس کلموہی کو ہی سمجھاتے رہے کہ باز آجائے اپنی حرکتوں سے مگر یہ نیچ خاندان سے تعلق رکھنے والی بظاہر بڑی نمازن' پرہیز گار بنتی ہے مگر اندر سے اتنی گندی۔ آخ تھو!" بتول بی بی نے فرش پر تھوکا تھا۔

"اماں نے کتنی بار صرف اس وجہ سے اس پر ہاتھ بھی اٹھایا شاہو! اسے بہت سمجھایا مگر اس نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں۔ میرے شہزادوں جیسے بھائی کی عزت کو داغدار کر دیا۔ ارے میں پوچھتی ہوں کیا کمی ہے ہمارے شاہو میں جو اس سوکھی ہوئی لال مرچ کے ساتھ منہ کالا کر رہی ہے۔"

شبانہ نے اس کی چٹیا پکڑ کر کھینچی تھی۔ شاہ نواز بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا' امجد جو شاہ نواز کی لاتوں اور گھونسوں کا منتظر تھا۔ تیر کی سی تیزی سے زینے کی طرف لپکا۔ دیوار پھلا نگنا ممکن نہ تھا مگر نیچے سے دروازہ کھول کر گلی میں غائب ہونے کی کوشش تو کی جا سکتی تھی۔ شبانہ نے اس کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کی مگر بتول بی بی نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"ایسے گونگا بن کر کیوں کھڑا ہے شاہو! سنا دے اپنا فیصلہ۔ اس گناہوں کی گٹھڑی کو ہمارے گھر سے باہر نکال پھینک۔"

"ہاں اماں! ٹھیک کہتی ہے تو۔ ہمارے گھر میں اس کی گنجائش نہیں نکلتی۔" شاہ نواز کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔ شہربانو نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"جاؤ شہربانو! بیگ میں اپنے دو چار جوڑے ڈال لو۔" شاہنواز نے اسے سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔ شہربانو نے بے بسی سے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا رب جانتا تھا کہ وہ بے قصور ہے مگر کوئی اس کی صفائی یا گواہی دینے والا نہ تھا۔

"میں نے تم سے کیا کہا شہربانو! جا کر اپنا سامان باندھ لو۔" شاہ نواز دبی دبی آواز میں چیخا تھا۔

"تو ساتھ کے ساتھ فیصلہ بھی سنا دے شاہو۔" بتول بی بی نے بے تابی سے بیٹے کو مخاطب کیا۔ یہ سنہری وقت بیت گیا تو اس چڑیل کا جادو بیٹے پر پھر چل سکتا تھا۔

"میں نے فیصلہ سنا دیا ہے اماں! شہربانو اب اس گھر میں نہیں رہے گی۔" اس نے سرد نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ اس کی نگاہیں اور اس کا لہجہ۔ بتول بی بی کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"یہ چند دن اپنے چاچا کے گھر گزارے گی۔ اتنے میں کوئی کرائے کا مکان ڈھونڈوں گا۔ کوشش کروں گا کہ قریب کے علاقے میں گھر مل جائے تاکہ آپ لوگوں کی بھی خبر گیری کر سکوں۔"

اس نے گویا ماں بہنوں کے اعصاب پر بم گرایا تھا اس کی بات سن کر شہربانو سمیت سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

"یہ حرافہ' ڈائن۔ آخر اس کا جادو چل گیا نا تجھ پر بھی۔ تو اتنا بے غیرت ثابت ہو گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

بتول بی بی دھاڑی تھی اور پھر ہذیانی کیفیت میں شہربانو کی طرف جھپٹی تھی شہربانو تو پہلے ہی کھوئی کھوئی کیفیت میں کھڑی تھی۔ اس کے دھکے سے سنبھل نہ سکی مگر گرنے سے پہلے ہی اسے شاہ نواز نے تھام لیا تھا۔

"بس اماں! تم لوگوں نے شہربانو پر جتنے ظلم و ستم توڑنے تھے توڑ لیے۔ اب دوبارہ کوئی اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ ہاں! میں تیرا بیٹا ہوں۔ تیرے سامنے ہوں مجھے چاہے جان سے مار دے۔ اف نہیں کروں گا۔ اپنا سارا غصہ' ساری جھنجلاہٹ مجھ پر نکال لے اماں! لیکن میری بیوی تم لوگوں کے گھٹیا منصوبوں کی بھینٹ نہیں چڑھے گی۔ مجھے اس کی پاکدامنی اور پارسائی پر اتنا ہی یقین ہے' جتنا مجھے تیری کوکھ سے جنم لینے پر یقین۔"

شاہ نواز ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بول رہا تھا۔ بتول بی بی کو اور کچھ نہ سوجھا تو اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کر رونے لگی تھی۔

"اور ہاں اماں! شمسہ سے پوچھ لے۔ اگر یہ امجد سے واقعی شادی کرنا چاہتی ہے تو تو امجد کے گھر جا کر اس کی ماں سے بات کر۔ ہم لڑکی والے ہیں۔ خود بات کرنے سے ہماری عزت گھٹے گی لیکن عزت نیلام ہونے سے بہتر ہے کہ ہم عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود لڑکے کے گھر والوں کی منت سماجت کر کے یہ رشتہ پکا کر دیں۔ امجد کا باپ بیٹے کے کرتوتوں سے آگاہ ہے۔ امید ہے تھوڑا سا نخرہ دکھا کر وہ لوگ مان جائیں گے' امجد کی وجہ سے ہی پچھلے محلے سے بھی یہ لوگ بہت بدنام ہو کر نکلے ہیں۔ شادی کے بعد امید ہے شمسہ شوہر کو قابو کر ہی لے گی۔"

"بھائی! آخر ہو کیا گیا ہے آپ کو۔ یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو امجد کو جانتی تک نہیں۔" شمسہ نے بوکھلا کر اسے وضاحت دی۔

"کل میری دکان پر آ کر رفیقن خالہ نے تمہارے اور امجد کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی' بچیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ جوانی کا زور ہے کہیں امجد کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر شمسہ کوئی نقصان نہ کرے۔"

شاہ نواز نے سامنے والے گھر کی رفیقن کا ذکر کیا وہ ان کی بہت پرانی محلے دار تھی مگر بتول بی بی سے تعلقات اکثر و بیشتر خراب ہی رہتے تھے۔

"وہ پھا پھا کٹنی رفیقن' اس نے میری معصوم بچی پر الزام لگایا اور تو نے یقین کر لیا۔ ارے تو گھر آ کر مجھے بتاتا۔ میں اس کا منہ ہی نہ توڑ دیتی۔" بتول بی بی صدمے سے باہر نکلتے ہوئے چمک کر بولی تھی۔

"میں نے یقین نہیں کیا تھا اماں! اور گھر آ کر میں تجھ سے اس بارے میں بات کرنے ہی والا تھا لیکن اتفاق سے باہر برآمدے والی چارپائی پر مجھے شمسہ کا موبائل پڑا نظر آ گیا۔ وہی موبائل جو شمسہ کو میں نے اس کی فرمائش اور ضد پر مجبوراً" خرید کر دیا تھا۔ سیکنڈ ہینڈ موبائل اٹھارہ سو پچھتر روپے کا اور تو نے یہ پیسے ضائع کرنے پر مجھے بھی ڈانٹا تھا اور شمسہ کو بھی بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔"

شاہ نواز نے ماں کو یاد دلایا۔ شمسہ نے اپنا دایاں ہاتھ غیر محسوس طریقے سے پیچھے کیا تھا۔ موبائل اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔

"میں نے ویسے ہی موبائل اٹھایا تھا' اتنے میں ایک میسج موصول ہوا۔ میسج کا مطلب پتا ہے نا اماں! پیغام کو کہتے ہیں اور اس پیغام میں امجد نے تمہاری لاڈلی کو اتنے پیار بھرے انداز میں مخاطب کیا تھا کہ میں نے آج تک تنہائی میں اپنی بیوی تک کے لیے وہ القاب استعمال نہ کیے تھے اور میں اس سے پیار بھرے انداز میں مخاطب ہو بھی کیسے سکتا تھا اماں! میری بیوی پھر میرے سر پر نہ چڑھ جاتی۔"

اس نے ماں کو طنزیہ لہجے میں مخاطب کیا۔ بتول بی بی بس اسے چپ چاپ سنے گئی۔ اب نہ وہ اپنے سینے پر ہتڑ مار رہی تھی نہ شہربانو کو غضب ناک نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"تو نے صحیح کہا تھا اماں! میں واقعی بہت بے غیرت ہوں' اگر غیرت مند ہوتا تو اسی وقت شمسہ کو جان سے مار دیتا مگر میں نے بھائی بن کر نہیں' باپ بن کر سوچا۔ ٹھیک ہے شمسہ قصوروار تھی' لیکن اگر سلیقے سے یہ معاملہ سلجھایا جاتا تو ہو سکتا ہے یہ بدنامی کی کالک منہ پر ملے بغیر عزت سے اس گھر سے رخصت ہو جاتی۔ میں نے اسے بچی ہے' کم عقل ہے' نادان ہے کہہ کر بڑی رعایت دی اماں! میں نے سوچ لیا تھا رفیقن خالہ کے ذریعے امجد کے گھر والوں کو پیغام بھجواؤں گا کہ یا تو وہ شرافت سے رشتہ بھجوائیں ورنہ اس محلے سے بھی بوریا بستر سمیٹنے کی فکر کریں۔ میں نے تجھ سے تیری لاڈلی کے کرتوت چھپائے کہ تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گی ورنہ میں اسی وقت تجھے سارے پیغام پڑھواتا لیکن خیر ہے' اب پڑھوا دیتا ہوں۔ شمسہ! دکھا مجھے موبائل۔"

اس نے شمسہ کو مخاطب کیا اور وہ جو یہ سمجھ رہی

تھی کہ شاہنواز کی نگاہ اس کے موبائل والے ہاتھ پر پڑی ہی نہیں ہے۔ ہکابکا رہ گئی۔ شاہ نواز نے آگے بڑھ کر خود ہی اس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹا تھا۔

"اماں! تو بغیر چشمے کے کیسے پڑھے گی۔ یہ لو شبانہ آپا! پڑھ کر سناؤ اماں کو کہ امجد نے کس کو چھت پر آدھی رات کو بلایا تھا۔ شمسہ کو یا شہربانو کو۔" شاہ نواز نے نئے میسج پڑھ کر موبائل شبانہ کی طرف بڑھایا تھا۔

"معاف کردو بھائی! میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔" شمسہ نے فوراً" بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے جیسے شمسہ کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"میں نے فیصلہ تو کرلیا تھا اماں کہ رفیقن خالہ کے ذریعے امجد کے گھر والوں پر رشتے کا دباؤ ڈالوں گا لیکن میری بے چینی اور اضطراب ختم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ ابا کے بعد اس گھر کی عزت کی رکھوالی میرے کندھوں پر تھی اور میں اپنی دانست میں یہ سمجھتا رہا کہ میں اس گھر کی عزت کی حفاظت میں کامیاب ثابت ہوا ہوں۔ دنیا تمہارے بارے میں بہت باتیں بناتی تھی تمہیں لڑاکو، جھگڑالو اور بد زبان کہہ کر پکارتی تھی لیکن آج تک میں نے کسی سے اپنی ماں بہنوں کے کردار کے متعلق ایک لفظ نہ سنا تھا لیکن آج میری اس خوش فہمی اور غلط فہمی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ تجھے پتا ہے اماں! آج رات میں ایک پل کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا لگتا تھا۔ بستر پر کانٹے اگ آئے ہیں۔ میں ایک کروٹ پر لیٹا آنکھیں موندے اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ میری بے چینی یا گھبراہٹ کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی لیکن یہ اللہ کی بندی کیوں بے چین ہو کر جاگ گئی تھی۔ مجھے نہیں پتا۔ میرا جی اتنا خراب ہو رہا تھا کہ میرا اس سے مخاطب ہونے کو بھی جی نہ چاہا۔ میں سوتا بنا پڑا رہا پھر یہ گھبراہٹ کے مارے کمرے سے باہر نکل گئی اور پھر مجھے شمسہ کی بھی آواز آئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بھی جاگ رہی ہے۔ شہربانو نے اس سے کہا کہ وہ ذرا دیر کو اس کے ساتھ چھت پر چلے۔ شہربانو ٹھنڈی ہوا میں چہل قدمی کرنا چاہتی تھی اور آگے جو ہوا، وہ تم سب لوگوں کے سامنے ہی ہے۔"

شاہ نواز نے تھکے تھکے لہجے میں بات مکمل کی کسی کے پاس بولنے کے لیے ایک لفظ نہ بچا تھا۔

"اگر تم اجازت اور مہلت دو تو میں صبح تک اسے یہاں رکھ لوں اماں! آدھی رات کو کہاں رکشہ، ٹیکسی ملے گی۔ صبح سویرے ہی اسے اس کے چاچا کے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"بس کر شاہو! اور کتنے جوتے مارے گا۔ معاف کر دے ہمیں۔"

بتول بی بی نے دونوں ہاتھ جوڑے تھے۔ اس وقت اس کی حالت ہارے ہوئے جواری کی سی ہو رہی تھی اس کی بیٹیوں کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا ان کی بازی الٹ چکی تھی۔ اس گھر میں آئندہ ان کی کیا حیثیت ہونی تھی اس کا تعین وقت نے کرنا تھا یا پھر شہربانو نے۔ وہ واقعی کوئی جادوگرنی تھی اس بات میں اب تو کوئی شبہ بچا ہی نہ تھا۔ شاہ نواز نے ماں کے جکڑے ہاتھ کھولے تھے۔

"گناہ گار مت کرو اماں!" اس نے سپاٹ لہجے میں ماں کو مخاطب کیا پھر گردن ترچھی کر کے بیوی پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ شاہنواز نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور پھر اسے لے کر زینے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے کسی معمول کی طرح چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی چلی گئی۔ کمرے میں پہنچ کر شاہ نواز نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی۔ شہربانو کے رونے کی شدت میں کمی کے بجائے اضافہ ہو گیا تھا۔

"جب اماں کے ہاتھوں پٹتی تھیں تب تو کبھی میرے سامنے آنسو نہیں بہائے۔ اب بلاوجہ کیوں آنسو بہا رہی ہو۔" شاہ نواز نے ہتھیلی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا۔ وہ اس کے سینے سے چمٹ کر زور و شور سے رونے لگی تھی۔

"مجھے لگا، مجھے لگا۔" وہ رونے میں شدت آنے کی وجہ سے جملہ مکمل نہ کر پائی۔

"تمہیں لگا، میں اماں کے کہنے پر تمہیں فارغ کرنے والا ہوں۔" شاہ نواز نے اس کے بال سہلاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اگر آپ کے منہ سے کچھ ایسا ویسا نکلتا تو میں واقعی مر جاتی شاہ نواز!" وہ سسک پڑی تھی۔

"میں جانتا ہوں، میری شہربانو جھوٹ نہیں بولتی۔" شاہ نواز نے اس کا سر چوما تھا۔ وہ اس کے سینے سے چمٹی مسلسل اس کی قمیص آنسوؤں سے بھگوئے جا رہی تھی۔

"میری زندگی میں کبھی مرنے کا سوچنا بھی مت شہربانو! ورنہ تم نے ہی کہا تھا، کہ میں بھی تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔"

اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ایسا التفات ایسا اظہار، ایسا پیار۔ شہربانو کو لگا اس نے ان لمحوں میں اپنی پوری زندگی جی لی ہے۔

"میری ماں بہنوں کو معاف کر دینا شہربانو! وہ جیسی کیا ہیں میری ماں بہنیں ہیں۔ میرا ان سے تعلق ختم نہیں ہو سکتا۔"

شاہ نواز نے دھیمے لہجے میں اسے پکارا تھا۔ شہربانو تڑپ کر اس کے سینے سے الگ ہوئی۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں شاہ نواز۔ میں نے پہلے کبھی آپ سے ان کے متعلق کبھی کوئی شکوہ، کوئی شکایت کی؟"

"کاش تم نے کی ہوتی۔ مجھے کسی طور ان کی زیادتیوں کا احساس دلایا ہوتا، تمہاری چپ گھر والوں کا حوصلہ بڑھاتی رہی اور مزید ظلم ان کے کھاتے میں درج ہوتے رہے۔" شاہ نواز نے شکوہ بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"آپ نے سہاگ رات مجھے اپنے گھر والوں سے متعلق دوٹوک انداز میں ایک نصیحت کی تھی۔ میں نے آپ کا حکم مانا تھا شاہ نواز! اگر میں آپ کے گھر والوں کے خلاف آپ کے کان بھرتی تو شاید سب سے پہلے آپ مجھ سے بد ظن ہوتے۔" اس نے صاف گوئی اختیار کی تھی۔

"ہاں! شاید تم ٹھیک کہتی ہو ورنہ میں اندھا تو نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتیاں مجھے نظر نہ آتیں، میں اچھا بیٹا بننے کے چکر میں اچھا شوہر نہ بن پایا۔ میں اپنے سے وابستہ رشتوں میں توازن نہ رکھ پایا لیکن شہربانو! تم پر اللہ کا خصوصی کرم ہے ورنہ ضروری نہیں کہ کسی مظلوم و مجبور کو اسی دنیا میں اس کا حق مل جائے۔ ساری زیادتیوں کا ازالہ ہو جائے۔ بہت سے حساب کتاب دوسری دنیا کے لیے بھی اٹھا کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ یا تو تمہارے ساتھ اللہ کے کسی نیک بندے کی دعا ہے یا تمہارا کوئی عمل اللہ کو بہت محبوب رہا ہے۔ میں تمہیں اہمیت دینے سے ڈرتا تھا، کہیں تم دوسری عورتوں کی طرح شوہر پر اپنا تسلط جما کر اسے اس کے فرائض سے غافل نہ کر دو لیکن میرا دل تمہاری جانب کھنچتا ہی رہا۔ میں نے دل پر لاکھ بند باندھنے کی کوشش کی لیکن میں اس معاملے میں بالکل بے بس اور بے اختیار ثابت ہوا ہوں۔ تم میرے دل، دماغ، اعصاب پر بری طرح چھا گئی ہو۔ تمہارے بنا میری زندگی بالکل پھیکی، بے معنی اور ادھوری ہے۔ تم نے مجھے مکمل کیا ہے شہربانو! تم واقعی جادوگرنی ہو تمہاری حیا، وفا اور اطاعت گزاری کا جادو مجھ پر چڑھ کر رہا۔"

شاہ نواز کی سرگوشیاں شہربانو کے دل کی دھڑکن میں ارتعاش برپا کر رہی تھیں اور رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔ وہ ہی ہے جو بگڑے کام سنوارتا ہے۔ ایسے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ بے شک اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

شہربانو نے سرشار ہو کر شوہر کے شانے سے سر ٹکا دیا تھا۔

ناولٹ

آمنہ ریاض

عبدالباقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت ہڈ حرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی سماہر کو اس سے شدید جلن ہے وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

۲
دوسری قسط

"بھائی! کیا کر رہے ہو؟"

تقی کتابوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ جب جری نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

"بقول ابا۔ پڑھ پڑھ کر گھر والوں کے سر پر احسان کر رہا ہوں۔" تقی نے خوش دلی سے کہا۔

"یہ کام پھر کسی وقت کر لینا۔ نیچے ٹی وی پر ریسلنگ کا ایسا زبردست میچ آ رہا ہے کہ کیا بتاؤں.... اور بھابھی ضد کر رہی ہیں کہ "عشق ممنوع" دیکھنا ہے۔ بتاؤ! اس

قدر واہیات ڈراما اس قابل ہے کہ دو عظیم ریسلرز کی فائٹ پر اسے ترجیح دی جائے؟"

"تم کس قدر احمق آدمی ہو تم جری! گھنٹہ بھر سے تقریر جھاڑ رہے ہو۔ یہ نہیں کہ پہلے بتادو۔" تقی تڑپ کر کرسی سے اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگادی۔

"اللہ کرے جون سینا جیتے۔" جری نے اس کے پیچھے آتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔

"جون سینا جیتا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" تقی نے دھمکایا۔

"میری ٹانگیں کیوں؟" جری نے تعجب سے پوچھا۔

"کیونکہ اگر جون سینا جیتا تو صرف تمہاری دعاؤں سے جیتے گا۔ ورنہ وہ خود تو اتنا باصلاحیت ہے نہیں۔" تقی نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں، وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے ڈیوائن جانسن کے مقابلے پر لایا جاتا۔" اس بات پر ایک زبردست جنگ ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ جری کو اس کی معاونت درکار تھی، سو خاموشی میں عافیت جانی۔

ٹی وی لاؤنج میں امی اور بھابھی قبضہ جمائے بیٹھی تھیں۔ رضی بھائی اقلیت بنے چپ سادھے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں پہنچے تو ان کا کورم پورا ہوا، پھر بھابھی کی کیا مجال تھی کہ گھٹنے کے نیچے ریموٹ دبائے بیٹھی رہتیں۔

شکر ہے، ابا موجود نہیں تھے۔ وہ رات کی چہل قدمی پر نکلے تھے۔

ان تینوں نے مل کر وہ ہاہاکار مچائی کہ دونوں خواتین بے زار ہو کر اٹھ گئیں۔ دس منٹ تک ٹی وی لاؤنج اسٹیڈیم کا منظر پیش کرتا رہا۔ پھر میچ کسی نتیجے کے بغیر ختم کردیا گیا۔ کیونکہ مخالفین کے ساتھیوں نے مقابلہ کے اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رنگ میں دھاوا بول دیا تھا۔

"تمہارا موڈ کیوں خراب تھا؟" جری نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی پسند کا کوئی اور چینل لگالیا تو رضی نے تقی سے پوچھا۔

"موڈ تو خراب نہیں تھا۔" تقی نے قدرے چونک کر کہا۔

"پھر کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"بھوک نہیں تھی۔"

"ثبین بتا رہی تھی، ابا سے تمہاری بحث ہوئی ہے؟"

"تو کون سی نئی بات ہے؟" وہ اطمینان سے ہنسا۔ "بحث تو اکثر ہو جاتی ہے۔"

"یار! بحث نہ کیا کرو۔" رضی نے سمجھایا۔ "ابا ناراض ہوتے ہیں تو امی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

"میں کب بحث کرتا ہوں۔ وہ تو ابا ہی۔۔۔ خفا رہتے ہیں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"تم خفا ہونے کی نوبت ہی نہ آنے دیا کرو۔ کبھی کبھار اسٹور کا چکر لگالیا کرو۔ ابا خوش ہوں گے۔ جری بھی تو اسکول کے بعد جاتا ہے۔"

شہر کے وسط میں ابا کا بہت بڑا جنرل اسٹور تھا۔ جس کی دو اور شاخیں شہر کے مختلف حصوں میں تھیں۔ مرکزی اسٹور ابا ہی سنبھال رہے تھے۔ رضی بھی کالج کے بعد ابا کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے اسٹور پر چلا جایا کرتا تھا۔ اب جری بھی یہی کر رہا تھا۔ صرف تقی تھا، جس نے اس روایت کو توڑا تھا۔

"میں اسٹور جاتا ہوں، لیکن ابا کو میرا کام پسند نہیں آتا۔ وہ سارے اسٹاف کے سامنے مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔" اس نے اپنی الجھن بتائی۔

"میں ابا سے کہوں گا۔ وہ دوبارہ نہیں ڈانٹیں گے۔"

"صرف ڈانٹنے کی بات نہیں ہے۔" اس نے منہ پھلا کر تمر جھکتے ہوئے کہا۔ "وہ ہر ایک کے سامنے مجھے نکما، نالائق کہہ دیتے ہیں۔ مجھے برا لگتا ہے۔"

"پیار سے کہہ دیتے ہوں گے یار!"

"اچھا پیار ہے۔ میری بے عزتی کروا دیتا ہے۔" اس نے جل کر کہا۔ رضی ہنس دیا۔

"ابا کی زبان کڑوی ہے تقی! تم ان کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔ تم اسٹور چلے جایا کرو۔ ابا کے اصول و ضوابط کے مطابق وہاں کا کام سنبھالو۔ تم سے خوش رہیں گے تو کڑوا بولنا چھوڑ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے! میں چلا جاؤں گا۔" تقی نے گہری سانس بھرتے ہوئے جیسے ناچار کہا تھا۔

"مری کب جا رہے ہو؟"

"پرسوں۔"

رضی نے جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے چند ہرے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ کس لیے؟" تقی نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"مری میں تمہارے کام آئیں گے۔" رضی نے نرمی سے کہا۔ "اگر اسٹور جاؤ تو اس سے زیادہ تو ابا بھی تمہیں دے دیں گے۔"

"وہ طعنے دے لیں۔ یہی بہت ہے۔" اس نے پھر سلگ کر کہا اور روپے بھی پکڑ لیے۔ "ان کے لیے شکریہ۔ وعدہ رہا، جاب ملتے ہی واپس کردوں گا۔"

"رضی بھائی! آپ عیدی بانٹ رہے ہیں؟" جری کی نظر روپوں پر پڑی تو اس نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ عید کا مہینہ ہے؟" رضی کے بجائے تقی نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ مہینہ تو نہیں ہے۔۔۔ پھر بھائی نے آپ کو پیسے کیوں دیے؟"

"رضی بھائی چاہتے ہیں میں کل تمہیں پاگل خانے لے کر جاؤں اور ضروری جانچ پڑتال کے بعد تمہیں وہاں داخل کروادوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ جری بری طرح گھبرا گیا۔

"تمہارے چہرے پر لکھا ہے کہ تم پاگل ہو۔"

"نہیں، سچ بھائی؟" وہ روہانسا ہو گیا۔ ثبین چائے کی ٹرے لیے اندر آرہی تھی۔ تقی نے اسے بھی گھسیٹا۔ "کیوں بھابھی! اپنا جری شکل سے پاگل لگتا ہے نا؟"

"تمہارا تو جواب نہیں تقی! پچھلے دو ہفتوں سے بے چارے جری کو غلط فہمی پلس فکرمندی میں ڈال رکھا ہے کہ اس کی شکل "ٹیپو شریف" سے ملتی ہے۔ بتاؤ! کہاں ہمارا جری، کہاں ٹیپو شریف۔۔۔ اور اب پاگل پن کا ٹیگ لگا دو۔۔۔ اتنا پیارا دیور ہے میرا۔۔۔ تم بلاوجہ اسے کنفیوژ نہ کرو۔" ثبین نے فوراً" جری کی طرف داری کی۔

"جی ہاں۔۔۔ یہ تو پیارا دیور ہے۔ برا تو میں ہی ہوں، جس کی آپ چغلیاں کرتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر کس بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ثبین فوراً" ہنس دی۔

"کیونکہ میرا یہ دیور مجھے ہمیشہ ہنستا مسکراتا اچھا لگتا ہے۔ جلتا بھنتا نہیں۔"

"سنا جری! بھابھی جان کیا کہہ رہی ہیں؟" تقی نے جلدی سے کہا۔

"کیا؟" جری پھر متوجہ ہوا اور اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ میں ہنستا مسکراتا اچھا لگتا ہوں اور تم جلتے بھنتے۔"

"توبہ ہے تقی! تمہارا نام تو پھاپھا کٹنی ہونا چاہیے تھا۔" ثبین نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ رضی نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ثمر کالج وین میں بیٹھ رہی تھی۔ جب شفا اپنے گیٹ سے نکلی۔

"تم بھی ہماری وین میں کالج جاؤ گی؟" شفا نے اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! کچھ دن اسی وین پر جاؤں گی۔" ثمر نے خوش دلی سے کہا۔ "ابو کی گاڑی خراب ہے۔ وہ خود بھی آفس کی ٹرانسپورٹ استعمال کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا، جب تک گاڑی ٹھیک نہیں ہو جاتی میں وین لگوا لیتی ہوں۔ مزا آئے گا نا۔ ہم روز اکٹھے کالج آیا جایا

کریں گے۔"

"ہوں۔۔۔" شفا نے محض اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرا کر کہا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ ثمر کے اپنی وین میں جانے کا سن کر کسی قدر پریشان ہو گئی تھی۔ "کہیں عمیر بھائی کو ثمر کے ساتھ اس مختصر سفر پر بھی اعتراض نہ ہو؟" وہ سوچ رہی تھی۔

"شفا! تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟ اتنی ریڈ کیوں ہو رہی ہیں؟" ثمر نے اچانک اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"رات بہت دیر سے سوئی تھی۔ نیند پوری نہیں ہوئی۔ اسی لیے آنکھیں ایسی ہو رہی ہیں۔" صبح کے رش کی وجہ سے وین رک رک کر چل رہی تھی۔ اسی لیے جھٹکے بھی زیادہ لگ رہے تھے۔ شفا نے اسٹینڈ کا سہارا لیتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔

"دیر سے کیوں سوئی تھی؟" ثمر نے پوچھا۔

"بھابھی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ میرے روم میں آگئی تھیں۔ باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" شفا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔" ثمر حیران ہوئی۔ "بھابھی سے کیا باتیں ہوئیں کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا؟"

وین کے باہر ٹریفک کا شور اور اندر لڑکیوں کی چیں چیں۔۔۔ کوئی عقل والا انسان آجاتا تو بے چارہ بوکھلا کر بھاگتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن آفرین ہے ساری لڑکیوں پر جو نہ صرف یہ کہ آگے پیچھے جھول رہی تھیں۔ بلکہ اپنے تئیں سرگوشیوں میں گفتگو بھی فرما رہی تھیں۔

"کچھ خاص نہیں۔۔۔ بھابھی مجھے اپنے اسکول، کالج کے قصے سناتی رہیں۔ تمہیں پتا ہے ثمر! بھابھی نے بہت سے شمالی علاقہ جات کی سیر کی ہوئی ہے۔ یونیورسٹی ٹرپ کے ساتھ تو وہ آزاد کشمیر بھی گئی تھیں۔ مجھ سے کہہ رہی تھیں، مری بے شک تم نے دیکھا ہوا ہے۔ لیکن فرینڈز کے ساتھ ضرور جاؤ۔ فرینڈز کے ساتھ آؤٹنگ کا اپنا مزا ہوتا ہے۔" اس نے وین سے باہر دیکھتے ہوئے بتایا۔

ثمر کی آنکھیں تعجب و بے یقینی سے پھیل گئیں۔

"آج کل تمہاری بھابھی تم پر کچھ زیادہ ہی مہربان نہیں ہو رہیں؟" شفا نے گردن موڑ کر ایک نظر اسے دیکھا۔ عمیر بھائی کو اگر ثمر سے پرخاش رہنے لگی تھی تو ثمر سماہر بھابھی کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔

"ہاں۔۔۔" شفا نے مسکرا کر بات ٹالنا چاہی۔

"بھابھی کہہ رہی تھیں، عمیر بھائی سے ٹرپ پر جانے کی اجازت لے دیں گی۔"

"پھر تو مل چکی اجازت۔" ثمر نے جل کر کہا۔ "کس قدر بے وقوف لڑکی ہو تم شفا! عمیر بھائی سے تمہیں خود پوچھنا چاہیے تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ثمر!" شفا نے کسی قدر اکتا کر کہا۔ "سماہر بھابھی عمیر بھائی سے پوچھیں یا میں۔۔۔ اگر اجازت ملی تو مری تو میں ہی جاؤں گی نا۔" وہ حسب عادت مثبت پہلو دیکھ رہی تھی۔

ثمر نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تمہاری چھوٹی عقل میں کوئی عقل والی بات نہیں آتی۔ میرا کیا جاتا ہے، مرو تم۔" ثمر نے خفگی سے منہ موڑ لیا۔ شفا اڑتے بال کان کے پیچھے اڑستے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

☆ ☆
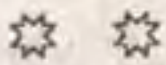
گیٹ کھلا تھا سمیر بے دھڑک اندر آگیا۔

موسم خوشگوار ہو رہا تھا آسمان نکھرا نکھرا۔ ہوا سے اس کی خوش رنگ ٹائی پھڑپھڑا رہی تھی۔ سمیر نے بڑی ترنگ سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ دائیں طرف چھوٹے سے باغیچے میں پیڑ پودے خوب لہلہا رہے تھے۔ تب ہی اس کی نظر دار بست پر پڑی جس پر انگور کی بیل پھیلی ہوئی تھی اور پھولے پھولے انگوروں کے صحت مند گچھے نیچے کی طرف لٹک کر اسے دعوت نظارہ دے رہے تھے۔

سمیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"کتنا خوش قسمت ہے یہ تقی! انگوروں کے سائے میں رہتا ہے۔ لیکن انتہائی بے دید ہے... اتنے انگور لگتے ہیں اس کے گھر... یہ نہیں کہ دو چار کلو میرے جیسے کسی عزیز دوست کے گھر ہی بھجوا دے۔"
اس نے حسرت سے انگوروں کے ان گچھوں کی طرف دیکھا جو بانہیں پھیلائے اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ اس نے بمشکل نظریں چرائیں۔ دو قدم آگے بڑھا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چار قدم انگوروں کی طرف آنا پڑا تھا۔
"دو چار کھا ہی لیتا ہوں۔"
سہولت سے ہاتھ میں پکڑا ڈبا ایک طرف رکھا برآمدے سے اٹھا کر ایک کرسی عین دار بست (جس پر انگور کی بیل چڑھائی جاتی ہے) کے عین نیچے رکھی اور پیر جما کر چڑھ گیا۔ کرسی نازک تھی۔ ذرا سا لڑکھڑا کر ساکت ہو گئی۔
"واہ 'واہ۔" منہ میں انگور رکھتے ہی شیرینی سے گھل گئی اسے لگا جیسے اس نے جنت کا میوہ چکھ لیا ہو۔ وہ اردگرد سے بیگانہ ہو کر کھانے لگا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟"
کسی نے کھنکھار کر پوچھا۔ سمیر اتنا مگن تھا کہ ذرا بھی نہ چونکا۔ اطمینان سے کہنے لگا۔
"نظر نہیں آتا... انگور کھا رہا ہوں۔"
"یہ انگور آپ کے ابا کے ہیں؟"
"جی نہیں! تقی کے ابا کے ہیں۔" اطمینان قابل دید تھا۔
"کھانے سے پہلے تقی کے ابا سے اجازت لی تھی؟"
"وہ دیتے؟... ہونہہ... وہ اتنے تو کھڑوس آدمی ہیں کہ اپنے بیٹے کو بھی ان انگوروں کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے... شکر ہے! میرے ابا تو ایسے جلاد... د..."
وہ خفیف سا پلٹا تھا۔ لودھی صاحب کمر پر دونوں ہاتھ رکھے 'سر اٹھائے غضب ناک نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔
سمیر کے چھکے چھوٹ گئے۔ کرسی پہلے ہی نازک تھی۔ وہ ذرا سا کانپا۔ کرسی زور سے کپکپائی اور وہ دھڑام سے نیچے آرہا۔
"خبردار! اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ یہیں زمین میں گاڑ دوں گا۔" انہوں نے وہیں ہینڈز اپ کروا دیا بے چارہ سمیر چوٹ بھی نہ سہلا سکا۔
"چوری کرتے شرم نہیں آتی؟"
"جی! مجھے کیا پتا۔ چور کا کام 'وہی جانے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ گھبراہٹ چہرے سے ہویدا تھی۔
"میں نے تمہیں چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے' تم مکر نہیں سکتے۔"
وہ اور بھڑکے۔
"چوری؟ کیسی چوری؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔
"تم میرے انگور چرا کر کھا رہے تھے۔ میں تم پر مقدمہ کر دوں گا۔ تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔"
وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے تھے۔ سمیر کے ہاتھوں کے توتے 'کبوتر سب اڑ گئے۔ ان سے کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ سچ مچ ہی مقدمہ کر دیتے۔
"اپنے گھر سے لے کر کھائی ہوئی چیز چوری تو نہیں ہوتی۔" اس نے گھگھیا کر کہا۔ لودھی صاحب کو اور آگ لگ گئی۔
"یہ گھر تمہارے باپ کا ہے؟"
"جی نہیں! تقی کے باپ کا ہے... لیکن میں آپ کو بھی اپنا ہی سمجھتا ہوں۔" جلدی سے کہا اور کہہ کر پچھتایا۔
"جی... جی... میرا مطلب ہے میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ اسی لیے بغیر پوچھے انگور توڑ لیے تھے۔"
"ہوں... تم شکل سے بھی تابعدار لگتے ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ برخوردار! کیا سارے بزرگوں کو کھڑوس اور جلاد کہتے ہو؟" ان کی طنزیہ نظریں اسے بری طرح چبھ گئیں۔ سٹپٹا کر بولا۔

"میری ایسی مجال کہاں؟ بس جو کھڑوس اور جلاد ہوں۔ ان ہی کو کہتا ہوں... مم 'میرا مطلب ہے..."
تقی کے عزیز از جان دوست کی زبان تھی۔ بات بے بات پھسل جاتی تھی۔ لودھی صاحب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا اور انگلی کے اشارے سے بولے۔
"فوراً' کھڑے ہو جاؤ... اور میں بتا رہا ہوں سمیر! تم تقی کے دوست ہو۔ اس بات کی مجھے کوئی پروا نہیں ہاں! تم میرے دوست کے بیٹے ہو۔ صرف اس بات کا لحاظ کر جاتا ہوں۔ لیکن آج آخری بار بتا رہا ہوں۔ اگلی بار تم نے میرے کسی پودے کو ہاتھ لگایا یا میرے باغیچے کے کسی پھل پر بری نظر ڈالی تو میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گا۔"
"بے فکر رہیے ابا!" اس نے سرعت سے کہا چونکہ بچپن سے گھر میں آنا جانا تھا' سو تقی کی تقلید میں وہ بھی انہیں ابا کہہ لیتا تھا اور پتا نہیں اپنی دوستی کا پاس تھا یا تقی کی دوستی کی مروت' بہرحال وہ اسے ٹوکتے نہیں تھے۔
"میں آپ کے باغیچے کی طرف دوبارہ آؤں گا ہی نہیں۔ کبھی بھول کر بھی قدم رکھا تو آپ میری ٹانگیں ہی توڑ دیجیے گا۔"
"کبھی کبھی مجھے تعجب ہونے لگتا ہے۔ تم تقی کے دوست ہو۔ پھر بھی عقل والی بات کر جاتے ہو... کمال ہے۔" پتا نہیں وہ سراہ رہے تھے یا...
"فوراً' بھاگ جاؤ۔ ورنہ میں اپنے ارادے پر عمل کرنا شروع کر دوں گا۔" سمیر تو ایسے بھاگا کہ گیا ہی بھینسا رسہ تڑوا کر بھاگتا ہو گا۔ داخلی دروازے کے سامنے بمشکل بریک لگائی۔ یاد آیا' مٹھائی کا ڈبا تو وہیں بھول آیا تھا۔
مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ناچار واپس پلٹنا پڑا۔
"تم پھر آگئے؟" لودھی صاحب تاحال اسٹینڈ بائی پوزیشن میں کھڑے تھے اسے پلٹتا دیکھ کر پوچھا۔
"جی 'جی... وہ ڈبا۔" اس نے ڈبا اٹھایا اور ان کے سامنے کر دیا۔
"اس میں کیا ہے؟" انہوں نے چھڑی سے ڈبا بجایا۔
"مٹھائی۔"
"کس خوشی میں لائے ہو؟"
"جی! میری تاریخ ٹھہر گئی ہے۔" سمیر نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔
"شکل سے تو تم ہمیشہ سے اشتہاری لگتے ہو۔ لیکن "تاریخ پڑنا" ایسی خوشی کی بات تو نہیں کہ مٹھائی بانٹی جائے۔"
"ابا جی! وہ والی تاریخ نہیں... وہ دوسری والی تاریخ۔" اس بڑی لگن سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ جو منگنی کی انگوٹھی پہنانے سے پہلے ٹھہرائی جاتی ہے۔"
"نالائق۔" وہ گرجے۔ غالباً" اسے تقی سمجھ لیا تھا۔
"سیدھی طرح نہیں بتا سکتے کہ منگنی کی مٹھائی لائے ہو۔"
"جی نہیں! مٹھائی تو گورمے کی لایا ہوں... البتہ منگنی کی خوشی میں لایا ہوں... اور سیدھی طرح کس طرح بتاؤں۔ ابا آپ کو پتا ہے۔ میں مشرقی لڑکا ہوں۔ مجھے بھی شرم آتی ہے۔" اس نے شرما کر کہا۔
"چلو چلو... مجھے اچھی طرح پتا ہے تمہاری شرم و حیا کو... اپنے ابو کو میری طرف سے مبارک دینا البتہ بہو سے مجھے ہمدردی ہے۔" وہ کہہ کر اپنے پودوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سمیر کو اپنا سا منہ لے کر اندر کی راہ لینا پڑی۔
تقی کے دوستوں میں ایک سمیر ہی تھا' جسے وہ کچھ پسند کرتے تھے اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ان کے بھی عزیز دوست کا بیٹا تھا۔ پھر بچپن سے اس کا گھر میں آنا جانا تھا اور تیسری اور سب سے بڑی وجہ کہ اس نے اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد ملازمت شروع کر دی تھی۔ تقی کی طرح ایم فل میں ایڈمیشن

لے کر اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

اور یہ سمیر کا اتنا اچھا اقدام تھا کہ اسی سے خوش ہو کر وہ اکثر اس سے ہنس کر بات کر لیا کرتے تھے۔ البتہ کھنچائی زیادہ ہوتی تھی۔

☆ ☆ ☆
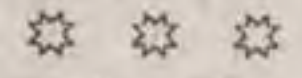
عمیر کو اچانک آفس کے کسی کام کے سلسلے میں ایک ہفتہ کے لیے کوئٹہ جانا پڑ رہا تھا۔ جس وقت انہوں نے گھر آ کر اس بارے میں اطلاع دی۔ ساحر عادل کو دلیہ کھلا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ہدیہ کو پڑھا بھی رہی تھی عمیر نے اسے مصروف دیکھ کر شفا سے کہا کہ وہ ان کی پیکنگ میں مدد کروا دے۔ لیکن شفا کو کمرے میں بلانے کا مقصد محض پیکنگ میں مدد لینا نہیں تھا۔ وہ اسے کچھ نصیحتیں بھی کرنا چاہ رہے تھے۔

اور پھر انہوں نے کیا بھی یہی۔ اس کی برین واشنگ کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں سمجھاتے رہے۔

"بھابھی کی عزت کیا کرو۔ وہ تم کو چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کرتی ہے۔ تم بھی اسے بڑی بہن سمجھو۔ معمولی معمولی باتوں کو ایشو بنا کر جھگڑنے والے لوگ بے وقوف ہوتے ہیں۔ میری غیر موجودگی میں ساحر کی ہر بات ماننا۔" شفا نے ساری باتیں دھیان سے سنیں مستقل اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ لیکن ایک وقت آیا' اتنی نصیحتیں سن کر جھنجلا گئی۔

"بھائی! کیا بھابھی نے آپ سے میری شکایت کی ہے؟"

"کیا ضروری ہے کہ میں شکایت سن کر ہی تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں؟" عمیر نے الٹا اسی سے پوچھا۔

شفا الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"سنو شفا! ساحر تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے تمہاری شکایت نہیں کی۔ بلکہ اسے کبھی تم سے کوئی شکایت ہوئی بھی نہیں۔ تب ہی میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس سے محبت سے پیش آیا کرو میں نے اکثر دیکھا ہے' تم اس سے زبان چلاتی ہو۔۔۔ بد تمیزی کرتی ہو۔"

"لیکن عمیر بھائی!" وہ سخت معترض ہوئی۔ لیکن عمیر نے اس کی بات قطع کر دی تھی۔

"شفا بیٹے! تم میری بہت پیاری سی گڑیا ہو اور میں نہیں چاہتا کوئی بھی دوسرا انسان ۔۔۔ چاہے وہ میری بیوی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ میری گڑیا کے بارے میں کوئی غلط گمان پال کر بیٹھے۔۔۔ میں ساحر کو جانتا ہوں۔ وہ دل کی بہت اچھی ہے اور تم سے محبت بھی بہت کرتی ہے اگر جواب میں تم اسے محبت دو گی تو اس کی محبت بڑھے گی' کم نہیں ہو گی۔"

"عمیر بھائی! اب آپ کچھ نہ کہیں۔۔۔ میں آپ کی ساری بات سمجھ گئی ہوں۔" شفا نے جلدی سے کہا۔

عمیر نے اس کے خفگی بھرے تاثرات والے چہرے کو دیکھا۔ انہوں نے پیار سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر بوسہ دیا اور پھر اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلا کر خود سے لپٹا لیا۔

"شاباش۔۔۔ مجھے پتا تھا میری گڑیا' میری بات ضرور سمجھ لے گی۔"

☆ ☆ ☆

سمیر منہ بسور کر اندر آیا۔

تقی ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ وہیں سے پکار کر بولا۔

"صبح صبح میرے ابا کے اقوال زریں سن کر آ رہے ہو۔ اب ان شاء اللہ سارا دن اچھا گزرے گا۔" آملیٹ' پراٹھا اور لسی کا تگڑا سا ناشتا آگے رکھے اور بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کبھی کبھی ان اقوال سے تم بھی مستفید ہو لیا کرو۔" سمیر نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کے آگے سے پلیٹ اٹھا کر اپنے آگے رکھی۔

"لو اور سنو۔۔۔ بھائی! ہم تو روز سنتے ہیں۔ صبح' شام سنتے ہیں۔" تقی نے پلیٹ واپس جھپٹی اور کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

"امی! سمیر کے لیے بھی ناشتا لے آئیں۔ ورنہ یہ میرے ناشتے کو نظر لگا دے گا۔"

"تمہاری صحت پر کون سا فرق پڑتا ہے؟"

سمیر خفا ہو کر بیٹھ گیا۔ تقی نے ذرا پروا نہ کی اطمینان سے کھاتا رہا۔

"ویسے لودھی صاحب فرما کیا رہے تھے؟"

"میں نے دو چار انگور توڑ کر کھا لیے تھے۔" سمیر نے منہ بسور کر جواب دیا۔ تقی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"گویا منی نکالنے کے لیے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔۔۔ بھئی واہ۔"

"یار! ایک تو تم لوگوں نے وار بست اتنا اونچا لگایا ہے۔ انگور کا ایک گچھا توڑنے کے لیے ایسا لگ رہا تھا کہ ماؤنٹ ایورسٹ تک ہاتھ لے جانا پڑے گا۔ تم لوگ تو بانس کی طرح لمبے ہو۔ کوئی باہر والا آ جائے تو بے چارہ کیا کرے۔۔۔ میں نے کرسی رکھ کر انگور توڑے۔ پیچھے سے ابا نے چھاپہ مار دیا۔ میں اتنا گھبرایا کہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔۔۔ ایمان سے اب تک پہلو دکھ رہا ہے۔ اس پر سے ابا بولے۔ دوبارہ میرے پودوں کو ہاتھ لگایا تو تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔ پھلوں پر بری نظر ڈالی تو آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ میں نے کہا۔ دوبارہ اس طرف نظر آیا تو ٹانگیں بھی توڑ دیجیے گا۔"

"شاباش! بڑا اچھا مشورہ دے کر آئے ہو۔" اس نے دل کھول کر داد دی۔

"اچھا! کل کیوں نہیں آئے؟ تم نے تو کل آنے کا کہا تھا۔"

"امی کو شاپنگ کروانے لے گیا تھا۔۔۔ تقی! یہ مٹھائی اندر آنٹی کو دے دو۔ ناشتا میں نہیں کروں گا۔ صرف چائے پلوا دو۔۔۔" تقی مٹھائی کا ڈبا کچن میں دے کر واپس آیا تو پوچھنے لگا۔

"مٹھائی کس خوشی میں؟"

"ابو نے لڑکی پسند کر لی ہے۔" تقی نے شرما کر کہا۔ تقی کا منہ میں نوالہ لے جاتا ہاتھ راستے میں رک گیا اور منہ ہی نہیں' آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اس عمر میں؟" اس نے بے یقینی اور صدمے سے چور آواز میں کہا۔

"اوہو۔" سمیر جھنجلایا۔ "کہنے کا مطلب تھا' ابو نے میری دلہن ڈھونڈ لی ہے۔"

"تمہاری دلہن گم ہو گئی تھی کیا؟"

"تقی! میں تیرا سر توڑ دوں گا۔"

تقی پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ سمجھ تو چکا تھا کہ سمیر اس سے اپنے احساسات بانٹنے کے لیے آیا ہے۔

"چل بتا! کیسی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ دیکھنے میں کیسی ہے؟" وہ سنجیدہ ہوا۔

"ابو کے دور کے دوست کی بیٹی ہے شاید ابا بھی ان لوگوں کو جانتے ہوں۔ مجھے صرف اتنا ہی پتا ہے۔ باقی کچھ نہیں۔ ابو نے تصویر بھی نہیں دکھائی۔ وہ اس معاملے میں مجھ سے زیادہ مشرقی ثابت ہوئے ہیں۔"

"جیسے مجھے پتا نہیں تمہارے مشرقی پن کا۔" تقی نے مذاق اڑایا۔۔۔ "صاف صاف بتاؤ! معاملہ کیا ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ بغیر تصویر دیکھے تم راضی ہوئے ہو۔ تم تو وہ انسان ہو جس نے اسکول میں ایڈمیشن سے پہلے بھی ٹیچر کی تصویر دیکھنے کی ڈیمانڈ کر دی تھی۔"

"ہر بات کو چار سے ضرب دے کر بتانا تو تمہارا فرض ہے۔ ابو نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں۔ پوچھا ہوتا تو میں تصویر کی ڈیمانڈ بھی کرتا۔ خود ہی رشتہ طے کر کے آ گئے اور آ کر مبارک بادی کا گلاب جامن میرے منہ میں ٹھونس دیا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ابو کی پسند تو اچھی ہے۔ امی کو بھی انہوں نے خود ہی پسند کیا تھا۔ ان کی دو تین کلاس فیلوز کی تصویریں بھی دیکھی ہوئی ہیں میں نے۔ جن پر شادی

سے پہلے ابو نے نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اچھی خاصی خوش شکل آنٹیاں ہیں۔۔۔۔ مجھے یقین ہے 'ابو نے میرے معاملے میں بھی اعلا ذوقی کا مظاہرہ ہی کیا ہو گا۔"

"ہوں۔۔۔۔ اس کا مطلب تو ارینج میرج کرے گا؟"

"ہر گز نہیں۔۔۔۔ مر کر بھی نہیں۔" سمیر نے پُرعزم لہجے میں کہا تھا۔ "میں نے سوچ لیا ہے۔ پہلے تم سے محبت کروں گا۔ پھر شادی کروں گا۔"

"نام تو اچھا ہے بھابھی کا۔ کاش! قسمت بھی اچھی ہوتی۔" اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ سمیر برا مان گیا۔

"مطلب؟"

"سمجھ تو تم گئے ہو۔" وہ پھر ہنسا۔

"میں ناراض ہو کر جا رہا ہوں۔ نہ چائے پلاتے ہو نہ ناشتا کرواتے ہو۔ اوپر سے باتیں سن لو جناب کی۔"

"رکو' رکو۔" تقی چلایا۔ "تم بائیک پر آئے ہو ناں؟"

"نہیں! گدھا گاڑی پر۔" وہ بری طرح سلگا ہوا تھا۔

"بات تو ایک ہی ہے۔" تقی نے قہقہہ لگا کر اور سلگایا۔ "مجھے کیمپس تک لفٹ چاہیے۔"

"اوہ خدا کو مان یار! کہاں تیرا کیمپس' کہاں میرا آفس۔۔۔۔ مجھے بہت لمبا چکر پڑ جائے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ لمبے چکر سے تم مرو گے نہیں۔ آخر میں بھی تو کل کو اپنی اہم اپائنٹمنٹس چھوڑ کر تمہارا شہہ بالا بنوں گا۔ تم اپنے ہونے والے شہہ بالے کے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتے کیا؟" اس نے ٹھنک کر پوچھا۔

"تمہیں کس نے دعوت دی کہ رضاکارانہ طور پر میرے شہہ بالا بنو؟"

"اب اپنے جگری دوست کے لیے اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں۔"

اس احسان کرنے والے انداز پر سمیر ضرور کوئی سخت جواب دیتا۔ مگر اسی وقت تقی کی امی چائے لے کر آگئیں۔

"امی! سمیر کی منگنی ہو رہی ہے۔ آپ بھی لگے ہاتھوں تعزیت کر لیں۔"

"پتا نہیں وہ کون سا برکتوں والا دن ہو گا۔ جب تم سوچ سمجھ کر بولنا سیکھو گے۔" امی نے جھنجلا کر کہا۔ "خوشی کے موقع پر تعزیت نہیں کی جاتی۔ مبارک باد دی جاتی ہے۔" پھر سمیر سے بولیں۔

"بہت مبارک ہو سمیر! صبح صبح بہت اچھی خبر سنائی ہے۔ اپنی امی کو میری طرف سے مبارک باد دینا۔ میں بھی چکر لگاؤں گی۔ لیکن یہ تو بتاؤ! ہماری بہو کیسی ہے؟"

"شکل کا تو پتا نہیں۔ البتہ عقل کا یقین ہے کہ دو تین پرزے تو ضرور ڈھیلے ہوں گے۔ تب ہی تو اس چغد سے شادی کی ہامی بھری ہے۔۔۔۔ ورنہ آپ خود سوچیں امی! کیا کوئی نارمل لڑکی سمیر سے شادی کے لیے راضی ہو سکتی ہے؟" جھاڑ کھانے کے باوجود تقی کی زبان خوب چل رہی تھی۔

"کیوں ۔۔۔۔ کیا برائی ہے سمیر میں؟ اتنا لائق' تابعدار' ہونہار بچہ ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس سے شادی کر کے خوش قسمت کہلائے گی۔ تمہاری طرح تھوڑا ہی جسے باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں آتا۔۔۔۔ میرا تو رضی کی شادی کے فوراً" بعد ہی دل چاہنے لگا تھا کہ تمہاری منگنی کر دوں۔ لیکن تم کسی قابل ہو تب ناں ۔۔۔۔ اونہہ! اب کہیں رشتہ بھی لے کر جاؤں تو کس منہ سے۔"

"مجھے پتا ہوتا' آپ کو میری منگنی کا اتنا شوق ہے تو بچپن میں ہی رضامندی دے دیتا۔" تقی نے کہا۔ "ویسے امی! میں کون سا بوڑھا ہو گیا ہوں؟ آپ کے ارمان پورے کرنے کے لیے ایک چھوڑ تین تین منگنیاں کرنے کو تیار ہوں۔ آپ چاہیں تو آج ہی میرا رشتہ لے کر چلی جائیں۔" اس نے حسب عادت بے پر کی ہانکی۔

"ہاں اور جب کوئی یہ پوچھے کہ جس کا رشتہ لے کر آئی ہو' وہ بیٹا کیا کرتا ہے تو کیا جواب دوں۔۔۔۔ میرے ہونہار بیٹے کو کوئی کام نہیں۔ وہ صرف باتیں بنا سکتا ہے۔" امی نے اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دے دیا تھا۔

"آپ نے تو مجھے بہت ہی انڈر اسٹیمیٹ کرنا شروع کر دیا ہے امی! دیکھ لیجئے گا' میں کسی دن کوئی ایسا کام کروں گا کہ آپ کا اور لودھی صاحب کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔" اس نے انقلابی انداز میں بند مٹھی لہراتے ہوئے کہا۔

"اور پھر آپ کا سارا خاندان اپنی بیٹیوں کے رشتے میرے لیے نہ لایا تو میرا نام بدل دیجئے گا۔"

"تمہاری باتوں پر اعتبار وہ کرے جس نے ایسے دعوے پہلی بار سنے ہوں۔" امی نے سر جھٹکا اور کچن میں واپس چلی گئیں۔

تقی نے بدمزا ہو کر سمیر کی طرف دیکھا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے بنا آواز نکالے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ تقی کی درگت بنتے دیکھنے میں اسے بڑا مزا آیا تھا۔

"بڑی ہنسی آ رہی ہے۔ اب تو ہو گئی ہو گی تسلی؟ پڑ گئی ہو گی سینے میں ٹھنڈ؟" اس نے جل کر کہا تھا۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔۔ صبح سے میں ہی اکیلا بے عزتی کروا رہا ہوں۔ اب تجھے آنٹی کے ہاتھوں بے عزت ہوتا دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی ہے۔ سکون آگیا ہے دل کو۔" وہ مزے سے بولا تھا۔

"سکون تو تب آئے گا بچو جی! جب "وہ" تیرے سامنے آئے گی۔ جس کی تصویر دیکھے بغیر ہاں کر آئے ہو۔ میری بددعا ہے سمیر کہ وہ ایسی کالی کلوٹی' بدصورت چڑیل ہو کہ شادی کی پہلی رات ہی خود کشی کر لے تو۔"

"مجھے افسوس ہے دوست! تمہیں اس کی حسرت ہی رہے گی۔ وہ تو بہت پیاری ہے۔" سمیر اترایا۔ "بالکل فرحت اشتیاق کے کسی ناول کی ہیروئین لگتی ہے۔"

"ابھی تو کہہ رہے تھے تصویر بھی نہیں دیکھی' اب کہہ رہے ہو پیاری ہے۔۔۔۔ الہام ہوا ہے کیا؟"

"یہی سمجھ لو۔ دراصل میں نے رات اسے خواب میں دیکھا ہے۔"

"خواب پہ بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواب میں تو ساری پیاری لگتی ہیں۔" تقی نے ہنس کر کہا۔ پھر صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوگرز کے تسمے بند کرنے لگا۔

"اچھا سمیر! میرے پاس بھی ایک خبر ہے۔" اس نے آواز دبا کر اور احتیاط سے ادھر ادھر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارشاد ہو۔" سمیر امی کی پلیٹ سے کھانے لگا۔

"جاثم یاد ہے تجھے؟" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"جاثم؟" سمیر نے پل بھر سوچا۔ "وہ جو کوئی پروڈیوسر تھا شاید؟"

"پروڈیوسر نہیں کاسٹنگ ڈائریکٹر۔" تقی نے تصحیح کروائی۔ "جاثم نے ایک ہیوی بجٹ ڈرامے میں مجھے لیڈ رول آفر کیا ہے۔۔۔۔ عائشہ خان کے اپوزٹ۔"

"کیا؟" سمیر کا منہ اور آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ تقی کو اس کی حالت دیکھ کر گدگدی ہوئی تھی۔

"ہے ناں دلچسپ بات؟ جب پہلے پہل جاثم نے مجھے آفر کی تو میرا منہ بھی ایسے ہی کھل گیا تھا۔ میرا پہلا بریک' ہیوی بجٹ' دبئی اور قطر میں شوٹنگ اور میرا لیڈ رول۔۔۔۔ تجھے بھی یقین نہیں آ رہا ناں سمیر!"

"نہیں! ان باتوں پر تو یقین آگیا ہے۔ حیرانی تو مجھے عائشہ خان کا نام سن کر ہو رہی ہے کس قدر احمق آدمی ہے یہ جاثم ۔۔۔۔ جو تمہیں عائشہ خان کے اپوزٹ کاسٹ کرنا چاہ رہا ہے۔ کہاں وہ اتنی خوب صورت لڑکی اور کہاں تم جیسا چغد۔۔۔۔ کیا فضول جوڑی لگے گی۔"

"فٹے منہ۔" تقی جو اسے انہماک سے سن رہا تھا' سلگ کر بولا۔ سمیر ہنسنے لگا پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔

"ویسے آفر تو اچھی ہے۔"

"پھر؟" تقی کی آنکھیں چمکیں۔

"پھر یہ کہ فوراً" سے پیشتر انکار کر دے۔" سمیر نے

زور دے کر کہا۔ "ابا کو بھنک بھی پڑ گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔"

"ہوں۔" تقی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ اس کا خیال تھا اور خواہش بھی تھی کہ سمیر تو اس کو اس کردار کے لیے ہامی بھرنے کا ضرور کہے گا۔ لیکن وہ بھی تصویر کا وہی رخ دکھا رہا تھا جو اس کی مرضی کے برعکس اور حقیقت پر مبنی تھا۔

"ٹھیک ہے! میں جاثم کو منع کر دیتا ہوں۔ ابا کو تو ناراض نہیں کیا جا سکتا۔"

اس نے مرے دل کے ساتھ۔ لیکن حتمی فیصلہ کیا اور لسی کا گلاس لبوں لگالیا۔

☼ ☼ ☼
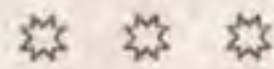
"شفا! مجھے یاد آیا میں تمہیں بتانا بھول ہی گئی۔" ساہر پرجوش انداز میں بولتی کچن سے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی۔ شفا عادل اور ہدیہ کے ساتھ وہاں بیٹھی کوئی کارٹون موی دیکھ رہی تھی۔

"کون سی بات بھابھی!" اس نے گردن موڑتے ہوئے پوچھا۔ ساہر کے دونوں ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے۔

"میں نے عمیر سے تمہارے کالج ٹرپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے اگر شفا جانا چاہتی ہے تو چلی جائے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"آپ سچ کہہ رہی ہیں بھابھی؟" شفا نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جھوٹ کیوں بولوں گی۔"

شفا کو یقین آہی نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا اور ساہر سے لپٹ گئی۔

"بھائی اتنی آسانی سے مان جائیں گے۔ میں نے تو سوچا تک نہیں تھا۔"

"کس نے کہا کہ عمیر آسانی سے مانے ہیں۔" ساہر نے کہا۔

"تو پھر؟"

"محترمہ! آپ کی سفارش بھی تو تگڑی تھی۔" ساہر نے اترا کر کہا۔ دونوں ہنس دیں۔

"اس خوشی میں میں آپ کو اچھی سی کافی پلاؤں گی۔"

"معاف کیجیے گا' میں اتنی گرمی میں کافی پینے کا رسک نہیں لے سکتی۔" ساہر نے منہ بنا کر کہا۔ "ایسا کریں گے' کل مارکیٹ چلیں گے۔ تم ساتھ لے جانے کے لیے اپنی ضرورت کی چیزیں اور دو تین سوٹ لے لینا اور ہم وہاں سے دہی بڑے بھی کھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" شفا خوش ہو گئی۔ پھر کچھ خیال آنے پر جھجکتے ہوئے بولی۔

"بھابھی! میں ثمر کو بتا دوں؟"

"ہاں۔۔۔ تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے' بھئی۔۔۔ ویسے بھی ثمر سے ملنے پر عمیر کو اعتراض ہے' مجھے نہیں۔"

"عمیر بھائی کو اچانک اعتراض کیوں رہنے لگا ہے؟ میں نے اس بات پر بہت سوچا ہے لیکن۔۔۔" شفا نے الجھن بھرے لہجے میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"عمیر ہم دونوں سے زیادہ گھر سے باہر جاتے ہیں دس لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا رہتا ہے۔ ممکن ہے ثمر کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات کان میں پڑ گئی ہو۔ تب ہی وہ منع کرتے ہیں کہ تم ثمر سے نہ ملا کرو۔۔۔ ظاہر ہے بھئی! صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔"

"ثمر ایسی نہیں ہے بھابھی! میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔" شفا نے جلدی سے کہا۔ "حیرانی مجھے عمیر بھائی پر ہے۔ وہ بھی تو ثمر کو بچپن سے جانتے ہیں۔ کوئی بات سن بھی لی تھی تو اس پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"بعض اوقات کوئی بات اس انداز میں بتائی جا رہی ہوتی ہے کہ سننے والا اس پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ خیر چھوڑو۔" ساہر نے لاپروائی سے کہا۔

"تم ثمر کو بتا کر فٹافٹ واپس آؤ۔ تب تک میں روٹیاں بنا لیتی ہوں پھر کھانا کھاتے ہیں۔" ساہر نے

کہا۔
"ہدیہ کارٹون دیکھ رہی ہے۔ عادل کو میں ساتھ لے جاتی ہوں۔" اس نے دائیں پہلو پر تقریباً "عادل کو لادا اور جھٹ پٹ باہر نکل گئی۔ ساہر نے مسکراتے ہوئے اسے جاتے دیکھا۔ پھر اسی طرح مسکراتی ہوئی کچن میں آگئی۔

مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وکٹری پوائنٹ کے قریب پہنچ جانے والا انسان جو محسوس کر سکتا ہے ساہر وہی محسوس کر رہی تھی اور چشم تصور سے شفا کو خوشی خوشی ثمر کو اپنے ٹرپ پر جانے کی اطلاع دیتے دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے اسی تصور کی آنکھ سے عمیر کو دیکھا جن کی پیشانی پر غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں لکیریں ابھر آئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

ساہر کو شرمساری محسوس ہوئی کہ بہرحال وہ عمیر کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتی تھی اور وقت یہ تھی کہ عمیر کو تکلیف پہنچائے بغیر وہ اپنے مقصد تک رسائی بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ ناچار ضمیر کا بوجھ اسے اٹھانا ہی پڑ رہا تھا۔

"مجھے تم سے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے شفا! کیونکہ یہ میرا اسکینڈ لاسٹ اسٹروک ہے۔" آٹے سے سنے ہاتھ پرات میں جھاڑتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں شفا کو مخاطب کیا۔

"میں تمہیں عمیر کی نظروں میں اتنا خوار کروں گی شفا! کہ عمیر تو عمیر، تم دوبارہ زندگی میں میرے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھا سکو گی۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ لیکن اسے احساس تک نہیں ہو رہا تھا اس پل اس کا چہرہ کس قدر مکروہ لگ رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

"میرے پاس جوگرز کا ایک بھی جوڑا نہیں ہے۔" سمیر نے فون پر تقی کو بیزاری اور پریشانی سے بتایا۔

"میں ادھار کے سخت خلاف ہوں۔ مجھ سے نہ مانگنا۔" تقی نے بے مروتی سے کہہ دیا۔ سمیر جھنجھلا گیا۔

"تقی! تو انتہائی کمینہ انسان ہے یار!"

"آپ کا حسن نظر ہے جناب!" وہ کہاں چوکنے والا تھا۔

"پہلے کبھی تیرے جوگرز مانگے ہیں؟ اونہہ۔۔۔ یار رہنا لوز النک روڈ تک جانا ہے۔ میں تیری طرف آرہا ہوں۔"

"صرف جوگرز ہی بخشے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہاسٹل میں تو تو میری بنیانیں بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ خیر نہ جا۔ میں اسٹور پر ہوں۔ ادھر ہی آجا۔"

پچیس منٹ بعد سمیر اسٹور پہنچ گیا۔ تقی ابا کے اسسٹنٹ کو اپنی سیٹ پر بٹھا کر اور تاکید کر کے سمیر کے ساتھ ہو لیا۔

"ابا کا فون آجائے تو سنبھال لینا۔ زیادہ پوچھیں تو کہہ دینا میں نماز پڑھ رہا ہوں۔" وہ اچھی طرح سمجھا کر نکلا۔ رضی کے سمجھانے کا اتنا اثر تو ہوا تھا کہ اس نے فارغ اوقات میں اسٹور آنا شروع کر دیا تھا۔ یوں لودھی صاحب کو دوپہر میں گھر جا کر آرام کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا اور تقی کو اچھی مصروفیت بھی مل گئی تھی۔

"اچھا! تو ہاسٹل میں میں تیری بنیانیں نہیں چھوڑتا تھا۔" سمیر نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا اور تقی حسب عادت ہنس دیا۔

"تو نے تو دل سے ہی لگالی ہے میری بات۔ یونہی کہہ دیا تھا۔"

"یار!" اس نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے زور دار طریقے سے سمیر کی کمر تھپتھپائی۔

"اچھا ہوا تو نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ ورنہ میں تو گھر سے ان صابنوں اور ٹوتھ پیسٹوں کا حساب کر کے آیا تھا جو تو مفت میں اڑاتا رہا تھا۔" ان دونوں نے بہ یک وقت قہقہہ لگایا۔ ہاسٹل میں گزرے دن جو یاد آگئے تھے۔

چند منٹ خاموشی سے گزرے۔ پھر تقی نے کہا۔

"یار! سمیر ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"یار! میں ابا کا کیا کروں؟" اس نے مسکینی سے پوچھا۔ سمیر ذرا سا چونکا۔ پھر بولا۔

"اب کیا ہوا؟"

"کچھ نیا تو نہیں۔ وہی پرانی باتیں ہیں۔۔۔ پر ابا کبھی کبھی مجھے بہت ہرٹ کر دیتے ہیں۔ اسٹور یا گھر پر کوئی آجائے۔ میری شکایتیں بطور خاص کرتے ہیں۔۔۔ جیسے دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ مجھے لگتا ہے ابا پر دن میں پانچ بار میری برائی فرض ہو گئی ہے۔ اب تو مجھے شک سا رہنے لگا ہے کہ میں ابا کا بیٹا ہوں یا ابا کے شریکوں کا۔" وہ بچوں کی طرح بسور رہا تھا۔

"بات یہ ہے تقی! کہ تم اپنے ابا کی باتوں کو محسوس زیادہ کرتے ہو۔ ورنہ دنیا کے کون سے ابا ہیں، جو اپنے بیٹے کو باتیں نہ سناتے ہوں۔ اب میرے ابو کو ہی دیکھ لو کتنی دوستی ہے مجھ سے۔ لیکن ڈانٹنے پر آئیں تو اگلا پچھلا سارا حساب ایک منٹ میں برابر کر دیتے ہیں۔ بزرگوں کے ساتھ ساری بات دراصل جنریشن گیپ کی ہوتی ہے۔ جنریشن گیپ جتنا زیادہ ہوتا ہے "عموماً" کمیونیکیشن گیپ بھی اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔۔۔ تمہارا اور ابا کا زیادہ مسئلہ ہی یہ ہے کہ تم دونوں کے درمیان کمیونیکیشن نہ ہونے کے برابر ہے۔۔۔ جو وہ سوچتے ہیں تم نہیں سمجھتے اور جو تمہارے خیالات ہیں، وہ ابا نہیں سمجھتے۔ میرا مشورہ مانو، ابا کے ساتھ تھوڑا وقت گزارا کرو۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کرو گے تو مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔"

"ہاں! دن کی جو چند گھڑیاں ابا کے طعنوں کے بغیر گزرتی ہیں۔ پھر وہ بھی ان کے طعنوں کی سنگت میں گزریں گی۔" اس نے سلگ کر کہا۔ "اور جب اتنے طعنے ملیں گے تو تنگ آکر خودکشی تو میں کر ہی لوں گا۔ تو ایسا کر سمیر! مجھ پر ابھی سے فاتحہ پڑھ لے۔"

"تم ابا کی خوشی کا خیال کرو۔" سمیر نے ایک اور مشورہ دیا۔

"اب تو انہیں خوش کرنے کے لیے بس "نرگس بن کر ناچنا ہی رہ گیا ہے۔ ورنہ باقی تو سب کوششیں میں کر چکا۔"

سمیر نے ہاتھ پیچھے لے جا کر زوردار گھونسا اسے رسید کیا۔

"آنٹی صحیح کہتی ہیں، برکتوں والا ہو گا وہ دن۔ جب تم سوچ سمجھ کر بولنا سیکھو گے۔۔۔ اور یہ اپنے کارناموں کو چار سے ضرب دے کر بتانا بھی چھوڑ دو۔ اچھی طرح خبر ہے کہ ابا کو خوش کرنے کی کتنی کوششیں کی ہیں تم نے۔" اس نے جھاڑ کر رکھ دیا۔

"تو کیا کروں؟ اپنی قربانی کر کے انہیں زنگر بنا کر کھلا دوں؟۔۔۔ ممکن ہے وہ خوش ہو جائیں۔"

"ہمیشہ وہ بات کرنا، جو ناممکنات میں سے ہو۔۔۔ او بھائی میرے! اسٹور پر جا کر زیادہ سے زیادہ وقت گزارا کر۔"

"اب ذرا سی بات پر خفا ہو کر ڈانٹنے لگتے ہیں، سارے ملازمین اور کسٹمرز کے سامنے۔"

"انہیں چائے بنا کر پلایا کرو۔" ایک اور نادر مشورہ۔

"اس سے کیا ہو گا؟" تقی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے دل تک جانے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔"

"گدھے۔۔۔ وہ مشورہ عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ شوہروں کے دل تک رسائی حاصل کر سکیں۔"

"اللہ کے گھر میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم بھی کوشش کر دیکھو۔ کیا پتا ابا کا دل نرم پڑ جائے۔"

"تم مہربانی کر کے اپنے نادر مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ صرف اتنا کرنا! جب تمہاری کمپنی میں آسامیاں نکلیں تو مجھے انفارم کر دینا۔ دو تین جگہوں پر تو میں پہلے ہی سی وی دے چکا ہوں۔ ایک جگہ انٹرویو بھی دیا ہے۔۔۔ اللہ کرے! جاب مل جائے تو ابا کے طعنوں سے جان چھوٹے۔"

"تمہارا ارادہ جاب کرنے کا تھا تو پہلے بتاتے۔ ابھی

پچھلے دنوں ہماری کمپنی کے اکاؤنٹس میں اتنی اچھی ویکنسی نکلی تھی۔ مجھے پتا ہوتا تو تمہیں پہلے ہی بتا دیتا۔" سمیر کو رنج ہوا۔

"پتا کرنا.... ہو سکتا ہے ابھی اپائنٹمنٹ نہ ہوئی ہو۔" تقی نے جلدی سے کہا تھا۔

"ہاں! پتا کرتا ہوں۔ بلکہ ایسا کرنا۔ اپنی سی وی مجھے میل کر دینا۔ چانس ہوا تو سیٹ کروا دوں گا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا! اگر میرے ریفرنس سے تمہیں جاب ملی تو تگڑا سا ڈنر کروانا پڑے گا۔"

"بھوکے 'ندیدے' ڈنر تو میں نے ویسے بھی دے دینا تھا۔" تقی کچھ زیادہ ہی حاتم طائی بنا۔

"ہوں! اچھی بات ہے.... اور سنو! ابا کی باتوں پر پریشان یا ہرٹ ہونا چھوڑ دو۔ بزرگ تو ڈانٹتے ہی ہیں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو.... ابو جن دنوں زیادہ ہی میرے "ابو جی" بن رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں۔" سمیر نے شرارت سے کہا۔

"ویسے تقی! جاب مل گئی تو یونیورسٹی کا کیا کرو گے؟ سمسٹر ڈراپ کرو گے کیا؟"

"نہیں! ڈراپ تو نہیں کروں گا ان شاء اللہ شاید فریز کروالوں یا ریگولر میں ٹرانسفر کروالوں۔ نوکری ملے تو پھر دیکھتے ہیں کس طرح مینج ہوتا ہے۔ لیکن اب بس ابا کے طعنے نہیں سنے جاتے۔"

جس وقت سمیر نے بائیک روکی، تقی مستحکم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان دونوں کی چپقلش نئی نہیں تھی۔

اگر کبھی ساہر سنجیدگی سے بیٹھ کر سوچتی تو اسے ایسا لگتا تھا کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے ناپسندیدگی تو تقریباً اسی روز پیدا ہو گئی تھی جس روز ساہر بیاہ کر عمیر کی زندگی میں آئی تھی۔

شادی کی رات وہ سجے سجائے کمرے میں بیٹھی عمیر کا انتظار کر رہی تھی کہ شفا کمرے میں آگئی اور بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ ساہر کو اس کی باتیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی باتوں میں بہت معصومیت تھی۔ وہ چھٹی کلاس میں تھی اور اس کی باتوں کا محور عمیر، سہیلیاں اور اس کا اسکول تھا۔

تھوڑی دیر بعد عمیر کمرے میں آئے اور وہ بھی شفا سے باتیں کرنے لگے۔

عمیر اور ساہر کی پسند کی شادی تھی اور یہ ان کی زندگی کی سب سے خوب صورت رات تھی۔ پسند کی شادی نہ بھی ہوتی تو بھی یہ رات دولہا دلہن کے لیے اتنی خاص ہوتی ہے کہ وہ دیر تک اپنے دل کے ارمان ایک دوسرے کے سامنے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ساہر اور عمیر کو خوشی اور ایکسائٹمنٹ کے مارے نیند نہ آتی۔ لیکن نیندیں شفا بیگم کی اڑی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کون کون سی باتیں تھیں۔ جو اسے یاد آ رہی تھیں اور وہ آج ہی نئی نویلی بھابھی سے کر لینا چاہتی تھی۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ ساہر تو خیر دلہناپے کا لحاظ کر کے چپ تھی۔ عمیر بھی بول نہیں پا رہے تھے بالآخر انہوں نے شفا سے جا کر سونے کے لیے کہا۔ وہ منہ بسورتی ہوئی رخصت ہوئی تھی۔ تب عمیر نے شرمندہ شرمندہ سی نظریں اس پر ڈالیں۔

"تم کہتی تھیں ناں! شفا کو تم سے ملوانے کیوں نہیں لاتا.... اسی لیے نہیں لاتا تھا۔ مجھے پتا تھا یہ بول بول کر تمہارے کان کھا جائے گی۔"

ساہر نے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ عمیر اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اگلی صبح ویسی ہی تھی، جیسی روایتی شادیوں کی صبح ہوتی ہے۔ ناشتا، رشتہ دار خواتین کی کمرے میں یلغار، شور و ہنگامہ۔

جس وقت شفا سو کر اٹھی، عمیر اور ساہر ناشتا کر چکے تھے اور عمیر اسے اپنی خالاؤں، پھوپھیوں اور کزنز کے نرغے میں چھوڑ کر خود کہیں غائب ہو چکے تھے۔

"آؤ شفا! یہاں اپنی بھابھی کے پاس بیٹھو۔" شفا کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کسی نے کہا تھا۔

"یہ ساہر بھابھی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ارے! اتنی سی دیر میں بھول گئیں؟" سب ہنس دیے۔ خود ساہر بھی محظوظ ہوئی تھی۔

شفا جواب دینے کے بجائے اور ساہر کے پاس بیٹھنے کے بجائے سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی اور اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ ساہر کی توجہ اس قدر بٹی ہوئی تھی کہ وہ شفا پر دھیان دے سکی نہ اس کی آنکھوں کی الجھن تک پہنچ سکی۔

"ایسے ہی عمیر بھائی ان کو اجالا کہتے ہیں.... اونہہ.... یہ تو اتنی کالی ہیں، شام کو تو ٹیوب لائٹ جلائے بغیر نظر بھی نہیں آئیں گی۔"

اچانک شفا نے نخوت سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ پیچھے کمرے میں سب کے قہقہے بکھر گئے۔ صرف ساہر تھی، جو خاموش تھی۔ خفت سے اس کا چہرہ بری طرح بگڑ گیا تھا۔

وہ کالی تو ہرگز نہیں تھی۔ ہاں اس کی رنگت گندمی تھی اور جلد بہت صاف ستھری تھی جس کی وجہ سے خوب صورت لگتی۔ لیکن شفا نے اچھی خاصی رنگت کو کالا کہہ کر لطیفہ بنا دیا تھا۔ اوپر سے عمیر کے خاندان والے بھی خدا جانے کس قسم کی حس مزاح رکھتے تھے۔ تقریب ولیمہ کے اختتام تک بھی یہی بات دہرائی جاتی رہی اور خوب خوب محظوظ ہوا گیا۔

رات تک عمیر کے کان میں بھی شفا کے کمنٹس پڑ چکے تھے۔ جب وہ کمرے میں آئے تو وضاحت دینے لگے۔

"شفا کو میں نے دراصل بہت پیار سے رکھا ہے۔ کبھی کسی بات پر ڈانٹا نہیں۔ شاید اسی لیے وہ تھوڑی سی منہ پھٹ ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے اسے ڈانٹا ہے۔ پلیز! تم اس کی کسی بات کا برا مت ماننا۔"

"میں نے تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہا عمیر!" ساہر نے سادگی سے کہا تھا۔

"ہاں.... لیکن کہو گی تو مجھے اچھا لگے گا۔" عمیر نے محبت سے کہا۔

"ہمارے ماں باپ کا انتقال تو کئی سال پہلے ہی ہو گیا تھا۔ یہ تو تم جانتی ہو۔ لیکن یہ نہیں جانتیں کہ شفا کو تقریباً میں نے ہی پالا ہے.... میں اسے بہن نہیں بیٹی سمجھتا ہوں اور بیٹی سمجھنے کے باوجود میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس کی زندگی میں ماں کی کمی پوری نہیں کر سکا۔ ساہر! میں چاہتا ہوں، یہ کمی تم پوری کرو۔ شفا دل کی بہت اچھی ہے۔ تم اسے تھوڑی سی محبت دو گی تو وہ تمہاری غلام بن جائے گی۔"

"آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں شفا کو اپنا غلام بناؤں؟" ساہر نے ہنس کر کہا۔ "میں اسے اپنی دوست بناؤں گی جناب! اور بالکل بے فکر رہیں۔ شفا آپ کے لیے اہم ہے تو میرے لیے بھی ہے۔ بلکہ میرے لیے ہر وہ رشتہ اہم ہے عمیر! جسے آپ اہمیت دیتے ہیں.... آپ دیکھیے گا میرے اور شفا کے درمیان مثالی نند بھابھی والا تعلق ہو گا۔"

"تھینک یو ساہر! تھینک یو سو مچ۔" عمیر نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

اور ساہر جو یہ سوچ رہی تھی کہ اس کے اور شفا کے درمیان مثالی نند بھابھی والے تعلقات قائم ہو جائیں گے، شفا ایک ایک کر کے اس کی ہر توقع پر پانی ڈالتی چلی گئی۔ ساہر کے میکے میں اس کی کزنز اور سہیلیاں اس پر رشک کرتی تھیں کہ ایسے گھر میں جا رہی ہے، جہاں ساس سسر کی کوئی جھنجھٹ نہیں۔ ایک چھوٹی سی نند ہے، جسے قابو کرنا کیا مشکل ہو گا۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ چھوٹی سی نند اسے ناکوں چنے چبوا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

پہلے پہل شفا اس سے بدتمیزی کرتی، زبان چلاتی۔ ہر بات کا الٹا سا جواب دینا اپنا فرض سمجھتی۔ اس کا موڈ ہوتا تو بات کرتی۔ ورنہ جواب ہی نہ دیتی۔ عمیر کے آفس سے آتے ہی وہ ان سے چپک جاتی تھی۔ جب تک وہ جاگتی رہتی، ساہر کو ان سے بات کرنے کا موقع

بھی بمشکل مل پاتا۔ شادی کے شروع دنوں میں اسے عمیر کے ساتھ اکیلے کہیں باہر جانے کا موقع بھی تین یا چار بار ملا ہوگا۔ کیونکہ جیسے ہی عمیر اسے باہر لے جانے کا نام لیتے شفا صاحبہ اس سے بھی پہلے تیار ہو کر کھڑی ہو جاتیں۔

ساہر نے ایک آدھ بار عمیر سے گلہ بھی کیا جواب میں عمیر نے اسے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا۔

"شفا کو گھر پر اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں جانتا ہوں تم میرے ساتھ اکیلی جانا چاہتی ہو' لیکن تمہیں بھی سمجھنا چاہیے۔"

تھک ہار کر اس نے عمیر سے فرمائش کرنا ہی چھوڑ دیا۔ جبکہ محض شفا کی تنہائی کے خیال سے ان لوگوں کو اپنا ہنی مون ٹرپ بھی منسوخ کرنا پڑا تھا۔ گو کہ ساہر کو اس بات پر خاصا اعتراض تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شفا چند روز کے لیے کسی رشتہ دار کے گھر بھی رہ سکتی ہے۔

"میں نے سوچا تھا' شفا کو ثروت خالہ کے یہاں چھوڑ دوں گا۔ لیکن انہیں سیالکوٹ شفٹ ہونا پڑ رہا ہے۔ کسی اور کے یہاں میں شفا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کوئی اور اتنا قریبی رشتہ دار ہے ہی نہیں۔"

ساہر سر پیٹ کر رہ گئی۔ اس کے پاس آپشن تھا کہ شفا کو اس کی امی کے یہاں بھی چھوڑا جا سکتا ہے لیکن عمیر کا کیا کرتی' جو شفا کے معاملے میں کوئی "اگر' مگر' لیکن" سننے کے روادار نہ تھے۔ ان کے لیے شفا کی ہر بات اولیت رکھتی تھی اور وہ کہہ چکی تھی کہ خالہ کے علاوہ کسی اور کے گھر رہنا اسے منظور نہیں ہے۔

یہاں تک جب شفا نے عمیر کے ساہر کو "اجالا" کہہ کر پکارنے کی عادت کو وقتاً "فوقتاً" مذاق کا نشانہ بنانا شروع کیا تو عمیر نے اسے اجالا کہنا ہی چھوڑ دیا۔ بات اتنی بھی بڑی نہیں تھی۔ لیکن دل بوجھل ضرور ہوا۔

صرف یہی نہیں' شکایات کا ایک سلسلہ تھا' جو ہر گزرتے دن کے ساتھ عمیر کے لیے ساہر کے دل میں شفا کی وجہ سے طویل ہوتا جا رہا تھا۔ دل میں [illegible] والی ہر گرہ نظر انداز کی جا سکتی تھی۔ اصل دقت کا سامنا اسے اس وقت کرنا پڑا' جب نئی شادی کے [illegible] انداز ایک طرف رکھ کر اس نے سارے گھر کا چارج اپنے ہاتھ میں لیا۔ شفا کو اس کے ہر کام میں خامیاں نظر آتیں۔ وہ اس کے ہر کام میں مین میخ نکال کر اسے زچ کرنے کی کوشش کرتی۔ اسے ساہر کی فون کالز [illegible] لگتیں۔ حتیٰ کہ اس کے نئے کپڑے پہننے پر بھی اعتراض رہتا۔

ساہر نے اس کی ہر بری اور ناپسندیدہ عادت کو کم عمری کی ناسمجھی اور نادانی سمجھ کر نظر انداز کیا۔ لیکن ایک وقت آیا' جب ساہر کو اندازہ ہوا کہ شفا کم عمر تھی۔ لیکن ناسمجھ یا نادان ہرگز نہیں تھی۔

وہ کسی بھی بات کو توڑ مروڑ کر کچھ اس طرح سے عمیر کے سامنے پیش کرتی کہ کوئی غلطی نہ ہونے کے باوجود ساہر مجرم بن جاتی اور پھر اسے عمیر کی سخت سست سننا پڑتیں۔

پھر یہ ان ہی دنوں کی بات ہے' جن دنوں وہ پہلی مرتبہ تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھی۔ عجب سا چڑچڑا پن اور بے زاری آ گئی تھی مزاج میں۔ معمولی معمولی باتوں پر دیر تک کڑھتی۔ لیکن شفا کی اکثر بات پر بہت زیادہ غصہ آنے کے باوجود خود پر قابو رکھتی تھی۔ مگر جب عمیر مستقل اسی کو باتیں سنائے جاتے تو وہ جھنجلا جاتی۔ ایک روز تو حد ہی ہو گئی۔ اس کی طبیعت صبح سے خراب تھی اور اس پر سے عمیر کی باتیں۔

"آپ کیا چاہتے ہیں عمیر! شفا کو گود میں لے کر بیٹھا کروں میں؟ نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالا کروں؟"

"میں پاگل نہیں ہوں کہ تم سے یہ سب کہوں۔" عمیر نے اس سے زیادہ غصے میں کہا۔ "لیکن تم اس کے پاس تو بیٹھ سکتی ہو۔ وہ اسکول سے آ کر سارا دن اکیلی جھینکتی رہتی ہے۔ گھر میں لوگ ہی کتنے ہیں کہ ایک کا منہ مشرق اور دوسرے کا مغرب کی طرف رہے۔"

"میں اس کے پاس جا کر بیٹھتی ہوں۔ لیکن وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جائے تو میں کیا کروں؟"

"تم بھی دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں' میں آپ کی بہن کے پیچھے پیچھے پھروں۔۔۔۔ اس کے ناز نخرے دیکھوں؟"

"ساہر!" عمیر نے اکتاہٹ کے مارے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔ "میں مانتا ہوں' شفا بدلحاظ ہے۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ وہ تم سے زبان چلاتی ہے۔ لیکن وہ بچی ہے۔ تم اسے پیار سے سمجھاؤ گی تو تمہاری ہر بات مانے گی۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی کا شکار رہی ہے۔ شادی ہو کر تم اس گھر میں آؤ' اس کا مجھ سے زیادہ شفا کو شوق تھا لیکن تمہارے آنے کے بعد تو وہ اور تنہا ہو گئی ہے۔"

"اب یہ جرم بھی آپ میرے کھاتے میں ڈال دیں عمیر! اگر آپ ہمیشہ مجھے سمجھانے کے بجائے کبھی کبھار شفا کو بھی سمجھا لیں تو یقیناً" گھر کا ماحول بہتر ہو سکتا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' میں اس کو نہیں سمجھاتا؟"

"میرے سامنے تو کبھی نہیں سمجھایا۔ ہاں! مجھے اس کے سامنے ضرور ڈانٹتے ہیں۔"

"ساہر! تمہیں اندازہ ہے' میں شفا کے لیے کتنا پریشان ہوں۔ وہ ایسی نہیں تھی' جیسی اب ہو گئی ہے بدتمیز' بدلحاظ' منہ پھٹ۔۔۔۔ بچے جب بڑے ہو رہے ہوتے ہیں تو ان کے مزاج میں تبدیلی آتی ہے۔ لیکن بڑوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ بچوں کے دماغ میں اس وقت پڑنے والی گرہوں کو کھولیں۔ بچوں کو ایک بھرپور اور مثبت شخصیت بننے میں مدد دیں۔ اگر بڑے ہی انہیں تنہا چھوڑ دیں تو ان کی شخصیت بگڑے گی' نہ کہ سنورے گی۔"

"میرے بچے ہوں گے تو میں انہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔" آج وہ بہت ہی جھنجلا گئی تھی۔

"گویا تم شفا کو اپنا کچھ نہیں مانتیں؟"

"شفا بھی مجھے اپنا کچھ نہیں مانتی۔"

"غلط بیانی مت کرو ساہر! وہ تو اتنی ایکسائیٹڈ تھی ہماری شادی کے لیے کہ بھابھی گھر میں آئے گی تو اسے ایک دوست مل جائے گی۔"

"میں نے بھی سوچا تھا' کلوتی نند کو دوست بنا کر رکھوں گی۔"

"لیکن تم نے دشمن بنا لیا۔"

"میں نے دوست بنانے کی کوشش ہی کی تھی۔ وہ دشمن بن گئی۔"

"یعنی ساری غلطی اسی بچی کی ہے؟"

"جی نہیں! ساری غلطی میری ہے۔" اس نے سلگ کر کہا۔ "او خدارا! آپ اسے بچی کہنا تو بند کریں عمر کے حساب سے بچی ہو سکتی ہے۔ لیکن عقل تو کسی پختہ عمر کی عورت جتنی ہے اس کے پاس۔"

"میری بہن کے بارے میں اس انداز میں بات مت کرو۔" عمیر نے بلند آواز میں کہا۔ انہیں ساہر کا انداز بہت برا لگا تھا۔

"تمہیں اتنی سی بات کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی کہ شفا تنہائی کا شکار ہو کر اگریسو ہو گئی ہے' نیگیٹوٹی لے رہی ہے۔ یہ اسی تنہائی کا غبار ہے' جو بدتمیزی اور زبان درازی کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔"

"عمیر! مجھے تنہائی کا فلسفہ نہ سمجھائیں۔ میں پہلے ہی بے زار ہوں۔"

عمیر نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ "شفا آج سارا دن روتی رہی ہے ساہر! کیا تم نے اس سے ایک بھی بار پوچھا' وہ کیوں رو رہی ہے؟"

"کمال ہے عمیر! بہن کی روئی ہوئی آنکھیں آپ کو آفس سے آتے ہی نظر آ گئیں۔ میں نے آفس فون کر کے بتایا تھا' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کمر میں اتنا درد ہے کہ کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔ پاؤں بری طرح سوج گئے ہیں اور آپ نے ایک بھی بار میرا حال پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ الٹا آپ چاہتے ہیں' میں اپنی تکلیف بھول کر شفا سے پوچھتی' وہ کیوں رو رہی تھی؟"

ساہر کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔

"تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔" عمیر نے کہا۔ "جس عورت میں اتنی عقل نہیں کہ ایک تیرہ سال کی

بچی سے اپنا مقابلہ نہ کرے۔ اس سے کسی عقل مندی کی توقع ہی فضول ہے۔" وہ تپائی کو ٹھوکر مارتے باہر نکل گئے۔

بے بسی کے احساس سے سماہر رونے بیٹھ گئی اور بہت دیر تک روتی رہی۔ عمیر سے اگلے کئی روز تک بول چال بند رہی۔ وہ شفا کو سارا وقت دینے لگے تھے۔ سماہر جب بھی دونوں کو ہنستا دیکھتی' اس کا دل جل کر خاک ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا' وہ دونوں محض اسے دکھانے کو ہنستے ہیں۔

اسے بہن بھائی کی محبت پر اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض صرف اس بات پر تھا کہ اس کی بھی تو اس گھر میں کوئی حیثیت ہے' جسے شفا تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی اور عمیر اس سے تسلیم کروانا چاہتے بھی نہیں تھے۔ کم از کم سماہر کو ایسا ہی لگتا تھا۔ وہ تو اسے گھر لا کر ہی بھول گئے تھے۔۔۔ یا شاید سماہر کو وہ ملازمہ کی حیثیت سے زیادہ دینا ہی نہیں چاہتے تھے' جو بہ وقت ضرورت گھر کی حفاظت بھی کرے اور ان کی بہن کا دل بھی بہلائے۔

سماہر بار بار متضاد خیالات کا شکار ہوتی۔

☼ ☼ ☼
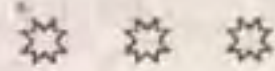
ان دونوں کے درمیان چھڑی ہوئی سرد جنگ ہدیہ کی پیدائش کے ساتھ خود بخود ختم ہو گئی تھی۔ گو کہ عمیر نے رسما "تو کیا غیر رسما" بھی اس سے اپنے رویے کے لیے معذرت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ لیکن سماہر کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ وہ ہدیہ کی پیدائش پر بہت خوش تھے اور اس کا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ عمیر تو عمیر' شفا بھی بہت خوش تھی۔ سارا سارا دن ہدیہ کو گود میں اٹھائے پھرتی۔ بیشتر وقت سماہر کے کمرے میں ہی گزارتی۔ سماہر نے شکر ادا کیا تھا اس کے رویے کی تبدیلی پر۔ پھر اس کی امی نے بھی اسے شفا کے معاملے میں بہت سمجھایا تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو سماہر! کسی دن غصے میں آ کر عمیر تمہیں شفا کے لیے چھوڑ دے؟ کیا اسی دن کے لیے تم نے اپنے تایا ابا سے لڑ کر عمیر سے شادی کی تھی؟"

اس کی امی نے بڑی مہارت سے اس کے دل پر ہاتھ ڈالا تھا۔ چھ بہن بھائیوں میں سماہر تیسرے نمبر پر تھی اور اس کی دادی جان سے مشابہت کی بنا پر تایا ابا اسے بہت پیار کرتے تھے۔ جب ان کے یہاں دوسرے بیٹے نے جنم لیا تو وہ بیٹی کے خواہش مند تھے لیکن خدا نے ان کی قسمت میں بیٹا لکھا تھا۔ اس وقت تایا ابا نے رسمی تو نہیں' البتہ غیر رسمی طور پر اسے گود لے لیا تھا۔ یوں سماہر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان کے گھر ہی گزارا تھا۔ وہ اپنے سگے ابا سے زیادہ تایا ابا سے قریب تھی۔ ان سے لڑ جھگڑ بھی لیتی' لاڈ بھی اٹھوالیتی اور فرمائشیں بھی کر لیتی تھی۔ صرف تایا ابا نہیں' اس گھر میں سب اس سے پیار کرتے تھے۔ سماہر کے منہ سے بات نکلے اور اس گھر میں پوری نہ کی جائے' یہ ممکن ہی نہ تھا۔

لیکن جس وقت عمیر سے شادی کا سلسلہ شروع ہوا' تایا ابا ظالم سماج بن کر کھڑے ہو گئے۔

ایک تو یہ کہ وہ پسند کی شادی کے ویسے ہی خلاف تھے۔ (وہ کیوں خلاف تھے' اس کی وضاحت انہوں نے کبھی نہیں کی تھی) دوسرے وہ سماہر کو خود سے دور بھی نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے پہلے کہا۔ وہ سماہر کی شادی خاندان میں ہی کریں گے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے سب کے کانوں میں ڈالنا شروع کر دیا کہ دراصل وہ سماہر کی شادی اپنے بڑے بیٹے سے کر کے ہمیشہ کے لیے اسے اپنے گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔

سماہر کے لیے یہ خیال ہی سوہان روح تھا۔ کیونکہ تایا ابا کو اس نے ہمیشہ بے حد احترام دیا تھا۔ ان کی حیثیت اس کے ابا سے بھی بڑھ کر تھی۔ اسی طرح تایا ابا کے بیٹے اس کے لیے سگے بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ ان سے تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس کے دل میں عمیر کے لیے جذبے بھی بہت خاص تھے۔ ان کے علاوہ کسی سے شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تایا ابا کے علاوہ سب اس کے ہم نوا

تھے۔ سب نے مل کر بہت زور لگایا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دیں۔ لیکن وہ کسی کی بات سننے پر راضی ہی نہ ہوئے، کجا کہ بات ماننا۔

ساہر کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ہمیشہ اس کی ہر بات مان لینے والے اور اس کے آگے ڈھال بن جانے والے تایا ابا کس قدر ضدی تھے۔ انہوں نے غصے میں ساہر سے کہا کہ اگر وہ ان کا فیصلہ نہیں مان سکتی تو اپنے باپ سے شادی کروانے کے لیے کہے اور دوبارہ اپنی شکل بھی انہیں نہ دکھائے۔ جب اتنی محبت دینے کے باوجود ساہر ان کی حکم عدولی کی ہمت رکھتی ہے تو وہ بھی اس سے قطع تعلقی کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ساہر کو دکھ بھی ہوا، غصہ بھی آیا، لیکن تایا ابا کی ضد کے لیے عمیر سے دستبرداری اسے منظور نہ تھی۔ سو وہ اپنے گھر آگئی۔ یہاں امی اور ابو کو اس کی عمیر سے شادی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ حتیٰ کہ تائی جان اور ان کے بیٹے بھی راضی تھے۔ سو باہمی رضامندی سے اس کی شادی ہو گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ تایا کے گھر سے کوئی شریک نہ ہوا۔ کیونکہ تایا ابا نے سب کو پابند کر رکھا تھا کہ کوئی شادی میں شریک ہوگا، نہ دوبارہ ساہر سے ملے گا۔

تایا ابا ضدی تھے تو وہ ضد میں ان سے چار قدم آگے تھی۔ دوبارہ مڑ کر تایا ابا کے پاس نہ گئی۔ شادی تو ہو گئی، لیکن ایک پھانس اس حوالے سے مستقل اس کے دل میں چبھتی تھی۔

اب امی اسی بات کا حوالہ دے رہی تھیں کہ جس عمیر کے لیے اتنا پیار کرنے والے تایا ابا کو چھوڑ دیا، کیا وہ چاہتی ہے، اب وہی عمیر اپنی بہن کے لیے اسے چھوڑ دے۔

ساہر ان کی بات سن کر بری طرح دہل گئی تھی۔

"کس طرح کی باتیں کر رہی ہیں امی! آپ تو مجھے ڈرا رہی ہیں۔"

"میں تمہیں ڈرا نہیں رہی ساہر! تصویر کا وہ رخ دکھانے کی کوشش کر رہی ہوں، جس کی طرف سے تم نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔" امی نے کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"تم خود ہی تو کہتی ہو عمیر نے شفا کو بیٹی کی طرح پالا ہے۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا ہے، جتنی کوئی باپ اپنی بیٹی سے کر سکتا ہے۔ تمہیں شاید نہیں پتا کہ ہمارا مذہب اور قانون مرد کو اجازت دیتا ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر لاتعلق ہو جائے، لیکن ہمارے مذہب اور قانون میں ایسی کوئی اجازت نہیں ہے، جس کی رو سے ایک بھائی اپنی بہن سے لاتعلق ہو سکے۔ تمہیں سمجھ لینا چاہیے ساہر! اگر تمہارے اور شفا کے اختلافات اور جھگڑے حد سے بڑھے اور عمیر کی بے زاری کا باعث بنے تو اس کی پہلی ترجیح تمہیں طلاق دینا ہوگی۔ بہن کو نہیں چھوڑے گا وہ۔ ہاں! اس کا ضمیر مردہ ہو جائے تو بات دوسری ہے۔"

"ایسے تو مت کہیں امی! عمیر مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ بہت محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے۔" اس نے دہل کر کہا۔

"جب ذہنی سکون ہی نہ ملے تو محبت کس کام کی۔" امی غالباً اس کی ہر خوش فہمی کو منہ کے بل گرانے کا ارادہ کر کے آئی تھیں۔

"پھر بھی امی! اتنی چھوٹی سی بات پر۔۔۔"

"چلو! تم نے یہ تو مانا کہ بات چھوٹی ہے۔" امی نے گہری سانس بھر کر کہا۔ "تو چھوٹی باتوں کو بڑا کیوں بنا رہی ہو ساہر! دور اندیش کب بنو گی تم؟"

"امی! میں چھوٹی بات کو بڑا نہیں بنا رہی، شفا بنا دیتی ہے۔ سارا قصور اسی کا ہے۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

"وہ بچی ہے ساہر! ہو سکتا ہے وہ بچپنے میں کچھ غلط کر رہی ہو، لیکن تم تو بڑی ہو، اس سے زیادہ عقل مند ہو۔ معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیا کرو۔ اس سے دوستی کرو، وہ تمہاری ساری باتیں ماننے لگے گی۔"

"آپ بھی مجھے ہی سمجھا رہی ہیں۔ عمیر کو بھی میں ہی غلط لگتی ہوں۔"

"بات صحیح یا غلط لگنے کی نہیں ہے۔ بات معاملہ فہمی کی ہے۔ تم سے ایک نند نہیں سنبھالی جا رہی۔ لڑکیوں کو تو بھرے پرے سسرال میں جگہ بنانا پڑ جاتی ہے۔ ساس، جیٹھانی، دیورانی، شفا جیسے کئی محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے۔ شفا کب تک ہے تمہارے ساتھ؟ کچھ سال گزریں گے تو وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ پھر اس گھر پر تم کو ہی راج کرنا ہے۔ لیکن ان چند سالوں میں تم اسی طرح عمیر کی بہن سے بے زاری ظاہر کرتی رہیں تو عمیر کی نظروں میں ساری زندگی کے لیے اپنی قدر گھٹا لوگی۔ وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے ساہر! مرد کو مٹھی میں کرنے کا بہترین گر یہی ہوتا ہے کہ اس سے وابستہ افراد سے محبت کی جائے، ان کی عزت کی جائے، تمہیں تو صرف شفا سے تعلقات بہتر کرنا ہیں۔ ذرا تصور کرو تمہاری ساس حیات ہوتیں اور تین، چار نندیں اور ہوتیں تو تمہارا کیا بنتا؟" ماں نے اسے رسان سے سمجھایا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"صرف تین، چار سال مشکل ہیں ساہر! انہیں تحمل سے گزار لو۔ عمیر کے ساتھ ساتھ شفا کے دل میں بھی تمہاری محبت مستحکم ہو گئی تو آئندہ کی زندگی کے لیے میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں کہ تمہارے لیے سکون ہی سکون ہوگا۔"

بات گر کی تھی، اس کی سمجھ میں آگئی۔ کچھ خود بھی صلح جو طبیعت کی مالک تھی اور کچھ شفا کے مزاج میں بھی تبدیلی آ رہی تھی، سو اگلے مہینے سکون سے گزرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

اس روز تقی کو پھر ابا کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑا۔ ناراض تو خیر وہ چوبیس گھنٹے رہتے ہی تھے۔ اس روز اچھی خاصی ڈانٹ بھی پڑ گئی۔ وہ بھی صبح صبح۔

ہوا کچھ یوں کہ پچھلی رات وہ کسی وجہ سے دیر سے سویا اور الارم لگانے کے باوجود صبح مقررہ وقت پر آنکھ نہیں کھل سکی۔ نتیجتاً ساقی کے فون پر فون آ رہے تھے۔

"جلدی پہنچ خبیث! گاڑی آگئی ہے۔ سب لوگ پہنچ چکے ہیں۔ سامان بھی لوڈ ہو چکا۔ صرف تمہارا انتظار ہے۔ پندرہ منٹ میں نہ پہنچے تو میں بتا رہا ہوں، تمہیں چھوڑ کر ہم روانہ ہو جائیں، وغیرہ وغیرہ۔"

وہ ہر پندرہ منٹ بعد فون کر کے یہی دھمکی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ سمیر، ثاقب (جسے سب ساقی کہتے تھے) مبشر، حسان اور سر ارسلان بھی اس چھوٹے سے ٹرپ کا حصہ تھے۔ سر ارسلان ان سے یونیورسٹی میں ایک سال سینئر تھے۔ اعزازی طور پر انہوں نے کچھ عرصہ ان لوگوں کو پڑھایا تھا۔ اسی "کچھ عرصہ" کا لحاظ کر کے وہ سب انہیں سر کہہ کر مخاطب کر لیتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ انہوں نے خود پر سارا ادب و احترام خود پر حرام کر لیا تھا۔

تقی نے اپنا سامان لا کر باہر رکھا اور عجلت میں ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔

"امی آپ نے برگر بنا دیے؟"

"ہاں! فلاسک میں چائے بھی تیار کر دی ہے۔"

"کہاں کی تیاری ہے؟" لودھی صاحب نے سامان پر تنقیدی نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

یہ تو اتوار کا دن تھا اور ڈائننگ ٹیبل پر سب ہی موجود تھے۔

"دوستوں کے ساتھ کچھ دن کے لیے مری جا رہا ہوں۔" تقی نے جواب دیا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ تقی! آخر تمہاری یہ عیاشیاں کب ختم ہوں گی؟" بنا الٹی میٹم دیے ابا شروع ہو گئے۔

اس کے نکمے پن کے ایک تازہ ترین قصے کے ساتھ پچھلے کئی قصے دہرائے گئے۔ اس کے دوستوں کو بھی بیچ میں گھسیٹا گیا۔ اسے ناکارہ اور ہڈ حرام کہا گیا جو اب تک باپ بھائی کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔

تقی کا چہرہ احساس توہین سے سرخ ہو گیا۔

"میری پڑھائی مکمل ہونے دیں۔۔۔ کر لوں گا نوکری۔"

"وہ تو کبھی ختم ہو گی ہی نہیں۔ ظاہر ہے بنا ہاتھ پیر

ہلائے روٹی مل جاتی ہو تو نوکری کی کیا ضرورت ہے۔" ابا نے ترخ کر کہا۔

تقی نے غصے سے ہاتھ مار کر پلیٹ پرے کھسکا دی۔

"یہ لیں! انہیں کھاتا آپ کی روٹی۔" وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ امی کچھ چڑ کر اور کچھ گھبرا کر آوازیں دینے لگیں۔

"مت بلاؤ اسے۔۔۔ ان ہی چونچلوں نے اس کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچایا ہوا ہے۔" اس نے ابا کو کہتے سنا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے اپنی دو، تین چیزیں سمیٹیں اور کمرے سے باہر آ گیا۔

"تقی! اب ناراض ہو کر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں آ کر چپ چاپ ناشتا کرو۔" امی نے سختی سے کہا۔ وہ جانتی تھیں، ناشتا اس کی کمزوری تھا۔ باقی چاہے سارا دن بھوکا رہ لے۔ لیکن ناشتا اسے بہترین چاہیے ہوتا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" ہاتھ میں پکڑی شرٹ بیگ میں ٹھونستے ہوئے اس نے کہا۔

"تقی! ضد مت کرو۔۔۔ چلو! شاباش۔ بیٹھ کر ناشتا کرو۔" رضی نے پیار سے کہا۔

"ضد نہیں کر رہا بھائی! لیکن اب واقعی بھوک نہیں ہے، ابا کو کھلا دیں۔"

"کس قدر بدتمیز ہو رہے ہو تم۔ ایسا بھی آخر کیا کہہ دیا انہوں نے۔" امی نے فوراً ابا کی حمایت کرتے ہوئے اسے جھڑکا۔

"آپ نے نہیں سنا، جو انہوں نے کہا؟" اس نے جوگر کستے ہوئے کہا۔ "یا آپ کو صرف میری باتیں سنائی دیتی ہیں، جو اتفاق سے ہمیشہ ہی قابل اعتراض ہوتی ہیں؟"

"تمہاری یہی باتیں انہیں غصہ دلاتی ہیں۔" امی نے جھنجلا گئیں۔

"نہیں تو میری ہر بات ہی غصہ دلاتی ہے۔ کوئی نئی بات کریں۔" وہ جارحانہ انداز میں تسمے باندھنے لگا۔

"میں جا رہا ہوں۔ دعا کریں وہاں کسی کھائی میں گر جاؤں اور واپس ہی نہ آؤں۔ لودھی صاحب کو میری شکل نظر آئے گی۔ نہ ان کا سکون برباد ہو گا۔"

"کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔" امی بری طرح دہل گئیں۔

"الٹی سیدھی نہیں ہانک رہا، بڑے دل سے دعا کر رہا ہوں۔ لیکن واپس آ بھی گیا تو آ کر اپنا کوئی بندوبست کر لوں گا۔ لودھی صاحب کو دوبارہ زحمت نہیں دوں گا۔" آج وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

"خدارا! آہستہ بولو۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ تمہارے منہ سے لودھی صاحب سن لیا تو اور غصہ کریں گے۔ تمہیں تو شاید تمیز نے چھو کر گزرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ کتنی مرتبہ سمجھا چکی ہوں، ابا کہا کرو۔ باپ ہیں وہ تمہارے۔ کوئی دوست نہیں ہیں کہ لودھی صاحب کہہ کر پکارو۔"

"جی ہاں! ابا ہیں وہ میرے۔۔۔ بدقسمتی سے۔۔۔ اللہ ایسے جلاد صفت ابا ہمارے سارے دشمنوں کو ایک ایک دے، آمین۔"

اس نے بیگ اٹھایا اور تیر کی طرح باہر نکل گیا۔

امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"دیکھ رہے ہو رضی! یہ دن بدن کس قدر بدتمیز ہوتا جا رہا ہے؟"

"کم سے کم گھر سے نکلتے ہوئے تو اس کا موڈ خراب نہ کیا کریں امی!" رضی نے بےزاری سے کہا۔ "ابو کو بھی پتا نہیں تقی سے کیا چڑ ہے۔ ہر وقت دل جلانے والی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ سارا زمانہ ہی تعلیم مکمل کر کے ملازمت کرتا ہے، تقی بھی کر لے گا۔ آخر اس میں اتنے اعتراض کی کیا بات ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ابا کی باتیں اسے زیادہ ہٹ دھرم بنا رہی ہیں۔"

"اور وہ اسٹور والا قصہ؟"

"ہاں! اس میں بہرحال تقی کی غلطی ہے۔ لیکن اسے طریقے سے بھی سمجھایا جا سکتا تھا۔ اس کے واپس آنے کا انتظار کر لیتے۔ کم سے کم صبح صبح اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تم تو ہمیشہ تقی کی سائیڈ لیا کرو۔ ان ہی باتوں نے اسے بگاڑا ہوا ہے۔"

"غلط بات نہیں کریں امی! میں تقی کے سامنے چاہے وہ حق پر ہی کیوں نہ ہو، کبھی اس کی سائیڈ نہیں لیتا کہ اسے اور شہہ ملے گی۔ البتہ آپ ہمیشہ ابا کی طرف داری کرتی ہیں، چاہے وہ سامنے ہوں یا نہ ہوں۔ آخر ہم سب مل کر صرف تقی کو ہی کیوں باور کروانا چاہتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہے؟ کوئی ابا کو ان کی غلطی کیوں نہیں بتاتا؟"

"بس اسی کی کسر رہ گئی تھی کہ تم بھی مجھے ہی الزام دو۔ ایک وہ ہیں، جنہیں یہی لگتا ہے تقی کو میں نے بگاڑا ہے اور تمہیں لگ رہا ہے۔ تمہارے ابا کو میں نے بگاڑا ہے۔ مجھے ہی دیوار سے سر پھوڑ لینا چاہیے۔"

وہ سلگ کر بولیں، مگر رضی کو ہنسی آ گئی۔ انہوں نے بات ہی ایسی کی تھی۔

☼ ☼ ☼
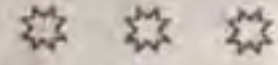
اس کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔

ساہر نے عمیر سے فرمائش کی تھی کہ وہ عمیر کے ساتھ پورا دن گزارنا چاہتی ہے۔ لنچ اور ڈنر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں ان کے ساتھ کرنا چاہتی ہے۔ واپسی پر آپ مجھے شاپنگ کروایے گا، پھر ہم گھر واپس آ جائیں گے۔

وہ کئی روز سے سارا پروگرام ترتیب دے رہی تھی۔ عمیر کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ شفا کی بھی اس روز چھٹی تھی۔

"وہ بے چاری گھر پر اکیلی کیا کرے گی؟ شاپنگ تو میں تمہیں کسی روز کروا دوں گا۔ بلکہ آج رات کو ہی میرے ساتھ چل کر اپنی پسند کا گفٹ لے لینا، لیکن ڈنر یا لنچ کا پلان تمہیں ڈراپ کرنا پڑے گا۔ گھر میں ہی کچھ اچھا سا بنا لینا یا اگر موڈ نہیں تو میں ٹیک اوے کروا لوں گا۔"

"اتنا تکلف کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ جب گھر میں بیٹھ کر ہی کھانا ہے تو میں بنا بھی لیتی ہوں۔" اس نے سرد مہری سے کہا اور ناراضی سے باہر نکل گئی۔

عمیر نے اسے آواز بھی دی۔ مگر اس کا موڈ بری طرح خراب ہو چکا تھا۔ شادی کے تین سال گزر جانے کے باوجود شفا کی حیثیت ساہر سے زیادہ مستحکم تھی۔ عمیر کے لیے وہ ساہر سے زیادہ اہم تھی۔

کہیں نہ کہیں سے وہ ان دونوں کے درمیان آ ہی جاتی تھی اور نظر انداز کرنے کے باوجود ساہر کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ گو کہ ان تین سالوں میں ان دونوں کے تعلقات میں بہت بہتری بھی آئی تھی۔ لیکن کبھی کبھار شفا اسے اتنا زچ کر دیتی تھی کہ ساہر کا دل چاہتا اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دے۔ لیکن چونکہ حسرت ان غنچوں پہ۔۔۔ اس لیے وہ دل مسوس کر رہ جاتی اور امی کی نصیحتوں کو یاد کر کے شفا کی حرکتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔

وہ کچن میں آ کر برتن پٹخ پٹخ کر اپنی بھڑاس نکال رہی تھی کہ شفا، ہدیہ کو گود میں اٹھائے کچن میں آ گئی۔

"کیا کر رہی ہیں بھابھی؟"

"کچھ نہیں کر رہی۔ آپ حکم فرمایے، کیا کروں۔" ساہر کا دل جلا ہوا تھا۔ اس نے سرد مہری سے کہا۔ کڑھنے اور برداشت کرنے کے باوجود کبھی کبھار اس کی شفا سے بحث ہونے لگی تھی۔ کیونکہ شفا کی بدتمیزیوں کے جواب میں اب وہ خاموش رہنے کے بجائے منہ توڑ جواب دے کر اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی۔

"حکم کیا کرنا ہے، بس میرا پاستا کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔ وہ بنا دیں مہربانی ہو گی۔" شفا نے بھی حسب عادت پتھر پھوڑے تھے۔

"لنچ میں آج پاستا ہونا چاہیے۔" اس نے آرڈر جاری کیا اور الٹے قدموں باہر نکل گئی۔

ساہر، عمیر کے رویے سے جلی بیٹھی تھی۔ شفا کی بات پر جل کر بالکل ہی بھسم ہو گئی۔

اس کے بعد اس نے خوب دل لگا کر لنچ تیار کیا۔ ہر وہ چیز بنائی جو اسے اور عمیر کو پسند تھی۔ لیکن کوئی بھی ایسی چیز بنانے سے گریز برتا، جو شفا کو پسند ہو سکتی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر شفا نے سارے ٹیبل کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"پاستا کہاں ہے؟"

"میں بہت تھک گئی تھی۔ پاستا نہیں بنایا۔" ساہر نے اپنی پلیٹ میں بریانی نکالتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"میرے لیے تو کچھ بھی بناتے ہوئے آپ ہمیشہ ہی تھک جاتی ہیں۔" شفا نے فوراً "جتایا۔

"ہاں! آج سے پہلے تو تمہارے لیے میں نے کچھ بنایا ہی نہیں۔ تمہارے لیے تو ہر روز کھانا باہر سے ہی آتا ہے۔" ساہر نے بھی جتانے میں ایک منٹ نہیں لگایا تھا۔

"پاستا نہیں بنانا تھا تو آپ پہلے ہی انکار کر دیتیں۔" شفا نے دوبدو کہا۔

"میں نے کہا نا' میں تھک گئی تھی' ورنہ ضرور بنا دیتی۔"

ساہر نے اس کی تلملاہٹ کے جواب میں سکون سے جواب دیا۔

"جی ہاں! جیسے میں آپ کو جانتی نہیں۔"

"شفا!" عمیر نے مداخلت کی۔ "ٹیبل پر اتنا کچھ موجود ہے' تم اس میں سے کچھ کھالو۔"

"بھائی! آپ کو پتا ہے میں ان میں سے کچھ نہیں کھاتی۔ آج مجھے پاستا ہی چاہیے تھا۔"

"ساہر نے لنچ میں اتنی ورائٹی رکھی ہے۔ تمہیں کچھ تو ضرور پسند آئے گا۔ چکھ کر تو دیکھو! ساہر رات میں پاستا بنا دے گی۔" عمیر نے مفاہمت بھرے انداز میں کہا۔ لیکن ساہر اس روز کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ اس نے ترنت انکار کر دیا۔

"میں تھک گئی ہوں۔ رات میں بھی نہیں بناؤں گی۔"

"اب کیا کہیں گے بھائی؟" شفا کو جیسے موقع چاہیے تھا۔ اس نے فوراً "جتا دیا۔ عمیر بری طرح بھڑک اٹھے۔

"شفا! خاموشی سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" انہوں نے غضب ناک ہو کر کہا۔

"مجھے نہیں کھانا۔" شفا کرسی کھسکا کر اٹھنے لگی۔

عمیر نے گلاس زور سے ٹیبل پر پٹخ دیا۔

"بدتمیزی مت کرو اور چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ اب جو اپنی جگہ سے ہلو گی تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" عمیر کی آواز بلند اور غضب ناک تھی۔ شفا تو شفا' ساہر بھی سہم گئی۔ لیکن دل ہی دل میں اسے بڑی ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ صبح سے دماغ میں جو آگ سلگ رہی تھی۔ اس پر عمیر کے ہی ہاتھوں ٹھنڈا یخ پانی انڈیلا گیا تھا۔ سکون سا آگیا۔

"تمہاری پسند کی چیز نہیں بنی تو کون سی قیامت آگئی؟ ایک دن اپنی پسند کے بغیر کھانا کھالو گی تو مر تو نہیں جاؤ گی؟ ہر چیز میں ضد' ہر بات میں بحث۔ ساہر بھابی ہے تم سے۔ کبھی تمیز سے بھی پیش آیا کرو۔ زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے میری تم دونوں نے۔ کھانا بھی سکون سے کھانا نصیب نہیں ہوتا۔"

عمیر نے غصے سے پلیٹ پرے دھکیلی اور اٹھ کر گھر سے ہی باہر نکل گئے۔ وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔ عمیر کو غصہ آجاتا تھا۔ لیکن ایسا رویہ پہلی بار سامنے آیا تھا۔

"ہو گئی آپ کی تسلی۔۔۔؟ پڑوالی مجھے ڈانٹ۔ بھائی کھانا کھا کر بھی نہیں گئے۔ کیسی بے حس ہیں آپ۔" شفا نے ملامتی انداز میں کہا۔

"تمہیں اتنی پروا تھی تو چپ چاپ کھا لیتیں۔ کیا ضرورت تھی بھائی کو غصہ دلانے کی؟" ساہر کے سرد مہر انداز نے اسے اور سلگا دیا۔

"آپ اچھا نہیں کر رہیں بھابھی! آپ کی وجہ سے بھائی نے مجھے اتنی زور سے ڈانٹا ہے۔"

"کون اچھا کر رہا ہے' کون نہیں۔ اس کا فیصلہ تم رہنے دو۔"

شفا دھپ دھپ کرتی چلی گئی۔ ساہر پہلے تو ڈھیٹ بنی کھاتی رہی' پھر برتن سمیٹنے لگی۔ اسے عمیر کی فکر ہو رہی تھی۔ اس روز اتنا کھانا بننے کے باوجود کسی نے بھی نہیں کھایا۔

عمیر کا انتظار کرتے کرتے اسے ملال نے گھیر لیا۔

"آخر کیا ہو جاتا' اگر وہ آج بھی نظر انداز کر دیتی۔ اگر اس بار بھی عمیر اس کی خواہش شفا کی وجہ سے رد کر رہے تھے تو کون سی نئی بات تھی۔ امی ٹھیک ہی کہتی تھیں عورت کو تو کتنا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔۔۔ میں نے عمیر کو کیوں خفا کر دیا۔ وہ بھی آج کے دن۔۔۔ اور شفا۔ مجھے پاستا بنا دینا چاہیے تھا۔۔۔" وہ دیر تک سوچتی رہی۔

شام تک عمیر کی واپسی ہوئی۔

اسے اتفاق کہا جائے یا بدقسمتی' لیکن جس وقت انہوں نے ڈور بیل بجائی شفا اور ساہر دونوں ہی ٹیرس پر تھیں۔ شفا نے پہلے دوڑ لگائی۔ وہ اتنی عجلت میں بھاگی تھی کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پہلی سیڑھی سے لڑھکتی صحن میں جا گری۔

ساہر حواس باختہ نیچے آئی۔ اس نے پہلے دروازہ کھولا۔ پھر آکر شفا کو اٹھایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پر بری طرح خراشیں آئی تھیں اور سیڑھیوں پر رکھا گملا ٹوٹنے سے اس کی پنڈلی سے بری طرح خون بہنے لگا تھا۔

"کیا ہوا ہے شفا!" عمیر بھی بھاگے چلے آئے۔

"سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔" ساہر نے اسے اٹھاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

شفا نے روتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"بھابھی جھوٹ بول رہی ہیں عمیر بھائی! انہوں نے مجھے سیڑھیوں سے دھکا دیا ہے۔"

ساہر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو شفا؟"

"انہوں نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ایسا کیا ہے۔ دوپہر میں بھی آپ کے جانے کے بعد مجھے ڈانٹ رہی تھیں کہ آپ میری وجہ سے بھوکے پیٹ چلے گئے۔ اب میں گیٹ کھولنے آرہی تھی کہ انہوں نے مجھے دھکا دے دیا۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اس سے قبل کہ ساہر اپنی صفائی میں کچھ کہتی' عمیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' ایک زوردار تھپڑ اس کے دائیں گال پر رسید کر دیا' دوسرا تھپڑ بائیں گال پر لگا۔

"میرے سامنے میری بہن کو تکلیف پہنچا رہی ہو' میری غیر موجودگی میں تم کیا کرتی ہو گی۔" عمیر نے نفرت سے کہا۔ پھر شفا کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ساہر وہیں کسی پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑی رہی' اس کا چہرہ احساس توہین سے سرخ ہو رہا تھا۔

عمیر وہ انسان تھے جن کے لیے اس نے اپنے اتنے محبت کرنے والے تایا ابا کو چھوڑا تھا۔ عمیر وہ انسان تھے جن کے لیے وہ دنیا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ عمیر وہ انسان تھے جن کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی اور عمیر ہی وہ انسان تھے جنہوں نے اپنی بہن کے جھوٹ پر اعتبار کرتے ہوئے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

ساہر کو اپنی عزت نفس ٹوٹ کر بکھرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور پہلی بار ہی اسے شفا سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحین اظفر

من کی آنکھیں

ماموں کے ہوٹل پر رش معمول سے کہیں کم تھا اور مرچیں بریانی میں روزانہ سے زیادہ۔ میں نے ڈبل بریانی آرڈر کی تھی مگر اس وقت ایک پلیٹ بھی ختم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

میں سی سی کرتا پانی کے گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔ جب ہی قریب سے کسی نے زوردار سلام جھاڑا اور ساتھ ہی میرے کندھے پر دھمو کا جڑا۔

"اور جگر! کیا چل رہا ہے؟"

میں پانی پی رہا تھا۔ اس بدتمیزی پر کھول کر رہ گیا۔ جی تو چاہا تھا آنے والے کو دو چار سنا دوں۔ مگر آنے والی کی شکل دیکھ کر تمام گالیاں حلق سے واپس اتار لیں۔ وہ میرا پرانا محلے دار اور پڑوسی امجد تھا۔

"آؤ... آؤ امجد۔" میں نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔

"دو پلیٹیں رکھی ہیں۔ کوئی آنے والا ہے کیا۔"

"نہیں منگوائی تو اپنے لیے تھی۔ مگر اب تو آ گیا ہے تو، تو کھا لے۔" میں نے کمال فراخ دلی دکھائی۔ اس کی وجہ میرا کھلا دل نہیں۔ بلکہ بریانی میں جھونکی جانے والی کھلی مرچیں تھیں۔

"کیا بات ہے جگر! آج حاتم طائی کو کیسے شرمندہ کر دیا؟"

"یہ کیا بات کر دی تو نے تُو تو اپنا یار ہے۔ یہ بریانی تجھ سے بڑھ کر تھوڑا ہی ہے۔" میں نے باچھوں کو اور دائیں بائیں پھیلا لیا۔

"اچھا یہ بات ہے۔" اس نے ندیدے پن سے پلیٹ آگے کھسکائی۔

"چل تو پھر ایک گلاس لسی بھی پلا دے۔"

میرے کانوں تک چڑے ہونٹ واپس اپنی جگہ پر آ گئے۔ سخت بدمزا ہو کر میں نے میلے کپڑوں میں ملبوس لمبے قد کے بانس نما چھوٹے کو آواز دی۔

امجد سے میری دوستی بہت پرانی نہیں تھی۔ مگر بدقسمتی سے میں اس جیسے چالاک اور عیار شخص کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس نے مجھے شگفتہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا بس.... اسی روز سے اس کی کمینگی کا آغاز ہو گیا۔

اسے دونوں چیزیں معدے میں اتارنے کے بعد کچھ یاد آیا۔ "ارے ہاں.... ایک میسج ہے تیرے لیے۔"

"اچھا.... کیا۔" میرے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔

"وہ انجی، شیگی ہے ناں۔"

"اس کا نام شگفتہ ہے اور وہ انجی نہیں صرف میری ہے۔" میں نے دانت کچکچائے۔

"اوئے! اس نے خود ہی اپنا یہ نام رکھا ہے گوری میموں والا۔ پورے محلے میں سب سے چٹی ہے ناں۔ اس لیے۔"

اس نے معنی خیزی سے ایک آنکھ دبائی۔ میرا جی چاہا لسی سے بھرا گلاس اس کے منہ پر الٹ دوں۔ جس میں سے میں نے اب تک ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا۔

"کام کی بات کر بکواس نہ کر۔"

"ارے! کام کی بات سے یاد آیا۔ دو تین سو روپے تو ہوں گے تیرے پاس۔"

میں جو دھیان سے سننے کے لیے اس کی طرف جھک کر اس کی گدلی سرمئی آنکھوں اور پان کھائے ہوئے دانتوں کے قریب ہو گیا تھا۔ تپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"دے دے یار! دیکھ صرف تیرے کام کے لیے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ پہلے تیرے گھر گیا پھر یہاں...."

اس کی نئی رام کہانی شروع ہونے سے پہلے میں نے پانچ سو کا نوٹ میز پر دھر دیا اس کے مکروہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس شہزادے! تیری یہی بات تو میرے دل...."

"تو یہ بتا شگفتہ کیا کہہ رہی تھی۔"

"وہ تو مجھے نہیں پتا بس چھت پر بلا رہی تھی۔"

اس نے شان بے نیازی سے نوٹ اٹھا لیا۔

"اور تو اب بتا رہا ہے....!"

گالی حذف کر کے میں عجلت میں کھڑا ہو گیا اور بجائے چھوٹے کا انتظار کرنے کے خود ہی کاؤنٹر کی

طرف لپک گیا۔

☼ ☼ ☼

میری اور شگفتہ کی سیدھی سادی لو اسٹوری تھی۔ میرے اور شگفتہ کے گھر کے درمیان ایک گھر تھا۔ گھر کی چھت ہم دونوں کے گھروں کی چھتوں سے اس طرح ملی ہوئی تھی کہ با آسانی ایک دوسرے کی چھت تک کا سفر طے کیا جا سکتا تھا۔

یہ تھوڑا نچلے درجے کا محلہ تھا۔ گھروں کے حالات ان کے ملتے جلتے نقشوں جیسے ہی تھے۔ بچپن ان ہی گلیوں میں کھیلتے کودتے، لڑکپن کی اٹکھیلیاں کرتے گزرا تھا۔

سالوں پہلے بچپن کے زمانے میں جب محلے بھر کی لائٹ جاتی تو گھروں کے آگے بنے پکے سیمنٹ کے چبوترے اسے چاندنی ہو یا اماوس، آباد ہی رہتے۔

یہ وہ وقت تھا۔ جب گرما، پت جھڑ اور بہار کی ٹھنڈی ہواؤں اور کبھی حبس والی راتیں، وقت بے وقت اچانک چلی جانے والی اور سرپرائز دے کر اچانک ہی واپس آجانے والی بجلی کے انتظار میں گھر سے باہر ہی گزرتی تھیں۔ جنریٹر کا صرف نام سن رکھا تھا اور یوپی ایس تو شاید ایجاد تک نہ ہوا تھا۔

پرانا دور تھا۔ مگر کیا خوب تھا۔

محلے داریاں تھے گویا ایک خاندان کے لوگ، اور چوڑی گلی ایسی تھی جیسے گھر کا آنگن۔ اسی اسی گز کے آگے بنی پتلی اور قدرے چوڑی گیلریوں میں لگے آم، امرود اور شریفے کے درخت بلاشبہ آدھی گلی کو گھیر کر سایہ کیے رکھتے اور کبھی کبھی تو پوری پوری رات ہی ان چند اینٹوں کے پکے چبوتروں پر ٹانگیں پھیلائے خوش گپیاں کرتے گزرتی۔

چھوٹے بچوں کی مائیں، بچوں کو وہیں آڑھا ترچھا سلا دیتیں اور جو تھوڑے سمجھ دار ہوتے وہ اس وقت تک کھیلتے رہتے جب تک تھکن اور نیند سے بے دم نہ ہو جاتے یا بالآخر لائٹ ہی آجاتی۔

اس وقت تو چھوٹے بڑے سارے بچے لڑکا، لڑکی کی تمیز کے بغیر مل جل کر کھیلا کرتے۔ ان ہی بچپن سے لڑکپن کی طرف سفر کرتے دنوں میں شگفتہ کے گھر والے اپنا گھر کرائے پر دے کر کسی بہتر علاقے میں اک قدرے بڑے گھر میں کرائے پر چلے گئے۔

شگفتہ کے ابا کا اچانک ہی ملک سے باہر جانے کا چانس بن گیا اور ان کے دن پھر گئے۔ بعد میں انہوں نے وہ گھر بھی خرید لیا۔ اب تقریباً" دو سال پہلے وہ لوگ واپس پرانے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس کے ابا پاکستان واپس آچکے تھے۔ اب ان کا مستقل کمائی کا ذریعہ وہی گھر اور ایک آدھ دکان تھی جو انہوں نے باہر رہ کر بنالی تھی۔

شگفتہ اور اس کی ایک بڑی بہن بس دو ہی بچے تھے ان کے۔ بڑی بہن کی شادی کراچی سے باہر کہیں ہوئی تھی۔

جب وہ لوگ ہمارے محلے میں دوبارہ شفٹ ہوئے تو گو کہ پہلے والا ملنا ملانا نہیں تھا مگر چونکہ وہ لوگ خود یہاں آکر بہت خوش تھے۔ اس لیے ماضی میں تقریباً" وہ سارے گھر جن سے ان کے تعلقات تھے۔ ان سے ملنے ملانے گئے۔ ان ہی گھروں میں سے ایک گھر ہمارا بھی تھا۔

جس دن میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما تھی۔ میں صحیح معنوں میں اس کے الہڑ انداز اور گوری بے داغ رنگت پر سے نظر ہٹانا بھول گیا۔

اس نے ایسا رنگ روپ نکالا تھا اور ایسی اٹھان پائی تھی کہ اچھے اچھوں کی توبہ میں شکنیں پڑ جائیں۔

میں نے پہلی نگاہ اس پر ڈالتے ہی اپنا دل تو ہارا مگر اس کا دل بھی جیت لیا اور ہماری لو اسٹوری کامیابی سے چل پڑی۔

مگر اس کامیابی میں سب سے پہلا ولن وہی درمیان والا گھر بنا، جو بدقسمتی سے امجد کا تھا۔

امجد کے ابا لاہور میں ٹریول ایجنٹ کا کام کرتے تھے اور وہ یہی کام یہاں کراچی میں کرتا تھا۔ لاہور میں اس کا گھرانہ کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ کراچی میں ہمارے پڑوس والا گھر بھی اس کا اپنا تھا۔

اسی لیے جون کی ایک بے حد تپتی ہوئی دوپہر میں جب پورا محلہ اپنے ٹھنڈے کمروں میں پنکھے کے نیچے پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس کم بخت نے ہمیں اپنی ہی چھت کے ٹین والے چھجے تلے بچھے جھلنگا پلنگ پر رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

بس پھر کیا تھا۔ اس نے تو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔

شگفتہ کا تو پتا نہیں۔ البتہ میں اس صورت حال سے بری طرح تنگ آچکا تھا۔

اللہ جانے شگفتہ کے ساتھ اس کا رویہ کیسا تھا۔ اس نے کبھی کھل کر مجھ سے شکایت تو نہیں کی مگر میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ وقتاً" فوقتاً" وہ مجھ سے بٹورتا ہی رہتا تھا۔

اور یہ کھیل اس وقت تک چلنا تھا جب تک ہماری پریم کہانی کو کوئی خوب صورت انجام کسی اعلانیہ حتمی رشتے کی صورت نہ مل جاتا۔

مگر..... وقت کے ساتھ ساتھ بجائے بہتری آنے کے صورت حال گمبھیر اور کشیدہ ہوتی گئی۔ ہماری سیدھی سادی محبت کہانی میں یکایک ہی تین ولن ابھر آئے۔

ایک تو امجد تھا... جو ہر وقت ہمارے ملن کی گھڑیوں کی تاک میں رہتا۔ اور عین وقت پر انٹری دے کر ہر چیز کا بیڑہ غرق کر دیتا۔

دوسرے نکلے شگفتہ کے ابا... جنہوں نے اچانک ہی شگفتہ کی جلد از جلد شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔

"سیدھا سیدھا رات کو سویا تیرا ابا۔ صبح اٹھ کر تیری شادی کی فکر طاری ہو گئی۔" میں نے سنتے ہی شگفتہ سے کہا۔

"ابا نے کہا ہے کہ وہ ایسے لڑکے سے میری شادی کریں گے جو یا تو ملک سے باہر ہو یا سرکاری نوکری کرتا ہو پکی والی۔"

میرے پاس تو دونوں ہی سہولیات کا فقدان تھا۔

تیسری اور سب سے خطرناک ولن کے روپ میں سامنے آئیں میری اماں...

"کیا... وہ اصغر کی لڑکی؟"

"جی اماں! آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔"

"یقین تو آرہا ہے پر تیری بات پر نہیں۔"

"تو پھر؟" میں نے ہونقوں کی طرح ان کی شکل دیکھی۔

"تیرا دماغ چلنے پر۔"

میں تپ گیا۔

"ایک بات تو بتا۔ پورے محلے اور خاندان بھر کی چھوکریاں چھوڑ کر تجھے شگو نگوڑی ہی ملی تھی؟"

"شگو... نگوڑی...؟" اماں کے رکھے نک نیم ذرا اور ہی ہوتے تھے۔ مزاج پر بھاری اور طبیعت پر گراں۔

"تو بہت بھولا ہے میرے بچے۔"

اماں کے دل میں جانے کیا خیال آیا، ہاتھ میں پکڑا سروتا اور چھالیہ اپنے قدیم خاندانی پان دان میں ڈال کر کھٹاک سے اس کا بھاری ڈھکن گرایا۔ پھر اسے ایک طرف کر کے میری طرف جھک کر پیار سے کہا۔

"اچھا تو مجھے چلتر بننے کا ہی کوئی طریقہ بتا دیں۔" میں تپ کر بولا۔

"ذرا سن تو!" اماں نے میری بات کو مخول سمجھ کر کچھ دیر اپنے پوپلے منہ سے ہنسی اڑائی۔

"یہ جو اپنی شگفتہ ہے ناں۔ ایک نمبر کی چلتی پرزہ ہے۔"

اپنی ہونے والی بہو کے بارے میں اماں کے خیالات مجھے ذرا نہ بھائے۔

"آپ کو کیسے پتا اماں! کسی کی بیٹی کے بارے میں..." میری بات ادھوری رہ گئی۔

"اے ہٹ یہاں سے۔ کچھ پتا بھی ہے تجھے۔ یہ اپنے پڑوس والے امجد سے چکر چل رہا ہے اس کا۔"

"ہیں؟" میں ہکا بکا ہو گیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ وہ سلمٰی بتا رہی تھی۔ بھری دوپہر میں اکیلے اس چھڑے چھانٹ کی چھت پر کودتے دیکھا اس نے اپنی آنکھوں سے۔ ہائے میرے اللہ توبہ..."

اماں توبہ تلا کر رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا سلمٰی کی گچی مروڑوں یا شگفتہ ہی کو جا کر دو تھپڑ لگا آؤں۔ جسے میں نے ہزار بار منع کیا تھا امجد کی چھت پھلانگنے سے جب میں خود ہی اس تک چلا جاتا تھا تو اس کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ۔۔۔۔

"اف!!!" میرا بس نہ چلا تو اپنے ہی بال نوچ ڈالے۔

بے ضرر سی دو چار ملاقاتیں کیا رنگ دکھا رہی تھیں۔

جب بھی میں شگفتہ سے ملنے چھت پر جاتا۔ امجد خبیث کسی بوتل کے جن کی طرح آدھمکتا اور پھر ان ضدی اور ہٹ دھرم بچوں کی طرح جن کی جتنی بھی تربیت کی جائے۔ انہیں ہمیشہ بڑوں کے درمیان بیٹھ کر ہی کھیلنا ہوتا ہے' میرے اور شگفتہ کے آس پاس ٹہلتا رہتا۔

"اس بے شرم کو دیکھو۔ کباب میں ہڈی بنا گھوم رہا ہے۔ اور ذرا تمیز نہیں۔" کبھی کبھی بے حد چڑ کر میں کہنے پر مجبور ہو جاتا۔

"چھوڑو ناں ہمارا کیا لیتا ہے۔ تم اپنی سناؤ۔ میں نے بتایا تھا انارکلی میں سیل لگی ہے۔"

"یار! میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میں تو لنچ ٹائم میں بمشکل بھاگم بھاگ تم سے ملنے گھر آتا ہوں۔"

"تو پھر۔۔۔۔" شگفتہ کا چہرہ اتر جاتا۔

"تم ایسا کرو۔ یہ رکھ لو۔ تم خود جا کر اپنی پسند سے ۔۔۔۔"

میں نے ہمیشہ اس کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے سے احتیاط برتی کہ کوئی ہمیں باہر ایک ساتھ نہ دیکھ لے۔ ہمیشہ کی طرح مجھے والٹ نکالتا دیکھ کر شگفتہ کا منہ اتر گیا اور امجد کا منہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً" نزدیک آیا جبکہ شگفتہ کہہ رہی تھی۔

"یہ پیسے کیوں دیتے رہتے ہو ہر وقت۔ یہ کوئی تمہارا نعم البدل تو نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے تم میرے ساتھ وقت بتانے کی قیمت چکاتے ہو۔"

"شگفتہ!" میں غصے میں لال پیلا ہو گیا۔ "آئندہ یہ بات منہ سے نکالی تو اچھا نہیں ہو گا۔ یہ میری ۔۔۔ ہے۔ میری خوشی سمجھ کر رکھ لیا کرو۔"

میں اکثر ہی اس کی مٹھی میں کبھی لال' کبھی ۔۔۔ اور کبھی ایک آدھ نیلا نوٹ دبا ہی دیتا۔ محبت کے اظہار کا کوئی انوکھا اور اچھوتا طریقہ نہ مجھے آتا تھا نہ میرے پاس وقت ہوتا تھا۔

"کیا بات ہے سوہنیو! کبھی ہماری بھی مٹھی گرم کر دیا کرو۔ ہم بھی تمہارے سجن ہی ہیں۔ دشمن تو نہیں۔"

اس کا اپنا ہی تپانے والا مخصوص انداز تھا۔ جو مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ شگفتہ اس ۔۔۔ کو جواب دینے کے بجائے یہاں وہاں دیکھنے لگی۔

"تو میرا چاچا لگتا ہے؟"

"او یار! میں تو رکھوالی کے لیے آجاتا ہوں۔ کوئی ادھر ادھر سے تم لوگوں کو تاڑ تو نہیں رہا۔"

میں تپ کر اس کے ہاتھ پر بھی کچھ نہ کچھ رکھ ہی دیتا۔

اللہ کے فضل سے میں محلے کا سب سے خوبرو اور پڑھا لکھا جوان تھا اور کچھ ٹور بنانے کا شوق بھی مگر اس سب کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ شگفتہ کے اور میرے حوالے سے کبھی انگلیاں اٹھیں۔ جب ہی میں اسے امجد کی چھت تک آنے سے منع ہی کرتا تھا۔ اور ایک دن وقت نے ثابت کیا کہ اس کی طرف سے برتی جانے والی یہ احتیاط بھی فائدہ مند رہی۔

ایک دن منڈیر سے لٹکا امجد چونک کر پیچھے ہوا اور شگفتہ سے بولا۔

"اے شگو! تیرا ابا گھر پہ نہیں تھا کیا۔"

"نہیں؟" شگفتہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔

"میں نے ابھی ابھی اسے باہر سے گھر میں گھستے دیکھا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔" وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"اب کیا کروں۔ ہائے اللہ ظفر! وہ تو پورے گھر میں مجھے ڈھونڈ ڈھانڈ کے چھت پر آتے ہی ہوں گے۔"

"چل تو ایسا کر میرے گھر سے باہر نکل۔ کہہ دینا کسی سہیلی کے یہاں سے آئی ہوں۔" اس نے فانٹ حل پیش کیا۔ میں منہ کھولے پاگلوں کی طرح انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اب تو بھی نکل شہزادے! سڑی دھوپ میں کیا حسن برباد کرنا ہے اپنا۔" میں سخت بدمزا ہو کر اٹھا۔

"اور شکر کر۔ تیرے یار نے پہرہ دینے کی ڈیوٹی سنبھالی ہوئی ہے۔ ورنہ آج تو ادھر ہی دھر لیتا اس کا ابا تجھے۔ چل اب نکل جلدی۔"

اس نے فراٹے بھرتی زبان کے ساتھ مجھے منڈیر کی طرف دھکیلا۔ شگفتہ پہلے ہی نیچے جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اتوار کا دن تھا۔

اماں ثوبیہ کے لیے بنوائے گئے عنابی مخملیں لحاف گدے اور نئی نکور رضائیوں کو دھوپ لگوا رہی تھیں۔ اماں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اتنا جمع کر لیا تھا کہ نہ صرف ثوبی کے جہیز بلکہ شادی میں قیام کے ارادے سے آنے والے مہمانوں کے لیے بھی اچھا انتظام ہو گیا تھا۔

قریبی تخت پر اماں اپنے پان دان میں سے ایک مخملیں پوٹلی نکال کر جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ میں اماں کے پاس ہی لیٹا سستی سے سوچ رہا تھا کہ شگفتہ سے ملے کتنے دن ہو گئے تھے۔ میری ہر سوچ شگفتہ سے شروع ہو کر شگفتہ پر ختم ہوتی تھی۔ اسی وقت اماں نے میرا کندھا ہلا کر ایک خوب صورت سا کنگن میری طرف بڑھایا۔

"دیکھ تو ذرا۔ کیسا ہے؟"

"بہت خوب صورت ہے اماں!"

اس کی چمک اور ڈیزائن نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں اپنی سوچوں سے نکل کر اسے سراہنے اور بغور دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"کیسا ہے۔ تیری ہونے والی دلہن کے لیے لیا ہے۔"

میں نے تصور میں شگفتہ کو کلائی میں کنگن ڈالتے دیکھا۔

"اس کی چٹی کلائی میں لگے گا بھی بہت پیارا۔"

"ہوں۔" میں بے دھیانی میں بولا پھر چونکا۔

"کس کی کلائی میں؟"

"تیری دلہن کی اور کس کی۔"

"آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے میری دلہن پسند ہی کر لی۔" میں ہنسا۔

میں نے تو سراسر بات ٹالی تھی۔ مگر اماں نے جواب میں بم ہی دے مارا۔

"ہاں پسند تو کر لی ہے۔ بلکہ پسند کیا میں تو اشارتاً" کہہ بھی آئی ہوں۔"

انہوں نے جتنے اطمینان سے کہا تھا۔ میں اتنے ہی زور سے جھٹکا کھا کر اچھلا اور کنگن میرے ہاتھ سے نکل کر پان دان کے اوپر جا گرا۔

"اماں! کیا کہہ رہی ہیں آپ۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میرے بچے۔" اماں نے محبت لٹاتی نگاہوں سے پہلے مجھے پھر کنگن کو دیکھا۔

"ایسی حور پری پسند کی ہے تیرے لیے کہ تو۔۔۔۔"

"لیکن مجھ سے پوچھے بغیر میری مرضی جانے بغیر۔۔ کم از کم پوچھ تو لیتیں۔"

"ارے تو اب بتا دے تجھے کیا اعتراض ہے اور اگر کوئی اعتراض ہے بھی تو بیلا کو دیکھ کر سارے اعتراض ہواؤں میں اڑ جائیں گے پھُر سے۔"

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا کر انہیں خوب سوجھی تھی۔ ان کا اطمینان قابل دید تھا۔ کنگن پر جمی ان کی نظروں میں صاف لکھا تھا کہ وہ نہ صرف فیصلہ کر چکی ہیں۔ بلکہ کسی حد تک عمل درآمد بھی۔

"اماں۔۔۔۔ اماں! مجھے نہیں کرنی کسی بیلا موتیا سے شادی۔"

"تو پھر کس سے کرنی ہے؟"

میں جتنا تنک کر بولا تھا۔ اماں نے بھی اتنا ہی چمک کر پوچھا اور میرے لب کھلنے سے پہلے بول پڑیں۔

"اس منحوس ماری شگفتہ کا نام مت لیجیو میرے آگے' بتا رہی ہوں ہاں۔ زبان کھینچ لوں گی تیری۔ توبہ

توبہ! ایسی دیدہ ہوائی لڑکی تو دیکھی نہ سنی۔ میں نے اسے اپنی گناہ گار آنکھوں سے اس نگوڑے امجد کے ساتھ بازار میں پھرتے دیکھا تھا اور اور۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ دونوں ہی زمانے بھر کے آوارہ ہیں۔ اللہ ملائی جوڑی ہے دونوں کی۔ جیسے کو تیسا ملے گا' خوش رہیں گے دونوں بہت اور تو..... "اماں نے رک کر مجھے گھورا۔

"میری لاش پر سے گزر کر لا سکتا ہے تو لے آ۔"

اماں کی ٹرین جو چلنا شروع ہوئی تو مجھے پٹڑی پہ آنا ہی پڑا۔ مگر بات اتنی آسانی سے ہضم ہونے والی نہ تھی۔

میں نے ہمیشہ شگفتہ کو ہی بیوی کے روپ میں دیکھا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا۔ اتنی آسانی سے تو میں بھی ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔

☼ ☼ ☼
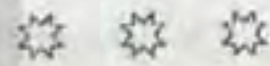
شام کا وقت تھا۔ آج میں آفس سے جلدی آگیا تھا۔

جانے کیوں جب سے اماں نے رشتے والی بات کی تھی۔ طبیعت پر عجیب سی اداسی طاری تھی۔ نہ کچھ کرنے کا دل چاہتا تھا نہ کسی سے ملنے کا۔

ثوبیہ میرے لیے چائے رکھ کر گئی تو اپنا سیل فون وہیں چھوڑ گئی۔

میرے ذہن میں جانے کیا آیا کہ میں نے اس کا سیل اٹھایا اور فون بک کھول لی اور مطلوبہ نمبر تلاش کرنے لگا۔

میں مسلسل لاؤنج سے ملحق کچن پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ ثوبیہ کسی بھی وقت آسکتی تھی۔

ذرا سی جدوجہد کے بعد نمبر مل گیا۔

میں نے جلدی سے اسے اپنے پاس محفوظ کیا اور ثوبیہ کا موبائل واپس رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼
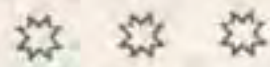
ثوبی کی شادی کی تاریخ کیا طے ہوئی۔ دن یوں بھاگے گویا بارات والے دن ہی رک کر سانس لیں گے۔

اماں نے سالوں سے جمع کیا زیور' کپڑا لتا' برتن' مشینری نکلوانا شروع کی۔ سارا سامان ملا کر بھی شادی کے لیے تو کم ہی تھا۔

میں نے آفس سے لون لیا اور اوور ٹائم بھی شروع کر دیا۔ میں رات بارہ بجے گھر پہنچتا اور دوسرے دن صبح صبح پھر نکل جاتا۔ ایسی مصروفیت میں شگفتہ سے ملاقات ایک خواب سی بن کر رہ گئی تھی۔

بس امجد ہی تھا جو کبھی کبھی اس کا کوئی پیغام لے کر جاتا۔

"جنت باربی کیو جا رہی ہوں۔ ملنا ہو تو آٹھ بجے آجانا۔"

"شمع امپوریم میں سیل لگی ہے۔"

"ملینیم میں نئی ورائٹی لان کے سوٹ....."

میرا جواب ہر دفعہ انکار میں ہوتا۔ آج کل ہاتھ اتنا تنگ ہو چلا تھا کہ میں ان پیغامات کا پس پردہ محرک جاننے کے باوجود خاموشی سے سن کر اٹھ جاتا۔

جب ہی ایک دن ماموں کے ڈھابے پر امجد نے ایک رقعہ لا تھمایا۔

"ظفر میری جان!"

انداز تخاطب اتنا بے باک تھا کہ مرد ہونے کے باوجود میرا ہاتھ لرز گیا۔

"کتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔ اب تو وہ دن' وہ پل خواب سے لگتے ہیں' جب ہم کتنی کتنی دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ وقت بتاتے اور پیار محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ دوپہر میں چھت پر ضرور آنا۔ ایک ضروری کام ہے۔

تمہاری اور صرف تمہاری شگفتہ عرف شگی۔"

میں کھسیانے پن سے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

کان میں بائیک کی چابی گھماتا امجد معنی خیزی سے ہنس رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیں..... یہ کیا کہہ رہی ہو شگفتہ!" اس نے کیا بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ البتہ میں نے قیاس کے گھوڑے ضرور دوڑائے تھے مگر جو بات اس نے بتائی۔ اسے سن کر تو قیاس کے تمام

گھوڑے اگلی ٹانگیں اٹھا کے مجھ ہی پر ہنہنانے لگے۔
"ایں۔۔۔ ہیں، ہیں، ہیں۔" شگفتہ زار و قطار رو رہی تھی۔
"میں نے تو مر کر بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ہو جائے گا۔ میں نے تو۔۔۔ میں نے تو۔۔۔" وہ اب ہچکیاں لے رہی تھی۔ "میں تو صرف تمہیں خوش کرنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ تم ہی مجھے کچھ نہ کچھ دیتے ہو۔ اس بار میں نے سوچا تھا لیکن۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر رونے لگی۔
میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ بات پیچیدہ نہیں مگر عجیب اور مشکل ضرور تھی۔
شگفتہ نے اپنی اماں کی خاندانی انگوٹھی بہت اصرار اور منت کر کے اس کا بھدا ڈیزائن بدلوانے کے لیے لی تھی اور سوچا تھا کہ خاندانی انگوٹھی تو کافی بھاری تھی۔ اسے دے کے بدلے میں کوئی ہلکی سی انگوٹھی لے لے گی اور تھوڑے پیسے بچا کر میرے لیے شاپنگ کر لے گی۔ تحفتاً دینے کے لیے اسے میرے لیے کچھ کپڑے، گھڑی وغیرہ خریدنے تھے مگر مصیبت یہ آپڑی کہ وہ نامراد انگوٹھی اس ارمانوں بھری غفلت کی ماری محبوبہ سے جانے کہاں کھو گئی۔
"اماں مجھے جان سے مار ڈالیں گی، ظفر! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کروں۔" کچھ دیر کے لیے تپتی ہوئی چھت پر صرف تپش بھری دوپہر ہی رہ گئی یا پھر شگفتہ کی سسکیاں۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔
"تم رومت شگفتہ پلیز!"
میری آواز کمزور سی تھی۔ مجھ سے اس کا سرخ متورم چہرہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔
"میں کچھ کرلوں گا۔ بس کچھ دن کسی طرح اپنی اماں کو بہلا لو۔"
دور بیٹھے امجد کے کانوں میں یقیناً "میری آواز چلی گئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگا۔
"نہیں ظفر! خدا کے لیے تم اب مزید میرے لیے کچھ مت کرنا۔ میں پہلے ہی تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہوں۔ اور ویسے بھی معمولی سا زیور بھی بہت مہنگا آتا ہے۔ ہے۔۔۔"
وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔
"ارے یار چپ کرو۔ بند کرو یہ رونا دھونا" میں نے کہہ دیا۔ بس کر دوں گا نہیں سے بھی۔ یہ میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں اور تمہارا مسئلہ اگر میں ہی حل نہ کر سکا تو لعنت ہے اس رشتے اور محبت پر۔۔۔"
میں نے جذباتی ہو کر اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ امجد یہ دیکھ کر اٹھا اور چپ چاپ نیچے چلا گیا۔ میں نے اسے جاتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

☼ ☼ ☼

اللہ کوئی مسئلہ پیدا کرے تو اس کے اسباب بھی خود ہی کرتا ہے۔
یہ میرا ایمان تھا اور کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔
مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور اگلے مہینے کی پہلی کو میری تنخواہ اور میری وہ کمیٹی ایک ساتھ ملنے والی تھیں، جو میں نے اپنی بہن کی شادی کے لیے ڈال رکھی تھی۔
اگر میں اس کمیٹی میں سے چند ہزار نکال کر شگفتہ کا مسئلہ حل کر دیتا تو کیا برا تھا۔
اس کی اماں کی انگوٹھی تو خاندانی تھی۔ جانے کتنی بھاری تھی۔ میں نے تو دیکھی تک نہ تھی۔ میں تو اسے ایک معمولی، باریک سی انگوٹھی ہی دلا سکتا تھا اور کمیٹی بھی صرف پچاس ہزار کی تھی، کوئی لاکھ دو لاکھ کی تو تھی نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر چند ہزار روپے الگ کیے اور امجد کے گھر چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔
کمرے میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ میرے دل میں بھی۔
میں نے جو آفس کی شرٹ اتار کر کھونٹی پر ڈالی تھی۔ اس کی جیب میں ہزار ہزار کے بیس نوٹ موجود تھے۔ اماں کو معلوم تھا میری کمیٹی اسی مہینے نکلے گی۔ وہ یقیناً "اس بارے میں پوچھنے کے لیے آنے ہی والی تھیں۔ مگر ان کے آنے سے پہلے ثوبیہ چلی آئی۔
"بھائی! آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" میں نے جلتی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
"کیا بات ہے بولو۔"
"آپ نے بیلا کو فون کیا تھا۔"
میری ساری سستی ہوا ہو گئی۔ لو اس نے ثوبیہ کو بتا دیا۔ لیکن کیوں؟ اور وہ ایسا بھلا کیسے کر سکتی ہے۔ جبکہ میری تو اس نے کال اٹینڈ تک نہیں کی۔ ایسا تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔
"ہاں کیا تو تھا۔ مگر اس نے ریسیو ہی کب کیا۔"
(حالانکہ میں نے اپنا تعارف بھی کروا دیا تھا)
"پتا ہے کیوں؟"
"کیوں؟"
"کیونکہ وہ اجنبیوں سے فون پر بات نہیں کرتی۔" اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں نظریں جھکا کر دھیرے سے بولا۔
"اچھا کرتی ہے۔"
"اگر آپ کو اس سے کوئی بات کرنی بھی ہے تو منگنی کے بعد کیجیے گا۔"
"منگنی کے بعد۔۔۔ اوں ہوں۔" میں نے اٹھ کر شرٹ کی جیب کھنگالی۔
"شادی کے بعد۔"
"ہیں واقعی؟ میں اماں کو بتا دوں کہ آپ راضی ہیں؟" ثوبیہ ایک دم خوش اور حیران رہ گئی۔
"ہاں!" میں پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔
"اور یہ لو۔ کمیٹی نکل گئی ہے۔ پورے پچاس ہیں۔ دھیان سے اماں کو دینا۔"

☼ ☼ ☼

آپ لوگ حیران ہیں ناں۔
کہاں تو میں شگفتہ کے لیے مرا جا رہا تھا اور کہاں۔۔۔
ایک بار بہت دن گزرے میرے پاس ایک میسج

آیا تھا۔

"بہت دکھ دیتی ہے یہ بات کہ آپ کسی پر اندھوں کی طرح اعتبار کریں اور وہ ثابت کردے کہ آپ سچ مچ اندھے ہیں۔"

میں نے بھی اعتبار کیا تھا شگفتہ پر اندھوں کی طرح اور اس نے بھی ثابت کر دیا کہ میں واقعی اندھا ہوں۔ عقل کا اندھا.....

اور میں اسی اندھے پن میں مبتلا رہتا اگر امجد میری آنکھیں نہ کھول دیتا۔ جی ہاں امجد.....

جسے میں کباب میں ہڈی 'چور' جھوٹا' خبیث اور جانے کیا کیا کہتا تھا۔ وہی امجد میرے ہاتھ میں دبے بیس ہزار روپے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟"

وہ مجھ سے ایسے بازپرس کر رہا تھا۔ جیسے کسی نادان بچے نے پیسے چوری کیے ہوں۔ میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے نہیں بتایا تو وہ شگفتہ کو یہ پیسے دے گا ہی نہیں۔"

"سُن ظفر!" وہ تفصیل سُن کر سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ تیرے حق حلال کی کمائی ہے۔ ان پر تیری بہن اور ماں کے سوا کسی کا حق نہیں۔ اس لیے یہ واپس لے جا۔"

"یار! تو میرے اور شگفتہ کے معاملے میں نہ بول۔ بس یہ دے دے جا کر اسے۔" جواب میں کچھ کہنے کے بجائے امجد نے گہری سانس بھری۔

"ایک بات بولوں ظفر! تو یہ ٹھیک نہیں کر رہا۔"

"میں جانتا ہوں پر میں شگفتہ کی پریشانی....."

"اوئے بھاڑ میں گئی اس کی پریشانی۔ تیری بہن کی شادی سر پر کھڑی ہے اور تو بارات کے کھانے کا انتظام کرنے کے بجائے پیسے لے کر آ گیا۔ اس فتنی پر نثار کرنے کے لیے۔"

"امجد!" میں بھونچارہ گیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ فتنی ہے وہ' خوب صورت فتنی' جھوٹ بولتی ہے۔ اسے کوئی غم کوئی پریشانی نہیں اور یہ پیسے..... پتا بھی ہے کیوں مانگے ہیں اس نے....."

اس نے ہونٹ بھینچ کر کوئی بات لبوں سے نکلنے سے روکی۔

"میرا منہ نہ کھلوا بس۔ یہ رکھ اور اپنی شکل گم کر۔" اس نے رخ پھیر لیا۔

"تو مجھے اس سے بدظن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے امجد! مجھے ہنسی آ رہی ہے تجھ پر..... وہ صرف میری ہے۔ تو اور تجھ جیسے تو اسے پانے کے صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ پاگل ہے تو۔" میں بات کو اتنا ہی سمجھ سکا تھا۔

"اوئے! پاگل میں نہیں تُو ہے۔ بلکہ تو نرا..... ہے" اس نے مجھے گالی دی۔

"لے یقین نہیں آتا تو خود فون کر کے پوچھ اس سے۔"

اس نے میز پر پڑا فون اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں یونہی بیٹھا رہا۔ مجھے اس کی بات پر ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا۔

"کیوں..... ہو گئی بولتی بند۔ اس کا فون خراب ہے یہی کہا تھا ناں' اس نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں بتاتا ہوں تجھے اس کا نمبر..... یہ لے تجھے پتا بھی نہیں اور اس نے نئی سم لے لی اور وہ نمبر مجھے زبانی یاد ہے۔"

اس نے نمبر ملا کر مجھے دیا۔ میرے ہاتھ سُن سے ہو گئے۔ کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ دل میں واہمے اور خدشات سر اٹھانے لگے۔ دل چاہا ابھی اسی وقت وہاں سے باہر نکل جاؤں۔ مگر امجد نے کال ملا دی تھی مگر یہ کیا.....

کمرے میں ہی کسی دوسرے فون پر کال آنے لگی۔ رنگ ٹون بج اٹھنے پر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ جیسے عمر قید سے رہائی ملی ہو۔ وہ یقیناً "امجد کا ہی دوسرا نمبر تھا۔ مگر امجد نے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے اطمینان سے فون نکالا۔ میں فون دیکھ کر اچھل پڑا۔

"یہ..... یہ تو۔" حیرانی کے مارے مجھ سے بات مکمل نہیں کی گئی۔

"ہاں یہ وہی فون ہے۔ جو وہ استعمال کرتی تھی۔ پر جانتا ہے یہ یہاں کیوں ہے۔ کیونکہ وہ خود چھوڑ کر گئی ہے۔ اسے اس سے اچھا اور بہت مہنگا سیٹ مل گیا ہے۔ معلوم ہے کس نے دیا۔ اس کے شوہر نے جس سے وہ کورٹ میرج کر چکی ہے۔"

امجد کے منہ سے ہونے والے پے درپے انکشافات نے مجھ سے حیران ہونے کی صلاحیت چھین لی تھی اور میری عزت نفس کے پرخچے اڑا دیے۔

"آج کل ملک چھوڑ کر بھاگنے کے چکر میں ہے۔ تجھ سے رقم بھی اسی لیے اینٹھ رہی تھی کیونکہ پیسے کم پڑ رہے ہیں اور میں....." وہ طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا۔

"مجھ پر تو اس کی خاصی نظر کرم تھی۔ میرا خیال ہے تجھے زیادہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ دن یاد ہے۔ جب اس نے ابا کا بہانہ کیا تھا اور گھر جانے کے لیے جلدی سے نیچے آ گئی تھی۔ وہ اس دن اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ یہاں آئی تھی۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر اپنے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔

شاید وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس نے کس طرح دھیرے دھیرے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی۔

مجھ سے کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔

"سب اسی کے گھڑے ہوئے بہانے اور کہانیاں تھیں۔ آخر اس کے ہوتے سوتے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا تو مجھے ہی بنانا تھا ناں۔ جتنی قیمت وہ نوٹوں سے چکا پائی اس نے دی اور باقی....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اچھا ہی کیا۔

"میں مانتا ہوں۔ میں بھی تیرا قصوروار ہوں۔ اس کی آڑ میں تیری جیبیں خالی کراتا رہا۔ پر یار! اب جو تو کرنے جا رہا ہے۔ یہ بہت زیادہ ہے۔ بہت زیادتی اور ناانصافی ہے تیری اماں اور معصوم بہن کے ساتھ۔ وہ بے چاریاں کیوں اس معاملے میں پسیں جس سے ان کا کچھ لینا دینا ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے تجھے یہ سب بتا دیا۔ ورنہ کھیل تو ویسے بھی وہ ختم کر چکی ہے مجھے..... تجھے..... اور ہم جیسے کتنوں کو اپنی انگلیوں پر نچانے کے بعد۔"

وہ نفرت سے زمین کو دیکھ رہا تھا اور میں ساکت آنکھیں پھاڑے اس کو۔

"واپس پلٹ جا۔ اور یہ پیسے لے جا کر ان کے حق داروں کو دے۔"

امجد نے میرا کندھا چھو کر مجھے کسی خواب سے جگا دیا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں تو احساس ہوا کہ میری آنکھیں نم تھیں۔

پھر مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔

لڑکھڑاتے قدموں اور دھڑدھڑاتے دل کے ساتھ میں وہاں سے اٹھ آیا اور کتنی دیر بے یقینی کے عالم میں اپنے کمرے میں پڑا رہا۔

یہاں تک کہ ثوبیہ آ گئی اور مجھے ایک نئی راہ' ایک نیا نشان منزل تھما گئی۔

"وہ اجنبیوں سے بات نہیں کرتی۔"

میں نے کروٹ بدلی اور دُکھے ہوئے دل سے سرگوشی نکلی۔

"اچھا کرتی ہے۔ بہت اچھا کرتی ہے۔"

میری آنکھیں شکست' ندامت اور ذلت کے احساس سے سرخ ہو رہی تھیں کیونکہ میں بیوقوف تو بن ہی چکا تھا۔ مگر بچوں کی طرح رونا نہیں چاہتا تھا۔ میرے کانوں میں امجد کی آواز گونج رہی تھی۔

"تن کی آنکھیں صرف سجا سنورا تن ہی دیکھ سکتی ہیں شہزادے! اپنے من کی آنکھیں کھول۔ اپنے من کو اُجال۔ کیونکہ ایک اُجلے من کی آنکھ ہی کسی اور کے من کا اُجلا پن دیکھ سکتی ہے۔"

نگہت سیما

"اریب! اریب فاطمہ! رکو۔ پلیز رکو۔ مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ دیکھو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بہت محبت کرتا ہوں۔"

وہ اس کے پیچھے تقریباً" بھاگ رہا تھا اور اریب فاطمہ پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز چلتی جارہی تھی۔ اس کی چادر کا پلو زمین پر لگ رہا تھا۔ بالکل اس کی کہانی کی حور عین کی طرح جس کی اوڑھنی کا ایک پلو ہمیشہ زمین کو چھوتا رہتا تھا۔

اریب فاطمہ نے چلتے چلتے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

"نہیں اریب فاطمہ! اس طرح مت روؤ۔ تمہارے آنسو مجھے فگار کردیں گے۔ میں نے بچپن سے اب تک صرف آنسو دیکھے ہیں۔ ماما کے اور پاپا کے آنسو وہ آنسو جو آنکھوں میں چمکتے اور رخساروں پر

۹ نویں قسط

بہتے تھے اور وہ آنسو جو دکھتے نہیں تھے لیکن دل کی زمین کو بھگوتے تھے۔ تم تو مجھے اپنے آنسو مت دکھاؤ۔ اپنی ہنسی دان کردو مجھے پلیز! ایک بار رک کر میری بات سن لو۔"

مکمل ناول

لیکن وہ پھر منہ موڑ کر بھاگنے لگی تھی۔

"اریب فاطمہ...... اریب فاطمہ!"

وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اور اسے لگا جیسے کوئی سر پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ اس نے کروٹ بدلی اور کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ باہر دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی لیٹا رہا۔

دستک پھر ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت گہری نیند سے جاگا تھا۔

"اریب فاطمہ!" اس کے لبوں سے نکلا اور اس نے غیر ارادی طور پر اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اوہ خدایا! تو وہ خواب تھا۔"

دستک پھر ہورہی تھی۔ وہ اب پوری طرح بیدار ہوچکا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ باہر کرنل شیر دل کا ملازم تھا۔ اس نے ایبک کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔

"آپ بہت گہری نیند میں تھے شاید۔ میں تو ڈر رہی

گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کرنل صاحب کو بلا لاؤں۔"

"ہاں! شاید بہت گہری نیند میں تھا۔ خیریت ہے نا!"

"جی! بالکل خیریت۔ کرنل صاحب کہہ رہے ہیں۔ ادھر ہی آجائیں ناشتے کے لیے۔ بیگم صاحبہ نے نہاری اور مغز بنایا ہے۔"

"ٹھیک ہے! میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ واپس مڑا اور سوچا۔

"کیا عجیب خواب تھا۔ شاید یہ میری کہانی کا اثر تھا، جو اس طرح کا خواب دیکھا میں نے۔"

اس نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کو اکٹھا کر کے کلپ بورڈ پر لگایا۔ رات وہ لکھتے لکھتے ہی سو گیا تھا۔ یوں ہی کرسی کی پشت پر سر رکھے۔ پھر رات کے درمیانی پہر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر آکر لیٹ گیا تھا۔ وہ اپنی کہانی جلد از جلد مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ان دنوں وہ رات گئے تک لکھتا رہتا تھا۔ پچھلا ہفتہ بہت پریشانی میں گزرا تھا۔

پہلے رابیل کا حادثہ اور پھر احسان شاہ کی بیماری۔ اس روز ہمدان کا فون سن کر وہ سمجھا تھا کہ شاید رابیل کو کچھ ہو گیا ہے۔ شاید اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے یا پھر شاید۔۔۔

"نہیں۔۔۔" اس نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سر جھٹکا۔ وہ کوئی غلط بات نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ رابیل کے ساتھ اس کی کبھی بات نہیں ہوئی تھی اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ مائرہ آنٹی کی طرح رابیل بھی اسے پسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس کی صحت اور زندگی کے لیے مسلسل دعائیں کر رہا تھا۔

وہ بابا جان کی بے حد لاڈلی تھی۔

وہ احسان شاہ کی بیٹی تھی۔ جو فلک شاہ کو جان سے زیادہ پیارے تھے اور وہ اس کی سگی ماموں زاد تھی۔ کہیں تو تعلق کے دھاگے جڑے تھے کہ وہ آندھی کی رفتار سے ڈرائیو کرتا اسپتال پہنچا۔ ہمدان اسے گیٹ کے پاس ہی مل گیا۔

ہمی! رابی کیسی ہے۔ سب خیریت ہے نا؟ ٹھیک ہے نا؟"

اس نے بے تابی سے ہمدان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو ایک لمحہ کے لیے ہمدان کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔

"ہاں! رابی تو ٹھیک ہے۔ وہ دراصل انکل احسان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔۔۔ شدید قسم کا۔ ابھی تک ایمرجنسی میں ہیں۔ ڈاکٹر ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں۔" ہمدان کی آواز بھرا گئی۔

"میں سمجھا شاید رابیل۔۔۔" ایبک نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں! سوری میرے فون کی چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ ایک دم بند ہو گیا اور میں تمہیں پوری بات نہیں بتا سکا۔ اب میں باہر پی سی او سے تمہیں فون کرنے جا رہا تھا۔"

"کیا پہلے بھی کبھی انہیں ہارٹ کی تکلیف ہوئی۔"

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔ آج بالکل اچانک ہی وہ رابی سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم بات کرتے کرتے انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا اور پورا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ یقین کرو آپی! ان کی پیشانی سے پسینہ ایسے بہہ رہا تھا جیسے پانی بہتا ہے۔

انہوں نے ہونٹ کھولے تھے لیکن بول نہیں پائے تھے۔ ان کے ہونٹ بالکل سفید ہو رہے تھے۔ ایک دم ہی ان کا سر ڈھلک گیا۔ وہ گرنے لگے تھے لیکن زبیر نے سنبھال لیا۔ پھر فوراً" ہی انہیں ایمرجنسی میں لے گئے تھے ہم۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ہمیں بتایا تھا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

دونوں باتیں کرتے کرتے ایمرجنسی کے قریب آگئے تھے۔

ایمرجنسی کے باہر پڑی بینچ پر عبدالرحمٰن شاہ، عثمان شاہ اور مصطفیٰ شاہ بیٹھے تھے۔

"میرا شانی۔۔۔ آپی۔۔۔ میرے بچے میرے بیٹے کے لیے دعا کرو۔ اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔"

ایبک کو دیکھتے ہی عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھیں برس پڑیں۔

"ان شاء اللہ انہیں کچھ نہیں ہوگا بابا جان! وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" ان کے پاس بیٹھتے ہوئے اور ان کے بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایبک نے انہیں تسلی دی۔ اور پھر کچھ دیر بعد انہیں ایمرجنسی سے آئی سی یو لے جایا گیا۔ لیکن بابا جان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ آئی سی یو میں انہیں دیکھنے گئے تو جتنی دیر وہاں رہے مسلسل ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ مصطفیٰ شاہ کے اشارے پر ایبک انہیں باہر لے آیا۔

"آپ پلیز حوصلہ کریں۔ انکل احسان ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

وہ انہیں تسلی دیتا ہوا وزیٹر روم میں لے آیا تھا۔ انکل عثمان انہیں وہیں مل گئے۔ انہوں نے ایبک سے کہا کہ وہ بابا جان کو گھر چھوڑ دے۔

عبدالرحمٰن شاہ بڑی مشکل سے گھر جانے پر تیار ہوئے تھے۔

"رابی کے پاس کون ہے ہمدان؟" اسے اچانک ہی خیال آیا۔ ہمدان نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا

"مائرہ آنٹی۔۔۔ میں اور ثنا آنٹی ہیں۔ مونی اور حفصہ کچھ دیر پہلے ہی گھر گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے! میں بابا جان کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں پھر۔۔۔"

"نہیں! تم بیٹھو۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔ مجھے گھر سے کچھ سامان بھی لانا ہے۔"

اور پھر اگلے کئی دن وہ مسلسل اسپتال جاتا رہا۔ احسان شاہ آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیے گئے تھے۔ رابیل کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ احسان شاہ کی انجیو گرافی ہوئی اور پتا چلا تھا کہ ان کی دو وینز بند ہیں۔ عثمان شاہ واپس چلے گئے تھے اور حفصہ اور عادل کی منگنی کا فنکشن ملتوی ہو گیا تھا۔

عثمان شاہ اکیلے ہی واپس گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ بعد وہ پھر آئیں گے چھٹی لے کر اور منگنی کے بجائے فوراً" شادی کر دی جائے گی۔ فلک شاہ کو ایبک نے احسان شاہ کی بیماری کے متعلق نہیں بتایا تھا اور ہمدان کو بھی منع کر دیا تھا کہ الریان میں بابا جان اور مصطفیٰ انکل سے کہہ دے کہ وہ بابا کو احسان شاہ کے متعلق کچھ نہ بتائیں۔۔۔ کتنے سالوں بعد وہ تھوڑا خوش ہوئے ہیں۔ احسان شاہ کی بیماری کا سن کر وہ پریشان ہو جائیں گے۔ ایسے میں جبکہ وہ بھی وہاں نہیں ہے۔ ماما اکیلے کیسے انہیں سنبھالیں گی۔ وہ خود بیمار ہیں۔

اس نے خود ہی انہیں فون کر کے منگنی کے ملتوی ہونے اور عثمان انکل کے واپس جانے کے متعلق بتا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼
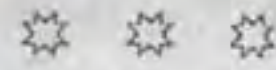
احسان شاہ تقریباً" ایک ہفتہ اسپتال رہنے کے بعد گھر منتقل ہو گئے۔ ان کے گھر جانے کے بعد بھی اس نے دو چکر "الریان" کے لگائے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ احسان شاہ اس کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے براہ راست ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ مائرہ آنٹی کی طرح انہیں بھی اس کا "الریان" میں آنا پسند نہیں ہے۔ البتہ حیرت انگیز حد تک رابیل کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ دونوں بار رابیل نے اس سے بہت اچھی طرح بات کی تھی۔

"لگتا ہے اس حادثے نے رابیل کو بدل دیا ہے۔"

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"چلو! رابیل بی بی کو بھی کچھ اخلاق نبھانے آگئے ہیں، ورنہ پہلے تو اگر وہ لاؤنج میں بیٹھی ہوتی تو اسے دیکھ کر رخ موڑ لیتی تھی اور اب نہ صرف یہ کہ اس نے ماما پاپا کی خیریت پوچھی تھی۔ بلکہ اسے چائے کی پیش کش بھی کی تھی۔ اگر عمر احسان شاہ کو یہ سب پتا چلے تو وہ تو حیرت سے اچھل پڑے بلکہ اسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ رابیل احسان شاہ اور چائے کی پیش کش۔۔۔

ایبک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اس نے دراز سے فائل نکالی اور کلپ بورڈ پر سے کاغذات اتار کر ترتیب دینے لگا۔

کاغذات کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر لفظوں پر پھسل رہی تھیں۔

حور عین چوہدری فرید کی پانچویں بیٹی تھی۔ اس لیے اس نے کبھی حور عین کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ بلکہ دو ماہ تک کسی نے اس کا نام بھی نہیں رکھا تھا۔ اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد اس کی ایک پھوپھی نے جو سات جماعت پاس تھی۔ اس کا نام رکھا تھا۔ "یہ خمسہ ہے۔ پانچویں۔ رابعہ چوتھی تھی۔۔۔۔" اور اپنے علم پر نازاں ہو کر وہ قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔

حور عین کی اس پھوپھی کو اپنی سات جماعتوں پر بے حد ناز تھا اور چوہدری فرید بھی اپنی اس بہن سے ہر مشورہ کرتا تھا اور کہتا تھا۔

"اس کی سمجھ تم سب سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اس نے سات جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔ وہ بھی شہر میں رہ کر۔"

دراصل حور عین کی اس پھوپھی کو اس کے ماموں بچپن میں اپنے ساتھ شہر لے گئے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لیکن بدقسمتی سے جب اس کی اس پھوپھی نے ساتویں جماعت پاس کی تو ماموں، ممانی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور پھوپھی کو واپس حویلی آنا پڑا۔ چوہدری فرید کو اس کی سات جماعتوں کا بڑا مان تھا۔ حالانکہ خود اس نے اپنی بیٹیوں کو پانچ جماعتوں سے زیادہ پڑھنے نہیں دیا تھا۔

رقیہ اس کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اسے بہت شوق بھی تھا پڑھنے کا۔ اسکول کی بڑی استانی جی نے خود گھر آکر مریم اور چوہدری فرید سے کہا تھا کہ وہ رقیہ کو آگے پڑھنے دیں۔ کم از کم مڈل تک تو گاؤں میں ہی اسکول ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

"پھر آپ کہیں گی، آٹھویں پڑھ لی ہے تو شہر بھیج دو دس پڑھنے کے لیے۔" چوہدری فرید نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ "نہ بابا نہ۔۔۔ ہمیں تو معاف ہی کرو۔ ہمیں نہیں پڑھا لکھا کر عشق و عاشقی کروانا۔"

اور بڑی استانی جی کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ رقیہ مارے شرم کے سر جھکائے بیٹھی تھی اور چوہدری فرید کے جانے کے بعد بار بار استانی جی سے معافی مانگ [illegible] اس کے کہنے پر ہی مریم اور چوہدری فرید کو سمجھانے آئی تھیں۔

چوہدری فرید کی بیٹیوں نے پرائمری تک پڑھا [illegible] پھر بھی سعدیہ کو عشق ہو گیا تھا اور عشق بھی ایسا جس نے اسے خاک میں ملا ڈالا اور مٹی اس کا خوب صورت جسم کھا گئی۔ آہ۔

"تمہارا نام خمسہ ہے تو پھر یہ حور عین؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو حور عین نے جو سر جھکا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

اسے حور عین تو اس کی ماں مریم بلاتی تھی یا پھر جب تم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو تم نے اسے حور عین کہہ کر بلایا۔ یوں تو حور عین کی ساری بہنیں ہی خوب صورت تھیں۔ لیکن حور عین کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ سحر طاری کرتی تھیں اور مریم نے جب پہلی بار اسے اپنی گود میں اٹھایا تو اس کے لبوں سے بے اختیار "حور عین" نکلا تھا۔ پر اس کی پھوپھی نے کہہ دیا تھا۔

"خمسہ تو بس خمسہ۔" اس کی پھوپھی کی کہی ہر بات پر چوہدری فرید مہر لگا دیا کرتا تھا۔ اس نے خود تو ایک بار بھی نظر بھر اسے نہیں دیکھا تھا۔

وہ کب ہنسی تھی۔ کب اس نے دانت نکالے تھے۔ کب اس نے چلنا شروع کیا تھا اور کب اسکول جانا۔ وہ ہر بات سے بے خبر تھا۔

یوں بھی وہ مہینوں بعد حویلی آتا تھا۔ زیادہ تر وہ ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ نوراں ملعون اور اور میراں میراثن ڈیرے پر آتی جاتی رہتی تھیں اور ان راتوں میں مریم جاگتی تھی۔

باہر دارو سائیں پیپل تلے بیٹھا، جب کچھ گاتا اور اس کی آوازرات کے سناٹوں میں ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مریم کے کانوں میں پڑتی تو وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھتی۔ گرمیوں کی راتوں میں صحن میں ساتھ ساتھ بچھی چارپائیوں پر سوتی اس کی بیٹیاں جوانی کی الہڑ نیند سو رہی ہوتیں تو وہ ایک نظر ان پر ڈال کر کشاں کشاں ڈیوڑھی تک آتی اور پھر ڈیوڑھی کی جالیوں سے باہر بے خود سی دیکھے جاتی اور دارو سائیں کی آواز بلند ہو جاتی خود بخود ہی۔

"ونی میں گلیاں وارو ڑا کوڑا
تے محل چڑھایا سائیاں"

اور گاتے گاتے بول اور لے بدل جاتی

"شالا مسافر کوئی نہ تھیوے
نے ککھ جناں توں بھارے ہو۔"

اور جالیوں سے چہرہ ٹکائے بے خود کھڑی مریم کی آنکھیں برسنے لگتیں۔۔۔ اور ایسی ہی ایک رات میں رقیہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پیچھے ڈیوڑھی تک چلی آئی تھی۔ رقیہ جو چوہدری فرید کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور چند دن پہلے ہی چوہدری فرید نے اس کا رشتہ ملک ممتاز چوہدری سے طے کر دیا تھا۔

ملک ممتاز چوہدری جو دو بیویاں بھگتا چکا تھا اور اولاد سے محروم تھا۔ لیکن وہ بڑا زمین دار تھا اور اس کی جاگیر کئی میلوں تک پھیلی تھی۔ چوہدری فرید خوش تھا۔ لیکن مریم کو یہ رشتہ منظور نہ تھا۔

سولہ سالہ سعدیہ کو جانے کس دکھ نے چاٹ لیا تھا۔ جو اب سترہ سالہ رقیہ کو دکھوں کی بھٹی میں جھونک دیتی۔۔۔ بھلا سترہ سال اور پچاس سال کا کیا میل؟

"مرد کی عمر کس نے دیکھی ہے۔ بے وقوف عورت! اور پھر ملک ممتاز تو ہٹا کٹا ہے۔ دس جوانوں پر بھاری ہے وہ۔" پر مریم مان کے ہی نہیں دے رہی تھی کہاں اس کی چنبیلی کی طرح نازک رقیہ اور کہاں ملک ممتاز۔

"اماں!" رقیہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ مریم چونک کر مڑی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"اماں! کیوں روتی ہو؟"

"رقی!" مریم کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔ رقیہ ایک بازو اس کے گرد حمائل کیے اسے ساتھ لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"میرا غم نہ کر اماں! سعدو کا دکھ ہی کم نہیں ہے تیرے لیے۔ اب میرا دکھ بھی اوڑھ لیا ہے تو نے۔ کچھ نہیں ہو گا۔ ابا کو اپنی کرنے دے۔ میں راضی ہوں اماں۔"

اور مریم اسے لپٹا کر یوں بلک بلک کر روئی کہ ساتھ والی چارپائیوں پر سوئی اس کی تینوں بیٹیاں جاگ اٹھیں۔ اور حیران اور پریشان سی اسے دیکھنے لگیں۔

رابعہ جو چوتھی تھی۔

اور فریدہ جو تیسری تھی اور حورعین جو تب صرف چند سال کی تھی۔

رقیہ اسے اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپکتی ہوئی یوں تسلی دے رہی تھی جیسے وہ مریم سے بڑی ہو یا پھر اس کی کوئی گہری سہیلی ہو بیٹیاں جب ماں کے کندھوں کو چھونے لگتی ہیں تو وہ یوں ہی ماؤں کی گہری سہیلیاں بن جاتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ کی سانجھی۔

اس رات رقیہ کے نصیب پر مہر لگ گئی تھی۔ جب رقیہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور مریم نے چادر اوڑھ لی۔ رابعہ اور فریدہ بھی ماں کے کہنے پر بنا کوئی اصرار کیے آنکھیں موندے لیٹ گئیں لیکن حورعین اسی طرح رابعہ کی چارپائی پر بیٹھی مریم کو تکتی تھی۔ اس رات وہ رابعہ سے کہانی سنتے سنتے اسی کے پاس سو گئی تھی۔ ورنہ تو وہ مریم کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر سوتی تھی۔

"سو جا خصمی!" رابعہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ لیکن وہ چارپائی سے اتر کر مریم کے پاس آ گئی۔ اور پھر مریم کے پاس لیٹتے ہوئے اس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے ہولے ہولے اسے تھپکنے لگی۔ مریم نے اس کی طرف کروٹ بدلی اس کے گرد بازو حمائل کر کے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔

اور تب یکایک اسے احساس ہوا تھا کہ رات کے اس پہر فضا ایک دم ساکت تھی اور وہ جو ہوا کے دوش پر دارو سائیں کی آواز آتی تھی وہ اب نہیں آتی تھی اب حبس تھا اور ہوا دوسری سمت چلتی تھی۔ دارو سائیں پیپل کے تنے پر سر مارتے ہوئے بلک بلک کر روتا تھا۔ اس کے رونے کی آواز مریم تک نہیں آتی تھی۔ لیکن وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ حورعین بند ہوتی آنکھیں کھول کھول کر مریم کو دیکھ رہی تھی۔

اس رات نہ مریم سوئی تھی نہ رقیہ۔ صبح دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور حورعین جب چائے کا ساکپ لے کر حویلی سے باہر دارو سائیں کو دینے گئی تھی تو اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ دارو سائیں کے ماتھے اور چہرے پر خون جما ہوا تھا اور ماتھے پر کسی کسی خراش سے اب بھی لہو رستا تھا۔ وہ دوڑ کر واپس حویلی میں آئی تھی اور جب کٹورے میں پانی اور روئی لے کر وہ باہر آئی اور کھڑونچی کی جالیوں سے چہرہ ٹکائے مریم اسے پانی میں روئی بھگو کر دارو سائیں کا چہرہ صاف کرتے دیکھتی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں تیرتے تھے دارو سائیں حیرت سے اسے تکتا تھا۔ پھر اس نے حورعین کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کچھ دیر اپنی ویران آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہا بھی تھا۔ لیکن حورعین کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر یکایک اس نے ایک دم حورعین کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور بھاگنے لگا۔

حورعین بھیگی روئی اور پانی کا کٹورا ہاتھوں میں لیے اسے حیرت سے بھاگتے دیکھ رہی تھی اور اندر جالیوں سے باہر جھانکتی مریم کے سامنے کوئی منظر بار بار آتا تھا جیسے سنیما کی اسکرین پر ایک ہی منظر ٹھہر گیا ہو۔

وہ ایک بچہ تھا' دس گیارہ سال کا اور وہ بچی حورعین سے تھوڑی ہی بڑی ہو گی سات آٹھ سال کی۔ اس کے ہاتھ میں بھی پانی کا کٹورا تھا اور وہ روئی بھگو بھگو کر بچے کی پیشانی سے بہتے خون کو صاف کرتی تھی اور بچہ مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتا تھا۔

"اور رقیہ؟" بہت دیر سے میرے دل میں جو سوال کلبلا رہا تھا۔ وہ میرے لبوں پر آ گیا۔ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ حورعین کو پسند نہیں کہ میں اسے باتوں کے درمیان ٹوکوں۔ لیکن مجھ میں صبر تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اتنی دیر سے میں بے چین ہو رہا تھا' یہ جاننے کے لیے

کہ کیا رقیہ کی شادی ہو گئی اس پچاس سالہ ملک ممتاز سے' حورعین نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔

"ہاں! رقیہ اپنی حویلی سے وداع ہو کر ملک ممتاز کی حویلی میں چلی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی ملک ممتاز کو صاحب اولاد نہ کر سکی تو بہت جلد ملک ممتاز کے دل سے اتر گئی اور باقی دو کی طرح حویلی کے ایک کمرے میں مقید ہو گئی۔ ملک ممتاز تینوں بیویوں کے بانجھ ہونے کا دکھڑا روتے روتے چوتھی بیاہ لایا اور چوتھی کے اصرار پر رقیہ کو طلاق دے کر گھر بھجوا دیا۔ چوتھی بیوی کو رقیہ کی کم عمری اور خوب صورتی سے خوف آتا تھا۔ باقی دو تو بوڑھی ہو گئی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھی ملک کو اولاد نہ دے سکی تو اس واجبی صورت والی سفینہ کو چھوڑ کر ملک پھر کہیں رقیہ کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔

مریم کا دکھ سوا تھا۔

بچھڑ جانے والی بیٹی کا دکھ

اور اجڑ جانے والی بیٹی کا غم

اس کی آنکھیں تو کبھی خشک نہیں ہوتی تھیں لیکن وہ کبھی شکوہ بھی نہیں کرتی تھی۔ نہ اللہ سے نہ چوہدری فرید سے۔

ایک لمحہ کے لیے حورعین خاموش ہوئی تو میں نے فوراً پوچھا۔

"وہ بچہ کون تھا۔ اور۔۔۔"

وہ بچہ دارا شکوہ تھا۔ مریم کا تایا زاد۔ جسے درختوں پر چڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر درختوں سے گر کر زخمی ہو جاتا تھا۔ مریم اس کے زخم صاف کرتی جاتی اور اسے ڈانٹتی رہتی' بالکل تائی جان کی طرح اور وہ سنتا رہتا۔ وہ کبھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ بار بار جان بوجھ کر زخمی کیوں ہوتا ہے اور اسے مریم کا اپنے زخم صاف کرنا اور اپنے لیے پریشان ہونا اچھا کیوں لگتا ہے۔

اور جب سمجھنے کی عمر آئی اور وہ مریم کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے بار بار زخمی ہونا اور مریم سے زخم صاف کروانا کیوں اچھا لگتا تھا تو اس کے تایا اور سوتیلے بھائی نے جائیداد کی خاطر اسے زندہ درگور کر دیا اور وہ پھر کبھی مریم کو نہیں بتا سکا تھا کہ وہ۔۔۔

"اور کیا مریم نہیں جانتی تھی اس کے بتائے بنا ہی۔۔۔؟"

"ہاں اس لالچ اور ہوس نے بہت سارے لوگوں کو ان کے پیاروں کے ہاتھوں زمین میں دفن ہوتے دیکھا تھا۔"

"تب تو زمین بہت روتی ہو گی نا حورعین؟" اب کے زمین کا ذکر میں نے چھیڑا تھا۔

"وہ بھی تو دارا شکوہ تھا۔ علم کا سمندر۔ لیکن علم نے اسے گمراہ کر دیا۔ میں نے پڑھا ہے تاریخ کی کتابوں میں وہ ہندو سادھوؤں کی صحبت میں رہتا۔ ان ہی جیسا حلیہ بنائے رکھتا۔ اس کا بھائی بڑا دین دار اور نیک تھا۔ لیکن بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل زمین کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ زمین پر بھائی کے ہاتھوں بھائی کے پہلے قتل کے بعد سے اب تک نہ جانے کتنے بھائی اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔"

میں نے قدرے فخر سے حورعین کی طرف دیکھا وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔

"تو تمہیں بھی تاریخ سے دلچسپی ہو گئی ہے۔"

اس کی مسکراہٹ نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔ یہ تو کورس کی کتاب میں کہیں اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے متعلق پڑھا تھا تو اب دارا شکوہ کے نام پر یاد آ گیا تھا۔

"زمین کی جھولی دکھوں سے بھری ہوئی ہے شاعر!" حورعین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک دم بجھ گئی تھی۔

"اور اسے تو صدیوں سے رونے کی عادت ہے۔ دریا' سمندر' ندی' نالے' چشمے' جھیلیں سب اس کے آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ تمہیں پتا ہے شاعر اس رات جب حضرت لوط علیہ السلام کے شہر سدوم میں دو فرشتے خوب صورت لڑکوں کے روپ میں آئے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان ٹھہرے تھے تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان کے

دروازے پر ہتھوڑے برساتے تھے اور مہمان لڑکوں کو مانگتے تھے۔۔۔ تو کیا زمین خوف سے کانپتی نہیں ہوگی؟ اور آنے والے عذاب کے ڈر سے ان کے لیے روتی نہیں ہوگی جو سمجھتے نہیں تھے اور جب عذاب نے انہیں آلیا تو تب کون تھا اس کے آنسو دیکھنے والا وہ روتی تھی پکارتی تھی کہ شاید سنبھل جائیں۔ لیکن زمین دھماکے سے پھٹ گئی اور پتھروں کے ٹکڑے بستی پر برستے تھے اور بستیاں الٹ پلٹ ہو کر بحر مردار کے نیچے دفن ہو گئی تھیں اور دور اپنے خیمے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام فرشتوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری پاکر بھی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لیے دکھی تھے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے تھے اگر لوط کی قوم میں دس بندے بھی نیک ہیں تو ان پر عذاب نازل نہ کر لیکن وہاں تو پوری قوم ہی مبتلائے گناہ تھی زمین اپنی پیدائش سے لے کر اب تک اربوں' کھربوں انسانوں کے قتل پر ان کے دکھوں پر ان کی اذیتوں پر روئی ہے۔ کیا ماں اولاد کے دکھوں پر نہیں روتی؟ تم شاعر تو زمین کو دھرتی ماں کہتے ہو اور آج تمہاری صفوں میں بھی قوم لوط کے افراد کو دیکھ کر زمین روتی ہے' اس عذاب کے ڈر سے جو آئے گا تو بستیاں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔"

حورعین میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی پلکیں ہمیشہ کی طرح بھیگی ہوئی تھیں۔

"مریم بھی اولاد کے دکھوں پر روتی تھی چھپ چھپ کر اور دعائیں مانگتی تھی' ان کی خوشیوں کے لیے۔"

ایبک اپنی ہی لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے میں پورا محو ہو گیا تھا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اسے تو ناشتا کرنے شیر دل کی طرف جانا ہے۔ دروازے کی بیل بج رہی تھی۔

اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کاغذات جلدی سے فائل میں رکھے اور دروازے تک آیا۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے سر! کرنل صاحب کہہ رہے ہیں کہ جلدی آئیں۔"

"ہاں ہاں! چلو میں آرہا ہوں۔"

اور پھر وہ بہت عجلت میں تیار ہو کر کرنل شیر دل کی طرف آیا تھا۔ کرنل شیر دل ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔

"بہت انتظار کروایا یار!"

"سوری انکل۔" وہ شرمندہ ہوا۔

"نہیں بس ایسے ہی۔"

"رات دیر تک جاگتے رہے ہو؟" کرنل شیر دل مسکرائے۔

"جی! میں چاہ رہا تھا کہ اس ماہ کے اینڈ تک میری کتاب مکمل ہو جائے۔"

تب ہی بیگم شیر دل ملازم کے ساتھ ناشتا لے کر آگئیں۔

"السلام علیکم آنٹی!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹھو بیٹا! کیسے ہو۔"

"ٹھیک ہوں آنٹی!" ایبک بیٹھ گیا۔

"ایک تو تمہارے آنے جانے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔" انہوں نے نہاری کا ڈونگا اس کی طرف بڑھایا اور ملازم کو آواز دی۔

"کریم! لیموں اور ادرک کہاں ہے؟ جلدی لے کر آؤ۔" پھر وہ ایبک کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"کل میں نے تمہارے پسندیدہ قیمہ کریلے اور چکن تکہ بنایا تھا۔ دو دفعہ کریم کو بھیجا۔ لیکن پتا چلا تم نہیں ہو۔"

"میں کچھ مصروف ہو گیا تھا آنٹی! اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ اگر میں کھانے کے وقت گھر پر ہوں تو خود ہی آجاتا ہوں۔"

"جانتی ہوں' کتنے خود آتے ہو۔ یہ مغز لے لو۔"

"جی! شکریہ۔"

ایبک نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا مغز ڈالا۔

"کچھ ادھر بھی نظر کرم ہو جائے بیگم صاحبہ۔" کرنل شیر دل مسکرائے۔

"یہ سامنے ہی تو ڈونگا پڑا ہے۔ لیجیے نا!" کرنل شیر

دل کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور انہوں نے ڈونگا اپنی طرف کھسکا لیا۔

"تو میاں!" بیگم شیر دل پھر ایبک کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "پڑھائی تم کر چکے، ملازمت کی تمہیں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ بغیر ملازمت کے ہی خاصا کما رہے ہو۔ نہ کماؤ تو بھی زمینوں، جائیدادوں سے کافی آتا ہے۔ بیوی بچے تمہارے بھوکے نہیں مریں گے۔"

ایبک نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"بیوی بچے۔۔۔؟"

"ہاں ہاں! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ناکہ شادی کر لو گے تو بیوی بچوں کو کھلا پلا نہیں سکو گے۔۔۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" کرنل شیر دل نے قہقہہ لگایا۔ "اتنا گھما پھرا کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف صاف کہہ دیں کہ میاں! اب شادی کے قابل ہو گئے ہو، شادی کر لو۔ ویسے کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟"

"ارے لڑکیوں کی کون سی کمی ہے کرنل صاحب اس کے اپنے خاندان میں ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی ہے۔۔۔ اس کے ماموؤں کی بیٹیاں ہیں۔ سگھڑ، خوب صورت، پڑھی لکھی۔۔۔ اور وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔۔۔ رابیل، وہ کتنی پیاری ہے۔۔۔"

ایبک سر جھکائے کھانے میں مشغول تھا۔ لیکن اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

"ایک وہ ہمارے والے صاحبزادے ہیں۔ امریکا جا کر بیٹھ گئے۔۔۔ جب بھی شادی کی بات کرو، جواب ملتا ہے۔ سوچ کر بتاؤں گا۔ تم بھی سوچتے ہی نہ رہ جانا ساری اچھی لڑکیاں تمہارے سوچتے سوچتے میں ہاتھوں سے ہی نکل جائیں کہیں۔"

"جی۔۔۔!" ایبک نے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کیے۔

بیگم شیر دل چائے لینے چلی گئیں تو کرنل شیر دل نے ایبک کی طرف دیکھا۔

"اپنی آنٹی کی بات پر غور کرنا یار۔ تمہارے بابا بھی چاہتے ہیں کہ اب تم شادی کر لو۔ زندگیوں کا کیا اعتبار۔۔۔ اگر کسی کو پسند کرتے ہو تو اپنی مام کو بتا دو اور۔۔۔"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ بیگم شیر دل ہاتھ میں کارڈلیس لیے آ رہی تھیں۔

"آپ کے صاحبزادے نے یاد فرمایا ہے۔ بات کر لیں۔"

کرنل شیر دل نے فون لے لیا اور بات کرنے لگے۔

ایبک سوچنے لگا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جب والدین کو اولاد کی رفاقت اس کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے تو اولاد اپنی زندگیاں بنانے کے چکر میں انہیں چھوڑ جاتی ہے۔ اب یہ حیدر شیر دل کتنے سالوں سے امریکا میں سیٹل تھا۔ پہلے اسپیشلائزیشن کے چکر میں سات سال لگا دیے اور اب اچھی جاب کی کشش اسے پاکستان آنے سے روکے ہوئے تھی۔ دو تین سال بعد دس پندرہ دنوں کے لیے چکر لگا جاتا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ڈاکٹروں کو اتنی سیلری نہیں ملتی کہ وہ اپنی زندگیاں اچھے طریقے سے گزار سکیں۔

آنٹی اور انکل شیر دل نے ایبک کو ہمیشہ بہت محبتیں اور شفقتیں دی تھیں۔ حیدر کے حصے کی بھی۔

کرنل شیر دل نے حیدر سے بات کر لی تو ایبک بھی چائے پی کر کھڑا ہو گیا۔

"آج کا کیا پروگرام ہے، کھانے تک آ جاؤ گے؟"

"ابھی تو بابا جان سے ملنے جا رہا ہوں۔ ایک دو روز تک بہاولپور جا رہا ہوں۔ سوچا، آج فارغ ہوں تو مل آؤں۔ پھر شاید مجھے ٹائم نہ ملے اگلے دو دن۔"

"بابا جان سے میرا بھی سلام کہنا۔" کرنل شیر دل بھی کھڑے ہو گئے۔

الریان جانے کا پروگرام ابھی اچانک ہی ناشتا کرتے ہوئے اس نے بنایا تھا۔ آنٹی شیر دل صحیح تو کہتی ہیں کہ کہیں سوچنے سوچنے میں سب کچھ ہاتھوں سے نکل ہی نہ جائے۔ اریب فاطمہ وہ پہلی لڑکی تھی، جسے ایبک

فلک شاہ کے دل نے چنا تھا اور رفاقت کی خواہش کی تھی۔ وہ کسی اچھے اور مناسب وقت کے انتظار میں تھا کہ اریب سے دل کی بات کر سکے۔ ایسا وقت مل ہی نہیں پا رہا تھا۔ اسے خود ہی یہ وقت تلاش کرنا ہو گا۔

انیکسی میں آ کر اس نے میز پر پڑی گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس کی نظر ایک شاپنگ بیگ پر پڑی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے شاپنگ بیگ اٹھا لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ الریان کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ مسلسل اریب فاطمہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"مجھے آج ضرور موقع دیکھ کر دل کی بات کہہ دینا چاہیے۔ لیکن کیسے؟ وہاں تو سب ہوں گے اور پھر اریب فاطمہ تو سب کی محفل میں آتی بھی نہیں ہے۔ حفصہ اور منیبہ کتنی بار بلاتی ہیں، تب کہیں آ کر کھڑے کھڑے سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ میری وجہ سے تو نہیں۔۔۔ محبت میں بدگمانی پتا نہیں کیوں ساتھ ساتھ رہتی ہے۔" اس نے سوچا۔

"اریب فاطمہ نے تو کبھی اپنے رویے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا کہ اسے میرا الریان آنا پسند نہیں ہے۔ وہ بس محتاط لڑکی ہے۔ ورنہ تو کئی بار ایسا محسوس ہوا ہے کہ اریب فاطمہ کے دل میں بھی میرا خیال ہے۔ نہیں! اریب فاطمہ مجھے ناپسند نہیں کر سکتی۔" اسے یقین ہوا کہ محبت خوش گمان بھی تو بہت ہوتی ہے۔

"کاش! وہ آج مجھے کہیں اکیلی مل جائے۔ کچھ دیر کو۔" اس کے دل نے بہت شدت سے خواہش کی۔

اور بعض خواہش ایک دم پوری ہو جاتی ہیں۔۔۔ اچانک جیسے ایبک کی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً "اریب فاطمہ تھی، جو ارد گرد سے بے خبر سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ وہ تقریباً" الریان کے قریب ہی تھا۔ اس نے ایک دم گاڑی پیچھے کی اور روڈ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اریب فاطمہ کو دیکھا۔ وہ پارک کی طرف مڑ گئی تھی اور اس کے گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ یہ پارک الریان کے قریب ہی تھا اور عموماً" خواتین اور بچے رات میں ٹہلنے آتے تھے یا پھر چھٹی والے دن بچے یہاں کھیلتے رہتے تھے۔

"اس وقت اریب پارک میں کیوں جا رہی ہے؟" ایبک نے سوچا۔ پسنجر سیٹ پر پڑے ہوئے اس نے شاپنگ بیگ کو اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل کر کے پارک کی طرف بڑھا۔

اس وقت تقریباً" ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اتوار کے باوجود اس وقت پارک میں رش نہیں تھا کچھ چھوٹے بچے ایک طرف کرکٹ کھیل رہے تھے۔ چند بچے جھولوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر صاحب ایک بنچ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ان کے سامنے دو گول مٹول، پیارے پیارے بچے ایک دوسرے کی طرف گیند پھینک رہے تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے اریب فاطمہ نظر آ گئی۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ یہ جگہ ذرا پیچھے تھی اور اس طرف اس وقت کوئی نہیں تھا۔

"اریب فاطمہ!" اس کے بالکل سامنے جا کر ایبک نے آہستہ سے کہا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر ایبک کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"آپ یہاں؟"

"میں الریان جا رہا تھا۔ آپ کو ادھر پارک میں آتے دیکھا تو میں بھی ادھر آ گیا۔ دراصل مجھے آپ سے ہی کام تھا۔"

"مجھ سے؟" اریب فاطمہ کی آنکھوں میں ٹھہری حیرت گہری ہو گئی۔ "مجھ سے بھلا آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"کیوں، کیا مجھے آپ سے کام نہیں ہو سکتا؟" ایبک کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

"اریب فاطمہ! کیا ہم یہاں کچھ دیر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

"یہاں؟"

اریب فاطمہ نے چاروں طرف دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا لڑکا پاپ کارن بیچ رہا تھا اور دو تین چھوٹے بچے پاپ کارن خرید رہے تھے۔ جبکہ دور سے ایک غبارے والا غباروں کا ڈنڈا اٹھائے ادھر ہی آرہا تھا۔

"ہاں! یہاں۔۔۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو۔" ایبک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی پلکیں نم ہوں۔

"کچھ۔۔۔ میرا مطلب ہے الریان جاکر بات کرلیتے ہیں۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"آپ چلیں الریان میں آجاتی ہوں کچھ دیر تک۔"

"لیکن میں اگر اکیلے میں بات کرنا چاہوں تو۔۔۔؟ آپ کو اگر یہاں بات کرنا نامناسب لگ رہا ہے تو پلیز میرے ساتھ چلیں۔ کہیں کسی پرسکون جگہ چل کر بات کرلیتے ہیں۔"

"آیئے پلیز۔۔۔" وہ مڑا اور پھر چند قدم چل کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہیں بنچ کے پاس متذبذب سی کھڑی تھی۔

"کیا آپ مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرتیں؟"

وہ پھر اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ اریب فاطمہ گھبرائی گھبرائی سی کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر کسی نے اسے ایبک کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تو۔۔۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی مائرہ آنٹی نے کتنی باتیں سناڈالی تھیں، بلاوجہ ہی۔ پتا نہیں مائرہ آنٹی اتنے غصے میں کیوں تھیں۔ بلکہ جس روز سے احسان شاہ اسپتال سے آئے تھے، ان کا موڈ خراب تھا۔ لیکن آج تو حد ہوگئی تھی۔ وہ لاؤنج میں کھڑی عمر سے کہہ رہی تھیں کہ جب وہ مارکیٹ جائے تو اسے ایک ہیلپنگ بک لادے۔

کچھ چیزیں اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس بک کی مدد سے خود ہی سمجھ لے گی۔ پہلے اس نے ہمدان سے مدد لینے کا سوچا تھا۔ لیکن پھر مائرہ آنٹی کے خوف سے اس نے یہ ہی بہتر سمجھا تھا کہ وہ کسی بک سے ان سوالوں کو سمجھ لے۔ مائرہ آنٹی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھیں۔ غالباً" وہ رابیل کے کمرے میں تھیں۔

اسے عمر کے پاس کھڑے دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور انہوں نے بے حد غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"اریب فاطمہ! میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟"

"جی!" وہ بے حد حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ عمر تھا۔۔۔ اسے تو بالکل بچہ لگتا تھا شہریار کی طرح اور وہ بھی اسے آپی کہتا تھا۔

"لیکن یہ عمر۔۔۔" وہ ہکلا گئی۔ "مجھے ایک کتاب منگوانی تھی اس سے کورس کی۔"

"تم ڈرائیور یا خان سے بھی کتاب منگوا سکتی تھیں۔ لیکن تمہیں تو اپنی ماں کی طرح شوق ہے لڑکوں سے باتیں بگھارنے کا۔۔۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا لیکن۔۔۔"

وہ ہکابکا سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ عمر بھی حیرت سے مائرہ کو دیکھ رہا تھا۔

"مما! اگر اریب آپی نے مجھے کتاب لانے کو کہہ دیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ میں آخر حفصہ آپی اور مونی آپا کے بھی۔۔۔"

"تم چپ رہو احمق لڑکے!" مائرہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

"مما!" عمر احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مائرہ نے اسے ٹوک دیا۔

"عمر! جاؤ، میرا دماغ مت کھاؤ اور ہر ایک کے ساتھ فری مت ہوا کرو۔ تمہاری بہن صرف رابیل ہے سمجھے؟ تم تو ہو ہی عقل سے پیدل۔"

اور عمر احسان کی بھوری آنکھوں میں نمی پھیل گئی اسے مائرہ کا اس طرح اریب فاطمہ کے سامنے بات کرنا انتہائی ناگوار گزرا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا منیبہ کے کمرے میں گھس گیا۔

لاؤنج میں مائرہ اور اریب کھڑی رہ گئی تھیں۔ اریب کی مٹھی میں دبے دو سو روپے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔

"یہ مٹھی میں کیا ہے؟ کس کا خط دبا رکھا ہے؟ میرا بیٹا معصوم اور سادہ سا ہے۔ اپنے مقاصد کے لیے اسے استعمال مت کرنا۔ کہیں اس کے ذریعے رقعہ بازی تو نہیں کررہی ہو کسی سے اپنی ماں کی طرح؟"

"لفظ کبھی اتنے زہریلے بھی ہوسکتے ہیں۔" اریب نے اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لفظ اس طرح بھی جسم و جان میں تیز دھار خنجر کی طرح اترتے ہیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے پورے وجود میں درد و اذیت کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔

مائرہ نے ایک دم ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی بند مٹھی کھول دی تھی۔ پسینے میں بھیگے سو سو کے دو نوٹ نیچے گر پڑے۔

مائرہ نے ایک نظر نیچے گرے ہوئے نوٹوں کو دیکھا اور تیز تیز چلتی ہوئی لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔ اریب نے اندر پھیلتے درد کو نظر انداز کرتے ہوئے مائرہ کو بتانا چاہا کہ اس کی اماں ایسی نہیں تھیں اور وہ خوامخواہ اماں پر الزام مت لگائیں۔ لیکن مائرہ جاچکی تھی اور اریب کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جارہی تھی۔

اس نے منیبہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ بند تھا اور اندر سے عمر احسان کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک دم لاؤنج سے نکلی اور پھر اندرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی برآمدے کی سیڑھیوں پر کچھ دیر کھڑے ہو کر اس نے ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کرتے ہوئے سوچا۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ مائرہ آنٹی کو میرا یہاں رہنا قطعاً" پسند نہیں ہے اور اس کے لیے وہ خوامخواہ اماں کا نام لے کر فضول باتیں کرتی ہیں اور میں۔۔۔ مجھے یہ سب کچھ سننا پڑتا ہے۔ مجھے مروہ پھپھو کو فون کرنا چاہیے کہ میں ہاسٹل جانا چاہتی ہوں۔ مروہ پھپھو ضرور میری بات سمجھ لیں گی۔"

وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھی لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے مالی کو آواز دی۔

"بابا! گیٹ بند کرلیں۔"

سڑک پار کرکے ایک اسٹور تھا۔ اسٹور والے نے ایک چھوٹا سا پی سی او بھی بنا رکھا تھا، جہاں کالنگ کارڈ کے ذریعے وہ بات کروادیتا تھا۔

"لیکن پیسے۔۔۔" اسٹور کی طرف جاتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ خالی تھے۔ پیسے تو وہاں لاؤنج کے فرش پر گرے پڑے تھے۔ بے دھیانی میں وہ خالی ہاتھ نکل آئی تھی۔

"تو کیا میں واپس جاکر پیسے لے آؤں۔" اس نے سوچا۔ لیکن اس وقت واپس جانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے عمر کا سامنا کرنے سے شرمندگی ہورہی تھی۔

"وہ کیا کہتا ہوگا۔ کیا سوچتا ہوگا۔ میں کیسی لڑکی ہوں اور پھر میری اماں۔۔۔؟ اور کیا پتا عمر نے اندر منیبہ سے بھی بات کی ہو۔"

اس کی بلند آواز لاؤنج تک آتو رہی تھی۔ لیکن اس نے سننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ قریبی پارک کی طرف مڑ گئی۔ حفصہ اور منیبہ کے ساتھ چند بار وہ رات کو اس پارک میں چہل قدمی کے لیے آئی تھی۔

ایبک بہت غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے اریب فاطمہ! آپ کچھ پریشان ہیں۔ کیا گھر میں کچھ بات ہوئی؟" اس نے بے حد نرمی سے پوچھا۔ اریب فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ نہیں تو۔"

"پھر آپ اتنی اپ سیٹ کیوں لگ رہی ہیں؟ شاید آپ مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرنا چاہ رہی ہیں۔۔۔ اوکے! پھر میں چلتا ہوں۔ الریان میں ہی بات کرلوں گا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" اس کے لبوں سے ایک دم نکلا۔

"وہاں الریان میں مائرہ آنٹی بھی ہوں گی۔ آپ یہیں بات کرلیں، جو کہنا ہے۔"

اس نے جیسے فیصلہ کرلیا اور بینچ پر بیٹھ گئی۔

اسے ایبک کے ساتھ جاتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا

تو نہ جانے کتنی باتیں بنیں۔ اگر مائرہ آنٹی نے کوئی الٹی سیدھی بات ابا سے کہہ دی تو اسفندیار اور ابا تو اسے زندہ گاڑ دیں گے۔ یہاں اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ کہہ سکتی ہے کہ وہ تو پارک میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ایبک وہاں سے گزر رہا تھا۔ اسے بیٹھے دیکھ کر رک گیا' بس۔

اس نے سوالیہ نظروں سے ایبک کی طرف دیکھا۔ ایبک کھڑا تھا اور اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کہیے! کیا کہنا تھا آپ کو؟"

"مجھے کہنا تو بہت کچھ تھا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"لیکن ابھی مختصر بات کرتا ہوں۔ پھر کبھی سہی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ بینچ پر رکھا ہے۔

"اریب فاطمہ یہ۔۔۔"

"یہ کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھیں تو۔۔۔"

اریب فاطمہ نے شاپنگ بیگ اٹھا لیا۔ اس میں سے چادر نکلی۔ وہ حیرت سے اس چادر کو دیکھ رہی تھی۔ ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

تین' چار گھنٹے مارکیٹ میں گھومنے کے بعد اسے یہ سیاہ چادر پسند آئی تھی۔ اس پر نفیس کڑھائی تھی اور کڑھائی میں کہیں کہیں شیشے لگے تھے۔ چادر پیک کراتے ہوئے اس نے کوئی دس بار سوچا تھا کہ اریب فاطمہ جب اس چادر کو اوڑھے گی تو اس کے ہالے میں وہ کیسی لگے گی۔

"اس روز آپ نے اپنی چادر پھاڑ کر رابیل کے زخموں پر پٹی باندھی تھی۔ مارکیٹ میں خریداری کرتے ہوئے اچانک ہی اس چادر پر نظر پڑی تو میں نے اسے خرید لیا۔"

"لیکن میرے پاس اور چادر تھی۔ یہ۔۔۔" اس نے خود پر نظر ڈالی۔ اس وقت وہ صرف دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی۔ گو کہ دوپٹا خاصا بڑا تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے گھر سے باہر نکلی تھی۔

"پلیز! اسے قبول کر لیں۔"

"تھینک یو۔" اریب فاطمہ نے چادر شاپنگ بیگ میں رکھی۔ "بہت خوب صورت چادر ہے۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آپ اوڑھیں گی تو اور خوب صورت ہو جائے گی۔"

ایبک نے زیر لب کہا تھا لیکن اریب فاطمہ نے شاید سن لیا تھا اس کی آنکھوں میں ایک دم استعجاب نظر آیا اور اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"اریب فاطمہ! میں آپ سے لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا۔ میں آپ کے گھر اپنی ماما کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں اور یہ میرے دل کی شدید خواہش ہے۔ میں نے جب جب آپ کو دیکھا' مجھے لگا کہ آپ۔۔۔ آپ ہی وہ ہستی ہیں' جس کی ہمراہی میں مجھے زندگی کا سفر طے کرنا ہے۔ لیکن میں ماما کو بھیجنے سے پہلے آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" لمحہ بھر کے لیے اریب فاطمہ کی آنکھوں میں حیرت ابھری اور پھر ان میں جیسے ہیرے دمکنے لگے۔ اس کی پلکیں جھک گئیں اور رخساروں پر ہولے ہولے شفق پھیلنے لگی۔ اسے کئی بار لگا تھا کہ ایبک اس کے لیے دل میں کچھ خاص جذبے رکھتا ہے۔

جب اس نے کہا تھا' وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

جب اس نے کہا تھا اس کے آنسو اس سے سہے نہیں جاتے۔ اس کا رونا اسے تکلیف دیتا ہے۔ تب ہر بار اس کے دل نے ایک انوکھی سی خوشی محسوس کی تھی۔ اس کے اندر چراغاں ہوا تھا۔ لیکن پھر خود ہی ان چراغوں کی لو مدھم پڑ گئی تھی۔

نہیں! کہاں ایبک ۔۔۔ اور کہاں میں۔ شاید اس نے عادتاً" ہی یہ کہا ہو گا۔ مخلص اور ہمدرد ہے۔ بس اس لیے' ورنہ بقول مریتہ کے اس کے کالج کی آدھی لڑکیاں ایبک پر مرتی ہیں۔۔۔ اور میں چک نمبر 151 کی ایک دیہاتی لڑکی جسے مروہ مامی نے اپنی بیٹی بنا رکھا ہے اور جو مروہ مامی کے میکے میں پڑھنے کی غرض سے آئی ہے۔ بھلا اس کی اہمیت ہی کیا۔

اندر پھول کھلتے اور مرجھا جاتے اور ان مرجھا جانے والے پھولوں کا دکھ کئی کئی دن تک اسے افسردہ رکھتا۔ وہ تو ایبک کے ساتھ کی خواہش کرنے سے بھی ڈر جاتی تھی اور ایبک کہہ رہا تھا' وہ اسے شریک زندگی بنانا چاہتا ہے۔

عمر بھر کی رفاقت کا خواہش مند ہے۔

"پلیز۔۔۔" ایبک فلک شاہ کے اندر بے چینی پھیل گئی۔ "اریب فاطمہ آپ کی خواہش میرے لیے بہت محترم ہے۔ اگر آپ۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "میں یہیں سے ہی پلٹ جاؤں گا۔ پلیز! آپ کو اعتراض ہے تو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" ایک دم اس کے لبوں سے نکلا اور اس کا سر نفی میں ہل گیا۔

"کیا۔۔۔ آپ کا مطلب ہے آپ کو میرا ساتھ منظور نہیں؟" اریب فاطمہ کا سر جھک گیا اور شفق کی سرخی گہری ہو گئی۔

ایبک نے دلچسپی سے اس کی سرخ ہوتی رنگت کو دیکھا۔ جیسے لالے کے پھولوں نے اس کے رخساروں کو چھو لیا ہو۔

"تھینک یو اریب فاطمہ!" وہ کھڑے کھڑے تھوڑا سا جھکا۔ "میں آج ہی ماما کو فون کرتا ہوں۔ وہ مروہ آنٹی سے بات کر لیں۔"

"نہیں۔۔۔ پلیز! ابھی نہیں۔" اس نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

مائرہ آنٹی کے لگائے جانے والے الزامات کے خوف سے اس کی رنگت سفید پڑ گئی۔ جیسے کسی نے ایک دم رخساروں کی ساری سرخی چوس لی ہو۔

مائرہ آنٹی نہ جانے کتنی باتیں بنائیں گی۔ وہ ضرور کہیں گی کہ میں نے ایبک کو پھنسا لیا ہے۔

"ابھی کیوں نہیں اریب فاطمہ؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

اور بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو اریب فاطمہ نے پلکیں جھپک جھپک کر چھپانے کی کوشش کی۔

"ابھی مجھے بی اے کرنا ہے۔"

"تو آپ پڑھتی رہیں' جتنا جی چاہے۔ ابھی تو صرف۔۔۔"

"نہیں! ابھی نہیں۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔

"جب تک میں یہاں ہوں۔ تب تک نہیں۔ میرے جانے کے بعد۔"

"او کے!" چند لمحے اسے بغور دیکھنے کے بعد ایبک نے کہا۔ "اگر آپ نے ایسا کہا ہے تو یقیناً" کوئی وجہ ہو گی۔۔۔ کوئی ٹھوس وجہ۔"

اریب نے سر ہلایا اور اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔

"میں آپ کی خواہش کا احترام کرتا ہوں اور آپ سے اس کی وجہ بھی نہیں پوچھتا۔ لیکن پلیز! آپ روئیں تو مت۔ آپ کا ایک آنسو بھی مجھے سارا بھگو دیتا ہے۔ میں گھنٹوں ڈسٹرب رہتا ہوں۔"

اس نے ذرا سا جھک کر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کی پلکوں پر اٹکے ہوئے آنسو کو چن لیا۔ اریب کا دل یوں زور سے دھڑکا' جیسے ابھی باہر آ جائے گا۔

"مجھ سے وعدہ کریں اریب! کہ آپ آج کے بعد اپنے دکھوں' اپنے آنسوؤں اور اپنی خوشیوں میں مجھے شریک کریں گی۔" اریب فاطمہ نے سر ہلایا۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ آج بھی یوں ہی بلاوجہ الریان سے باہر نہیں آئی ہیں۔ ضرور کسی نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ شاید بہت زیادہ۔ کاش! میں آپ کے اور آپ کی طرف بڑھنے والے دکھوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا۔"

اریب فاطمہ کا دل جیسے اتنی محبت' اتنے گہرے احساس پر پانی ہو کر بہنے کو بے تاب ہوا۔ اس نے شعوری کوشش سے آنسوؤں کو آنکھوں تک آنے سے روکا۔ وہ اپنے آنسو دکھا کر اس دل کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ جس میں اس کے لیے اتنے قیمتی اور خوب صورت احساسات چھپے ہوئے تھے۔

"اریب فاطمہ! ایک آخری بات آپ وعدہ کریں'

آپ کبھی راستہ نہیں بدلیں گی۔ انتظار کے ان سالوں میں کہیں کوئی اور بہتر شخص۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ بھلا ایبک فلک شاہ سے بہتر بھی کوئی شخص ہو سکتا ہے اور اگر ہو بھی تو اس کا دل تو پہلی بار ایبک فلک شاہ کو ہی دیکھ کر دھڑکا تھا اور دل نے شدت سے اس شخص کی چاہ کی تھی۔ لیکن پھر اپنی کم مائیگی کے احساس سے خود ہی شرمندہ ہو کر اس چاہ کا گلا گھونٹا تھا۔

"پرامس!" ایبک کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اریب فاطمہ نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس کا ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ایبک فلک شاہ نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ ایبک فلک شاہ اپنے بابا فلک مراد شاہ کی طرح محبتوں کے معاملے میں بہت کمزور دل تھا۔۔۔ بلکہ شاید اپنے بابا سے بھی زیادہ کمزور۔

"پتا ہے اریب فاطمہ ایک روز میں تمہیں کھو دینے کے تجربے سے گزرا اور مجھے لگا، جیسے میرا دل بند ہو جائے گا۔ جیسے میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تب اس روز ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ۔۔۔"

"پاپ کارن۔۔۔ گرم گرم خستہ۔"

پاپ کارن بیچنے والا لڑکا اپنی چھوٹی سی ریڑھی دھکیلتا قریب آگیا۔ ریڑھی پر شیشے کے اندر چٹک چٹک کر مکئی کے دانے سفید پھولوں میں بدل رہے تھے۔

"پاپ کارن لو گی؟" ایبک نے پوچھا۔

سر ہلاتے ہوئے مسکراہٹ اریب فاطمہ کی آنکھوں میں کھلی۔ ایبک مبہوت سا اسے دیکھنے لگا۔

"کیا بند ہونٹوں کے ساتھ مسکراہٹ کسی کی آنکھوں میں اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں! مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

ایبک لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ پاپ کارن لے کر جب وہ اریب فاطمہ کی طرف مڑا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اریب فاطمہ نے پاپ کارن کا پیکٹ پکڑتے ہوئے کئی بار کی سوچی ہوئی بات کو سوچا۔

"مسکراہٹ اس کے چہرے پر کتنی سجتی ہے۔"

"کیا خیال ہے، چلیں اب؟"

"ہاں۔۔۔!" وہ کھڑے ہوتے ہوتے بیٹھ گئی۔ "آپ جائیں میں تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔"

"اوکے۔۔۔" وہ اس کی احتیاط سمجھ گیا۔

پارک سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پیکٹ سے پاپ کارن نکال نکال کر کھا رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے ایک مرتبہ اس نے سوچا، وہ الریان نہ جائے اور واپس گھر چلا جائے۔ اس وقت آنکھیں بند کر کے وہ صرف اریب فاطمہ کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔ خوشی کے اس احساس کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرنا چاہتا تھا جو اس کے اندر رنگ بکھرا رہی تھی۔ لیکن الریان کے اتنے قریب آکر بابا جان سے ملے بغیر چلے جانا بھی غلط تھا۔ جبکہ اسے ایک، دو روز میں بہاول پور چلے جانا تھا۔ پھر پتا نہیں وہاں کتنے دن لگ جائیں۔ اس نے گاڑی الریان کی طرف بڑھا دی اور کچھ دیر بعد ہی وہ الریان میں تھا۔

لاؤنج میں رابیل صوفے پر بیٹھی تھی اور اس کے پاس احسان شاہ کھڑے تھے۔ شاید وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

احسان شاہ نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ رکے نہیں تھے اور نہ ہی ایبک سے مزید کوئی بات کی تھی۔ غیر ارادی طور پر ایبک نے کندھے اچکائے اور رابیل کی طرف دیکھا۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک۔" رابیل اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آج کل کیا ہو رہا ہے؟" ایبک لاؤنج میں ہی کھڑا تھا۔ اسے ایک دم وہاں سے جانا مناسب نہیں لگا تھا۔ جبکہ رابیل بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھی اور پچھلے دنوں وہ جتنی بار بھی آیا تھا، رابیل کا رویہ اس کے ساتھ مناسب ہی رہا تھا۔

"کچھ نہیں! بس فارغ ہی ہوتی ہوں۔ پاپا سے جاب کا پوچھا، انہوں نے منع کر دیا۔"

"احسان ماموں اب بالکل ٹھیک ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں! کہہ رہے تھے کل سے آفس جاؤں گا۔"

"لیکن انہیں ابھی کچھ آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"ہاں! سب نے منع تو کیا ہے۔ لیکن وہ کہہ رہے تھے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر تو ویسے ہی ڈرا دیتے ہیں۔"

اور ایبک کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ مزید اس سے کیا بات کرے۔ رابیل کے ساتھ اس کی بے تکلفی نہ تھی۔ جبکہ حفصہ اور منیبہ یا مرینہ ہوتیں تو وہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔

"میں بابا جان سے ملنے آیا تھا۔ دراصل میں ایک، دو روز میں واپس بہاول پور جا رہا ہوں۔"

"آپ ہمیشہ بابا جان سے ہی ملنے آتے ہیں؟" رابیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ایبک کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت نمودار ہوئی۔ پھر وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"ہاں! اتفاق ہے۔ ہومی اور عمر سے تو باہر بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"ہمدان اور عمر کے علاوہ بھی کچھ لوگ الریان میں رہتے ہیں اور انہیں بھی آپ سے ملنے کی چاہ ہو سکتی ہے۔" آج رابیل اسے حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"مثلاً" اور کون؟" ایبک نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کو وہ سٹپٹائی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے بولی۔

"مثلاً" حفصہ، منیبہ، مرینہ، عمر، زبیر وغیرہ۔"

"چلیں! بابا جان کے ساتھ انہیں بھی شامل کرلیں۔ ایبک فلک شاہ محبتوں کی قدر کرنے والا شخص ہے اور اگر الریان میں کوئی ہمارا انتظار کرتا ہے اور اسے ہم سے ملنے کی چاہ ہے تو ہم سیکڑوں بار اس کی خاطر الریان میں آسکتے ہیں۔ بھلے کچھ لوگوں کو ہمارا آنا اچھا نہ لگے۔"

اس کے ہونٹوں پر وہی شریر اور دلکش مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ رابیل کی نظریں ایک دم اس کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ اس کا دل یک دم بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

"میرے خیال میں تو کسی کو بھی آپ کا آنا برا نہیں لگ سکتا۔" اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔ تب ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر مائرہ باہر نکلیں۔ ایبک انہیں سلام کر کے عبدالرحمن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا؟" انہوں نے رابیل کے قریب آکر پوچھا۔

"بابا جان کا پوچھ رہا تھا۔" رابیل نے صوفے پر پڑا میگزین اٹھا لیا۔

"اور کیا باتیں کر رہا تھا؟" انہوں نے متجسس نظروں سے رابیل کو دیکھا۔

"فار گاڈ سیک ماما! میری جاسوسی کرنا چھوڑ دیں۔ مومی کیا کہہ رہی تھی؟ حفصہ سے کیا بات ہو رہی تھی؟ فون پر کس سے بات کر رہی تھیں؟ کس کا فون تھا؟ مائی گاڈ۔"

اس نے میگزین صوفے پر پٹخا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

مائرہ نے کسی قدر حیرت سے اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ یہ رابیل اتنی چڑچڑی کیوں ہو رہی ہے۔ انہوں نے یہی تو پوچھا تھا نا کہ ایبک کیا باتیں کر رہا تھا۔ اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات تھی، تو ان کا شک صحیح تھا کہ وہ کسی میں انٹرسٹڈ ہے۔

"نہیں! ایبک۔۔۔" انہوں نے خود ہی اپنی بات کی نفی کی۔ "وہ ایبک کو تو بالکل پسند نہیں کرتی۔ یقیناً" کوئی یونیورسٹی فیلو ہو گا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہمدان سے شادی کرنے سے کیوں انکار کرتی؟" چند دن پہلے انہوں نے شانی کے کہنے پر اس سے ہمدان کے متعلق پوچھا تھا تو اس نے صاف منع کر دیا تھا۔

"میں نے ہمدان کے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچا

ممّا۔"

"تو اب سوچ لو میری جان! وہ ایک بہترین لڑکا ہے۔ ایجوکیٹڈ' خوب صورت' دولت مند' شریف' اس کے علاوہ اور کیا چاہیے ہوتا ہے بھلا۔"

"ٹھیک ہے ممّا! ہمدان میں کوئی برائی نہیں۔ وہ بہت اچھا ہے۔ لیکن مجھے اس سے شادی نہیں کرنا۔"

اس نے حتمی بات کہی تھی۔ تب کتنی ہی بار انہوں نے چپکے چپکے اس کی باتیں سنی تھیں۔ جب وہ فون کر رہی ہوتی یا جب کسی کا فون آتا یا حفصہ اور منیبہ سے گفتگو کر رہی ہوتی۔ آج صبح وہ حفصہ کے کمرے میں کسی کام سے گئی تھیں تو یوں ہی انہوں نے منیبہ سے، جو حفصہ کے کمرے میں بیٹھی تھی، پوچھ لیا تھا۔

"رابی اگر ہمدان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو کیا وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟"

"نہیں! میرے خیال میں تو نہیں۔ شاید وہ فی الحال شادی ہی نہ کرنا چاہتی ہو۔ ہومی بھی فی الحال شادی نہیں کرنا چاہ رہا۔" منیبہ نے انہیں بتایا۔

"کیوں' کیا وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"نہیں! اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ وہ رابی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

لیکن رابی نے تو صاف منع کر دیا تھا۔ وہ جھنجلائی ہوئی سی نیچے اتری تھیں اور لاؤنج میں اریب کو عمر سے بات کرتے دیکھ کر خواہ مخواہ ہی انہیں غصہ آگیا تھا۔

"اریب کہاں ہے؟" انہوں نے اسے لاؤنج سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ شاید خود ہی مارکیٹ چلی گئی تھی کتاب خریدنے۔

انہوں نے کندھے اچکائے اور صوفے پر بیٹھ گئیں۔ احسان شاہ کمرے میں آئے تو انہوں نے بتایا تھا کہ ایک آیا ہے اور اتنی دیر سے وہ کھڑا رابیل کا منہ تو نہیں تک رہا ہوگا۔

"اپنے باپ کی طرح جادوگر ہے۔ کہیں میری رابی کو ورغلا ہی نہ لے۔"

وہ پریشان سی بیٹھی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جادو کی کیسی چھڑی گھمائیں کہ رابیل اور ہمدان کا بیاہ ہو جائے۔

وہ جب بیاہ کر الریان آئی تھیں تو ہمدان چھوٹا سا تھا اور انہیں بہت پیارا لگتا تھا۔ تب ہی ایک بار انہوں نے ثنا سے کہا تھا۔

"ثنا بھابھی! اسے تو میں اپنا داماد بناؤں گی۔ دعا کریں اللہ مجھے ایک بیٹی ضرور دے۔"

رابی شادی کے تین' چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ لیکن مائرہ کو اپنی کہی ہوئی بات یاد تھی اور انہوں نے ضد کی تھی کہ رابیل اور ہمدان کی منگنی کر دی جائے۔ لیکن بابا جان' مصطفیٰ' احسان سب ہی اتنی کم عمری میں منگنی کے بے حد خلاف تھے۔

"بڑے ہو کر بچوں کا رجحان جانے کیا ہو۔ اس لیے کم عمری میں انہیں پابند کرنا مناسب نہیں ہے۔"

"اگر رابی کسی کو پسند نہیں کرتی تو پھر احسان سے کہوں گی۔ وہ اسے سمجھائیں۔ احسان شاہ کی تو کوئی بات نہیں ٹالتی۔ امید ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے خود کو تسلی دی۔

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اریب فاطمہ اندر داخل ہوئی۔ وہ بے حد مطمئن سی ایک شاپنگ بیگ اٹھائے اندر آئی تھی۔ انہوں نے کسی قدر حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جس پر عجیب انوکھی سی چمک تھی۔ اریب فاطمہ انہیں لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر ایک لمحہ کو ٹھٹکی۔ پھر سر جھکائے منیبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"کہیں یہ باہر ہمدان سے تو مل نہیں کر آرہی؟" ایک لمحہ کو انہیں گمان گزرا۔

"یہ آنکھوں کی چمک' یہ چہرے پر کھلتی بہار بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو۔۔۔"

تب ہی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہمدان کو دیکھ کر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"آخر کیا کمی ہے ہمدان میں؟"

"کمی تو احسان شاہ میں بھی کوئی نہ تھی۔ پھر دل کیوں فلک شاہ کے لیے ہمکتا تھا؟ احسان شاہ کی زندگی

میں شامل ہو کر بھی ٹھکرائے جانے کا دکھ روح میں کسی کانٹے کی طرح کھبا ہوا تھا۔ جو گوشت میں بہت نیچے اتر جائے اور ہمیشہ کسک دیتا رہے۔" مائرہ کو پھر یقین ہونے لگا کہ ضرور رابیل کے دل نے کسی اور کو پسند کر لیا ہے اور وہ کوئی اور کون ہے۔ اس کا کھوج انہیں لگانا تھا۔ لیکن رابیل تو ذرا سے سوالوں پر بھڑک اٹھتی تھی۔

"ایبک کہاں ہے؟" ہمدان نے ان کے قریب آکر پوچھا تو مائرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ مجھے کیا پتا ایبک کہاں ہے اس وقت؟"

"سوری آنٹی! دراصل میں نے ابھی ایبک کو فون کیا تو اس نے بتایا وہ تو الریان میں ہی ہے۔"

"تو بابا جان کے پاس ہوگا پھر۔" لاپروائی سے کہتے ہوئے مائرہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ہمدان بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

بابا جان بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ہولے ہولے ایبک سے جانے کیا کہہ رہے تھے۔ ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کمال کرتے ہو یار! کم از کم تم مجھے اطلاع تو کر دیتے کہ آئے ہوئے ہو۔"

بابا جان کو سلام کر کے ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ہمدان نے شکوہ کیا۔

"مجھے آئے ہوئے کچھ بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"

"اور یہ چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" ہمدان نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"کہیں تم پھر تو بابا جان کو اغوا کرنے کا پروگرام نہیں بنا رہے؟"

"میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ انہیں ساتھ ہی لے جاؤں۔ لیکن بابا جان ہی رضامند نہیں ہو رہے۔"

"ایبک تمہاری بات ہوئی گھر میں؟ مومی اور عمارہ کب آرہے ہیں؟" عبدالرحمٰن شاہ کے لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

"بابا نے تو مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔" ایبک نے حیران ہو کر کہا۔

"اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عادل اور حفصہ کی منگنی اور نکاح کے فنکشن میں آئے گا۔"

"ہاں! لیکن ابھی تک تو پتا نہیں کب ہو رہا ہے فنکشن۔"

"عثمان کا فون آیا تھا۔ اس کی چھٹی منظور ہو گئی ہے۔ ایک ہفتے تک آرہا ہے اور اس نے شادی کے لیے کہہ دیا ہے۔ مصطفیٰ اور ثنا سے بات ہو گئی ہے اس کی۔" بابا جان نے بتایا۔

"یعنی اب شادی ہو گی ڈائریکٹ۔" منیبہ نے کہا اور حفصہ کو خبر دینے کے لیے باہر بھاگی اور اندر آتی مرینہ سے ٹکرا گئی، جو کندھے پر شولڈر بیگ ڈالے کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔

"اور یہ عادل کتنا گھنا ہے۔ اس نے ہوا تک نہیں لگنے دی کہ اندر ہی اندر یہ منصوبہ بنا رہا ہے۔" ہمدان نے تبصرہ کیا۔

"یہ دراصل میری خواہش تھی۔" عبدالرحمٰن شاہ نے وضاحت کی۔ "میں نے عثمان اور مصطفیٰ سے کہا تھا۔ کیا پتا کب بلاوا آجائے تو۔۔۔"

"ارے نہیں بابا جان! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" عمر فوراً" بولا۔ عمر کی طرف دیکھتے ہوئے مرینہ کی نظر پہلی بار ایبک پر پڑی تھی۔

"ارے ایبک بھائی! آپ۔ مجھے آپ کا کتنا انتظار رہتا ہے اور جب آپ آتے ہیں تو پتا ہی نہیں چلتا اور اگر پتا چل بھی جائے تو آپ کو جانا ہوتا ہے یا مجھے کوئی کام ہوتا ہے۔ مجھے آپ سے اپنی ایک فرینڈ کا مسئلہ ڈسکس کرنا تھا اور مجھے اس کے لیے مشورہ بھی چاہیے تھا۔ دراصل وہ بھی ایک چھوٹی موٹی کہانی نگار ہے اور اسے۔۔۔"

"فار گاڈ سیک رینا آپی! کبھی اپنی گفتگو میں کومے اور فل اسٹاپ بھی لگا لیا کریں۔ یقیناً پنکچویشن کا کوئسچن تو آپ غلط ہی کرتی ہوں گی اسکول میں۔"

وہ حسب معمول تیزی سے بول رہی تھی کہ عمر نے اسے ٹوک دیا۔ اس نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی۔

"ویسے آپ کہاں جا رہی ہیں اس وقت؟" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی عمر نے پوچھ لیا۔

اس نے اپنے کندھے پر لٹکے بیگ کو درست کیا اور عبدالرحمٰن شاہ کی طرف دیکھا۔

"بابا جان! مجھے سمیرا کی طرف جانا ہے۔ اس کے ہاسٹل۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ صبح میں نے کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلو، لیکن اس نے منع کر دیا۔ اب اس کی روم میٹ بھی چلی گئی ہے اور اسے ٹمپریچر ہے۔ میں نے ابھی فون کیا تو پتا چلا کہ اس کا بخار تیز ہو گیا ہے۔ اس وقت یاسین گھر پر نہیں ہے۔ بابا جان! آپ عمر سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔" وہ بغیر رکے بولے جا رہی تھی۔

"میں چھوڑ آتا ہوں۔" ہمدان ایک دم کھڑا ہو گیا تو ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بابا جان! میں شام تک رہوں گی اس کے پاس۔ اریب فاطمہ کو بھی ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ شام کو یاسین کو بھیج دیجیے گا۔ ہمیں لے آئے گا۔"

"تو بیٹا! آپ سمیرا کو گھر لے آئیں۔ زیادہ طبیعت خراب ہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ رات کو اس کی طبیعت زیادہ بھی خراب ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بابا جان! لیکن پتا نہیں، وہ آئے گی بھی یا نہیں۔ وہ تو بس ایک ہی ٹریک پر ناک کی سیدھ میں چل رہی ہے۔ وہ کہتی ہے، اس کے ابو نے کہا تھا اسے ہمیشہ سیدھا چلنا ہے۔ ادھر ادھر نہیں دیکھنا۔ تو۔۔۔"

"لیکن کبھی کبھی سیدھا چلتے چلتے آگے سے راستہ بند بھی ملتا ہے تو پھر تھوڑا سا مڑنا پڑتا ہے۔ اسے سمجھانا۔" ہمدان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو مرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں! لیکن وہ کہتی ہے، نہ اسے ادھر ادھر دیکھنا ہے۔ نہ کہیں ٹھہرنا اور رکنا ہے۔" اپنی عینک درست کرتے ہوئے اس نے سب کی طرف دیکھا، جو بہت خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔ اسے لگا، جیسے اس نے کہیں کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔ گھبرا کر اس نے سب کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے بابا جان! میں چلتی ہوں۔"

"اللہ حافظ بیٹا!" وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو ایبک بھی کھڑا ہو گیا۔

"بابا جان! میں بھی چلوں گا اب۔ ایک، دو کام تھے۔" وہ عبدالرحمٰن شاہ کے سامنے جھکا تو انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"بیٹا! اب کے آنا تو میرے بچوں کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ اتنے سے دنوں میں ہی اداس ہو گیا ہوں۔ اتنے سالوں کی پیاس اتنی جلدی تو نہیں بجھتی۔"

عمر نے ہمیشہ کی طرح اس کے جلدی چلے جانے پر احتجاج کیا اور ہمیشہ کی طرح اس نے پھر جلد آنے کا وعدہ کیا اور تیزی سے ہمدان کے پیچھے لپکا۔

"سنو ہومی! میں بھی جا رہا ہوں۔ راستے میں انہیں ڈراپ کرتا جاؤں گا۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ہمدان نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا وہ اس کی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔

"مجھے بھی کام سے جانا تھا۔"

"بہت کٹھن منزل ہے بھائی! وہ ناک کی سیدھ میں چل رہی ہے اور تم سائیڈ پر کھڑے ہو۔ نظر نہیں آؤ گے۔"

"تو میں سائیڈ سے ہٹ کر سامنے جا کھڑا ہوں گا۔ بے فکر رہو۔" ہمدان کی آنکھیں اور لہجہ پُریقین تھا۔

تب ہی اریب فاطمہ منیبہ کے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ نگاہیں جھکائے بیگ کی زپ بند کر رہی تھی۔ اس نے وہی سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ سیاہ چادر پر لگے ننھے ننھے شیشے دمک رہے تھے اور اس سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹا اس کا چہرہ آج ہمیشہ سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

"تھینک یو!" قریب آنے پر ایبک نے دھیرے سے کہا۔ اریب فاطمہ نے نظریں اٹھائیں اور اس کے رخساروں پر شفق اتر آئی۔

مرینہ، ہمدان کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی جارہی تھی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے اس کے پیچھے تھے۔ فرسٹ فلور کی پہلی سیڑھی پر کھڑی ہوئی رابیل نے ریلنگ پر ہاتھ رکھے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پتا نہیں کیوں اسے لگا، جیسے اس کا دل ڈوب گیا ہو۔ جیسے کسی نے اس کی قیمتی چیز چھین لی ہو۔

وہ عجیب سے احساسات میں گھری کھڑی تھی۔ جب عمر باباجان کے کمرے سے باہر نکلا اور رابیل کو کھڑے دیکھ کر دو، دو سیڑھیاں پھلانگتا اس کے قریب آیا۔

"ایبک بھائی آئے ہوئے تھے۔ باباجان کے کمرے میں تھے۔" خوشی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ وہ ایبک کے آنے پر ہمیشہ ایسے ہی خوش ہوتا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔" رابیل نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ لیکن اندر کہیں نمی پھیلتی جارہی تھی۔

"تو آپ نیچے کیوں نہیں آئیں ان سے ملنے؟ اب تو آپ کو ان سے خفا نہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے آپ کو خون بھی دیا ہے۔"

"یہ بات تم مجھے ایک ہزار ایک سو بارہ مرتبہ بتا چکے ہو عمر۔ اس نے مجھے خون دیا ہے... تو میں کیا کروں، کیسے چکاؤں اس کے اس احسان کا بدلہ؟" اس کی آواز ایک دم بلند ہوئی تھی۔ اپنے کمرے سے باہر آتے عبدالرحمٰن شاہ ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

"اگر ممکن ہوتا تو میں اس کا یہ ایک بوتل خون اپنے جسم سے نکال کر اس کے منہ پر مارتی۔ کیا سارے بلڈ بینک دیوالیہ ہوگئے تھے کہ میرے لیے اس سے خون کی بھیک مانگنی پڑی تمہیں۔ آئندہ مجھے مت بتانا، سمجھے؟" اس نے ریلنگ سے اپنا ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے گویا اسے تنبیہ کی اور ایک دم تیزی سے مڑ گئی۔

عمر سیڑھیوں پر کھڑا ہکا بکا سا اسے جاتے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جارہی تھی۔ اس نے رابیل کا یہ انداز پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ شاید غلطی میری ہی ہے۔ مجھے اس طرح بار بار رابیل آپی سے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو ہی الزام ٹھہرایا تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا؟ اسے ایبک شاہ کی ہر اچھی بات کو دہرانے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا اور سر جھکائے لاؤنج میں سے ہوتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور اوپر والے لاؤنج میں عبدالرحمٰن شاہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

یہ مائرہ نے کیا کیا۔ اپنے دل میں عمارہ اور موی کے لیے موجود نفرت رابیل کے دل میں بھردی۔ جبکہ وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔ جب سے منیبہ نے انہیں بتایا تھا کہ رابی ہمدان سے شادی نہیں کرنا چاہتی اور ہمدان بھی اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہے تو رہ رہ کر انہیں ایبک کا خیال آتا تھا مگر رابیل اپنے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت رکھتی تھی۔

یہ دل پتا نہیں اتنا خوش گمان کیوں ہوتا ہے۔ وہ تو احسان شاہ سے بھی امید لگا بیٹھے تھے کہ ایک روز اس کا دل موی کی طرف سے بالکل صاف ہوجائے گا۔

اس روز جب احسان شاہ نے اسپتال میں طویل بے ہوشی کے بعد آنکھیں کھولی تھیں تو وہ احسان شاہ کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے رو پڑے تھے۔

"یہ کیا کرلیا تم نے خود کو۔ ایسا مت کرو احسان شاہ! میں تمہارا دکھ برداشت نہیں کرپاؤں گا۔"

احسان شاہ نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

"میں عمو سے نہیں ملوں گا۔ نہیں جاؤں گا اس کے گھر۔ تم ناراض مت ہو شانی!" آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ "میں یہ سوچ کر دل کو خوش کرلوں گا کہ میری عمو زندہ ہے۔ انہی فضاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ آخر چھبیس سال سے اسے دیکھے بغیر زندہ ہی ہوں پھر بھی... مجھے معاف کردو شانی۔ تم بھی باپ ہو۔ باپ کے دل کی..."

"باباجان!" احسان شاہ نے تڑپ کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ "میں ناراض نہیں ہوں آپ سے۔ کسی سے بھی نہیں۔ آپ نے صحیح کہا تھا باباجان! عمو بھی آپ کی ایسی ہی بیٹی ہے جیسی میری بیٹی رابی ہے۔ میں

نے ان چند گھنٹوں میں جو میں نے ایرپورٹ گزارے، اس اذیت کو محسوس کرلیا، جو آپ اتنے سالوں سے برداشت کررہے ہیں۔ آپ مجھے معاف کردیجیے بابا جان!"

انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور عبدالرحمٰن شاہ نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے چوم لیا تھا۔

"میں نے اپنی قسم توڑ دی۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گا۔ میں کسی کو عمارہ یا اس کے میاں سے ملنے سے نہیں روکوں گا۔ لیکن باباجان پلیز! آپ مجھے مجبور مت کیجیے گا۔"

اور اس روز اسپتال کے اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے عبدالرحمٰن شاہ کو لگا تھا، جیسے ان کے دل پر جو ایک بوجھ سا دھرا تھا وہ ہٹ گیا ہے اور اس روز وہ دل میں امیدوں کے پودے بھی اگا بیٹھے تھے جن پر نت نئے رنگوں کے پھول کھلتے تھے۔ لیکن آج جیسے ان پھولوں کے رنگ مدھم پڑگئے تھے۔

مائرہ نے اتنی نفرت بھردی ہے رابی کے دل میں وہ جو سمجھتے تھے کہ کسی روز جب احسان شاہ کی طبیعت ٹھیک ہوجائے گی تو وہ اسے پاس بٹھا کر ہولے ہولے سب کہہ دیں گے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ شاید وہ یقین نہ کرے۔ شاید وہ یہ سب موی کی من گھڑت کہانی سمجھے۔

اور اگر اس نے یقین کرلیا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ مائرہ اس کی بیوی تھی۔ کوئی غیر نہیں کہ وہ آرام و سکون سے سب سنتا اور برداشت کرلیتا۔

پتے وہ کیا سوچتے اور پھر اب وہ دل کا مریض تھا۔

سو وہ چپ تھے۔ فی الحال انہوں نے دل کو صرف اتنی سی بات پر ہی راضی کرلیا تھا کہ اسے اب ان کے عمارہ وغیرہ سے ملنے پر اعتراض نہیں تھا۔ شاید کچھ ایسا ہوجائے خود ہی کہ شانی کی غلط فہمی دور ہوجائے اور موی اس احساس جرم سے نجات پالے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی بے چینی اور تڑپ دیکھی تھی۔

"باباجان اب تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ جب میں مروں تو مجھے رونے والوں میں شانی بھی ہو۔ جب آخری بار میں کسی کو دیکھوں تو وہ شانی ہو اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے وہ بدگمانی نہ ہو۔ وہ نفرت نہ ہو جو اس رات میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی اور جب میری آنکھیں بند ہوجائیں ہمیشہ کے لیے تو سب سے زیادہ مجھے وہ روئے۔ پتا نہیں شاید میں اسی لیے اب تک زندہ ہوں۔ ورنہ اس رات وہ تو اپنی دانست میں مجھے مار کر پھینک گئے تھے۔"

"باباجان! آپ تیار ہیں۔" انہوں نے چونک کر دیکھا۔ مصطفیٰ شاہ جانے کب لاؤنج میں آئے تھے اور ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"ہاں میں تیار ہوں، کب چلنا ہے؟"

"بس چلتے ہیں۔ ایک فون کرنا تھا مجھے فرنیچر والے کو۔" وہ عبدالرحمٰن شاہ کو بتا کر فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ تب ہی احسان شاہ اپنے کمرے سے نکلے اور عبدالرحمٰن شاہ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

"ٹھیک ہوں باباجان! آپ کہیں جارہے ہیں کیا؟" انہوں نے ان کی اسٹک دیکھ کر پوچھا۔ گھر میں وہ اسٹک استعمال نہیں کرتے تھے۔

"بس یہ مصطفیٰ کے ساتھ ملک ہاؤس تک جارہا ہوں۔ مصطفیٰ کہہ رہا تھا رنگ و روغن ہوگیا ہے۔ گھر فرنشڈ بھی کروادیا ہے اس نے۔ کہہ رہا تھا میں بھی دیکھ لوں۔ کوئی کمی بیشی ہو تو۔ ہفتے بعد عثمان اور بہو بھی آرہے ہیں۔ عمارہ سے بھی کہوں گا۔ وہ بھی آجائے۔"

انہوں نے دانستہ فلک شاہ کا نام نہیں لیا تھا۔ احسان شاہ خاموش رہے۔ لیکن عبدالرحمٰن شاہ کو لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

"کیا بات ہے شانی بیٹا! کچھ کہنا ہے؟"

"وہ باباجان!" وہ جیسے جھجک کر پھر خاموش ہوگئے۔ تب ہی مصطفیٰ نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے عبدالرحمٰن شاہ کی طرف دیکھا۔

"چلیں باباجان!"

عبدالرحمٰن شاہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ایک قدم چلنے کے بعد مڑ کر احسان شاہ کو دیکھا۔ "تم بھی چلو گے بیٹا!"

احسان شاہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بابا جان میں نے سوچا ہے کہ دونوں گھروں کے درمیان ایک چھوٹا دروازہ رکھوا دیتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر آنے جانے میں آسانی رہے گی۔" مصطفیٰ شاہ نے قریب آکر کہا۔

"ہاں' یہ اچھا سوچا ہے تم نے۔" عبدالرحمٰن شاہ خوش ہوگئے۔ "لان کی دیوار میں سے دروازہ رکھوا دو اور ہاں! تم نے وہ فرش برابر کروایا۔ موی کو آسانی رہے گی۔"

"جی بابا جان!" وہ لاؤنج کے دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ احسان شاہ نے انہیں آواز دی۔

"بابا جان پلیز! ایک منٹ' میری بات سن لیں۔" انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ احسان شاہ مضطرب سے اپنی انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ مصطفیٰ شاہ لاؤنج سے نکل گئے تھے اور عبدالرحمٰن شاہ کا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا۔ وہ جسم کا پورا زور اپنی اسٹک پر ڈالتے ہوئے واپس مڑے اور سوالیہ نظروں سے احسان شاہ کو دیکھنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے بکنگ کروادی ہے۔ سنڈے چار بجے شام کی فلائٹ ہے۔" ایبک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بتایا تو عمارہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ فلک شاہ بیڈ پر نیم دراز تھے اور عمارہ وارڈ روب کھولے کھڑی تھیں۔ ایبک فلک شاہ کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

"بابا! پہلے انکل شیر دل کے گھر جائیں گے اور پھر بعد میں بابا جان کی طرف چلیں گے۔ انہوں نے ملک ہاؤس خرید کر فرنشڈ کروادیا ہے۔ ویسے انکل شیر دل بہت ایکسائٹڈ ہو رہے ہیں آپ کے آنے کا سن کر۔"

"ہاں شیر دل بہت اچھا انسان ہے۔ میرا محسن ہے وہ۔ ہمیشہ اس کی عزّت کرنا میرے بعد بھی۔ میں نہ رہوں تب بھی اگر شیر دل کو۔"

"موی پلیز! مت کیا کریں ایسی باتیں۔" عمارہ نے یک دم کہا اور پھر ایبک کی طرف دیکھا۔

"ایبک! دیکھو اپنے بابا کو سمجھاؤ۔ یہ بہت جذباتی ہو رہے ہیں اور پچھلے دو ہفتوں سے ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں۔ جب سے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہے تب سے جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے ہم لاہور نہ جائیں۔" ایبک نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ عمارہ ناراضی سے فلک شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"سوری عمو! اس عمر میں بندہ ایسا ہی ہو جاتا ہے قنوطی۔" فلک شاہ نے معذرت طلب نظروں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ "اور ویسے بھی اب ہماری عمر جانے کی تو ہے' بہت جی لیے۔" اور عمارہ احتجاجاً" باہر نکل گئیں۔

"تمہاری ماما ناراض ہو گئیں ایبک!" وہ ذرا سا مسکرائے۔ ایبک نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"کیا آپ کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے۔"

"نہیں۔۔۔" فلک شاہ نے نظریں چرائیں۔ انہوں نے مائرہ سے تو کہہ دیا تھا کہ وہ جو جی چاہے کرلے انہیں پروا نہیں ہے۔ لیکن شدید کوشش کے باوجود وہ اس کی باتوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں سکے تھے۔ وہ شاید اندر سے کمزور ہو چکے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں مدتوں بعد جڑنے والے رشتے پھر نہ ٹوٹ جائیں۔ مائرہ نے دوبارہ فون کر کے تنبیہہ کی تھی۔

"موی شاہ! اسے محض دھمکی مت سمجھنا۔ میں اور احسان زندگی میں دوبارہ تمہیں دیکھنا نہیں چاہتے۔ بابا جان تم سے اور عمارہ سے ملنے بہاول پور چلے گئے۔ مصطفیٰ سے بھی مل لیے' تم اسے ہی غنیمت سمجھو اور زیادہ پیر مت پھیلانا۔ نفرت ہے' ہمیں تم سے اور تمہارے خاندان سے۔ ہم تمہیں دیکھنے یا تم سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے۔"

"ٹھیک ہے مائرہ شاہ! مجھے بھی کبھی تمہیں دیکھنے کی خواہش نہ تھی۔ سو تم خود مت آنا میرے سامنے۔"

انہوں نے بے حد پرسکون انداز میں بات کی تھی۔ لیکن بعد میں بے سکون ہو گئے تھے۔

"بابا۔ کوئی بات تو ہے۔ میں بھی ایک ہفتے سے آپ کو الجھا ہوا اور پریشان دیکھ رہا ہوں۔"

فلک شاہ نے نظریں اٹھائیں اور کچھ دیر ایبک فلک شاہ کو دیکھتے رہے اور پھر ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ اب ایبک سے کیا چھپا ہوا ہے۔ عمارہ' ایبک سب نے ہی تو جان لیا تھا' ایبک سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے مختصراً" ایبک کو مائرہ کے فون کے متعلق بتا دیا۔ ایبک کو حیرت ہوئی۔

"بعض لوگ بڑے منتقم مزاج ہوتے ہیں آپی! اور مائرہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ میں اپنے لیے تمہارے اور عمارہ کے لیے ڈرتا ہوں۔ میرے دل میں کئی طرح کے خوف ہیں۔ عمارہ اپ سیٹ ہو گئی تو؟ انجی وہاں جا کر ڈس ہارٹ ہوئی تو؟ وہ کتنے شوق سے تیاری کر رہی ہے وہاں جانے کی۔ وہ پہلی بار اپنے ننھیالی رشتہ داروں کو دیکھے گی۔ نہیں ایبک! ایسا کرو سیٹیں کینسل کروادو۔ ہم نہیں جائیں گے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابا! وہاں سب اتنے شوق سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ عثمان انکل بھی کل پہنچ گئے ہوں گے۔"

"آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں بابا! میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔"

فلک شاہ مسکرائے۔ "اوکے یار! نہیں ہوتا پریشان۔ یہ بتاؤ یہ تمہاری ماما کیا کہہ رہی تھیں۔ کوئی لڑکی پسند کر بیٹھے ہو۔"

"جی بابا! ایک لڑکی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ لاہور تو جا ہی رہے ہیں' کیوں نہ عادل کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی سے نپٹ لیں۔ زندگی میں تمہاری بھی خوشی دیکھ لیں۔"

"ابھی نہیں بابا! ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔"

"اوہ یار! وہ ہے کون؟" فلک شاہ کا ذہن ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"اریب فاطمہ۔۔۔ اریب فاطمہ نام ہے اس کا۔ مروہ آنٹی کی سسرالی عزیز ہے۔ الریان میں پڑھنے کی غرض سے ٹھہری ہوئی ہے"۔

"اوہ! یہ تم سے بھی مروہ پھپھو کے سسرالی عزیز آ ٹکرائے۔" ان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"بابا جان! وہ بہت مختلف ہے۔ مائرہ آنٹی جیسی نہیں ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" فلک شاہ سنجیدہ ہوئے۔ "تمہاری پسند کبھی مائرہ جیسی لڑکی نہیں ہو سکتی۔"

ایبک مڑ کر عمارہ کو دیکھنے لگا' جو ٹرے میں جوس کے گلاس لیے اندر آرہی تھیں۔ ایبک نے اٹھ کر ٹرے ان سے لے لی اور ٹیبل پر رکھی اور پھر فلک شاہ کو ایک گلاس پکڑایا۔ عمارہ بھی بیٹھ گئی تھیں۔

"فریش جوس نکلوایا ہے' صبح وقار خان مالٹوں کا ٹوکرا دے گیا تھا۔ اور ایبک! تم اتنے کمزور لگ رہے ہو' آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔" ایبک سے گلاس لیتے ہوئے انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

"یہ حلقے تو نیند کی کمی کی وجہ سے ہیں۔" ایبک اپنا گلاس اٹھا کر پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"نیند کی کمی کیوں؟" عمارہ نے پوچھا۔

"بس دیر تک لکھتا رہتا ہوں' وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

"شیر دل کہہ رہا تھا کہ تم آج کل بہت سخت لکھ رہے ہو۔ بیٹا! قلم سنبھال کر لکھو۔ بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ تم ہمارا واحد سرمایہ ہو۔"

"بابا۔۔۔ کیسے روکتا ہوں خود کو' آپ نہیں جانتے۔ کتنا ضبط کرتا ہوں۔ لکھ کر کاٹتا ہوں صرف آپ کے خیال سے۔۔۔ ماما کے ساتھ کیے گئے وعدے کی وجہ سے۔ ورنہ بہت دل چاہتا ہے کہ کھل کر لکھوں' بہت سارا لکھوں۔ پچھلے سال جب ڈاکٹر قدیر خان کو ٹی وی پر لایا گیا تھا اور ان سے وہ سب کہلوایا گیا تھا تو میرا دل خون کے آنسو رویا تھا۔ لیکن میں وہ نہیں لکھ سکا جو لکھنا چاہتا تھا۔ میرا قلم اس رات لہو رویا تھا۔۔۔ ہم نے اپنے محسن کے ساتھ جو کچھ کیا بابا۔۔۔ کیا قومیں اپنے

محسنوں سے ایسا ہی کرتی ہیں۔ فروری 2004ء تھا اور آج 2005ء ہے۔ تب سے لے کر اب تک میں خود سے نظر نہیں ملا پایا۔" وہ یک دم جذباتی ہو گیا تھا۔

"میں قلم کی حرمت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ میں آج ایک سال بعد بھی رات کو بستر پر لیٹتا ہوں تو شرمندہ ہوتا ہوں۔ نہ میں نے کچھ لکھا' نہ میں کسی ریلی کا حصہ بنا۔ بابا میں تو بہت کمزور انسان ہوں۔

جون 2004ء میں ڈرون حملے شروع ہوئے' میں نے ان کے خلاف دو' تین پھس پھسے اور بودے لفظ لکھ دیے ہیں۔ یہ میرا ملک ہے بابا... لیکن میں اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتا۔ چند لوگوں نے اسے یرغمال بنا رکھا ہے۔" فلک شاہ نے اس کا بازو تھپتھپایا۔

"آپ کا دل بھی تو دکھتا تھا اس ملک کے لیے۔ جب یہ دولخت ہوا تو آپ بھی تو سڑکوں پر نکلے تھے نا۔ آپ بھی تو ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے تھے۔"

"ہاں... لیکن کچھ نہ کر سکے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "مجھے ہمیشہ کے لیے معذوری مل گئی۔ حق نواز جان سے گیا اور اس جیسے کتنے تھے جنہوں نے ملک کی تقدیر بدلنے کی کوشش کی اور جانیں گنوائیں۔ اب وہ لوگ نہیں رہے' ایک شاہ... مخلص' محب وطن قائداعظم' لیاقت علی خان' خواجہ ناظم الدین اور عبدالرب نشتر جیسے لوگ نہیں رہے۔ اب تو لالچی' بھوکے انسان ہیں۔ جو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اس ملک کو۔ ایک ہمارے سیاست دان ٹھیک ہو جائیں تو شاید سب ٹھیک ہو جائے۔"

"صرف ہمارے سیاست دان نہیں بابا... ہم خود بھی ٹھیک نہیں ہیں۔" ایبک نے دل گرفتی سے کہا۔ "ہم ٹھیک ہو جائیں تو ہمارا سیاست دان بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکوؤں کا سردار ڈاکو ہوتا ہے۔ چوروں کا چور ہوتا ہے۔ پرہیزگار لوگوں کا سردار کوئی پرہیزگار شخص ہی ہوتا ہے' تو ہمارے سردار بھی ہمارے جیسے ہی ہیں اور ہم خود کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں دوسرے بدل جائیں۔ ہم ایسے ہی رہیں گے جیسے ہیں۔"

"ارے!" فلک شاہ کی نظر سامنے کلاک پر پڑی تھی۔ "سمیرا تو پروگرام شروع ہو چکا ہوگا۔ میں اسے کبھی مس نہیں کرتا' ٹی وی تو لگانا۔"

"کون سا پروگرام بابا؟"

"احمد حسن کا "کروا سچ" ایک نیا چینل لانچ کیا ہے کسی نے "سیمل" وہاں آتا ہے یہ پروگرام۔" عمارہ نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔

"رات کے کھانے کے لیے کیا بنواؤں۔" باہر جاتے جاتے انہوں نے مڑ کر پوچھا۔

"کچھ بھی بنوا لیں ماما!" ایبک ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹی وی پر احمد حسن اپنے کچھ مہمانوں کا تعارف کروا رہا تھا۔

"یہ احمد حسن ہے' تم نے کبھی اس کا پروگرام دیکھا یا ملے اس سے؟"

فلک شاہ نے پوچھا تو ایبک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"لاہور میں ہی رہتا ہے اور سنا ہے کافی مقبول ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس کی گفتگو سے متاثر ہوتا ہوں۔ اس ملک کو ایسے ہی بے باک اور کھرے جوانوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی لوگ ملکوں کی تقدیر رقم کرتے ہیں۔"

ایبک نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بہت دھیان سے احمد حسن کی بات سن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سمیرا نے لیپ ٹاپ آف کر کے زبیدہ اور حسن رضا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں اس پر تھیں۔

"کون ہے' کہاں سے آیا ہے' کیا پتا چلا اس کے متعلق۔" اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر زبیدہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"پاکستانی نژاد امریکن ہے۔ ماں اسپینش اور باپ پاکستانی ہے۔ یہی لکھا ہے۔ اس کا ایک انٹرویو کسی نے ڈاؤن لوڈ کیا ہوا ہے۔ اس میں اس نے بتایا ہے خود۔ شکل سے بھی غیر ملکی لگتا ہے۔ امی! آپ نے بتایا

نہیں کیوں اسے رضی سمجھ لیا۔"

سمیرا نے آہستگی سے کہا۔ حالانکہ خود اسے بھی یہی لگا تھا۔ جب اس نے احمد حسن کی تصویر نیٹ پر دیکھی تھی اس کے انٹرویو والے پیج پر۔

"تو ہمارا رضی بھی تو غیر ملکی ہی لگتا تھا۔ جب چھوٹا سا تھا تو سب کہتے تھے زبیدہ تمہارا بیٹا تو بالکل انگریز لگتا ہے۔ کیوں حسن صاحب یاد ہے نا آپ کو؟"

حسن رضا نے جو بالکل خاموش بیٹھے تھے' سر ہلا دیا۔ وہ اس سارے عرصے میں کچھ نہیں بولے تھے۔ سمیرا آج شام ہی راولپنڈی آئی تھی اور ابھی اسے آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ زبیدہ بڑے جوش و خروش سے اسے احمد حسن کے متعلق بتانے لگی تھیں۔

"تم نے دیکھا ہے اس کا پروگرام؟"

"نہیں امی! میری پڑھائی اتنی ٹف ہے کہ مجھے ٹی وی وغیرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن میں نے سنا ضرور ہے اس کے متعلق۔ طلبا اکثر اس کے متعلق بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے کالج میں کافی لڑکے لڑکیاں اس کے فین ہیں۔"

"ہاں ضرور ہوں گے فین' لیکن اصل بات جو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ وہ ہمارا احمد رضا ہے۔ احمد حسن نہیں ہے۔"

سمیرا نے بے اختیار حسن رضا کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تمہارے ابا نہیں مانتے سمو! لیکن وہ میرا رضی ہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے وہ رضی ہے۔" زبیدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ابھی آج شام کو بھی اس کا پروگرام آئے گا' پھر تم بتانا' تمہیں میری بات پر یقین آ جائے گا۔"

سمیرا بار بار حسن رضا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑ رہے تھے۔

"ابو! آپ نے دیکھا ہے احمد حسن کا پروگرام۔"

"تمہاری امی کے کہنے پر ایک بار۔"

"پھر...؟" سمیرا کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"وہ بالکل رضی کی طرح لگتا ہے' لیکن وہ رضی نہیں ہے' مجھے اس کا یقین ہے' لیکن تمہاری ماں سمجھتی نہیں ہیں میری بات۔"

"آپ اس سے مل لیتے ابو! کیا پتا۔" سمیرا کے لہجے سے امید جھلک رہی تھی۔

"کیا کرتا مل کر بیٹا!" احمد رضا کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔ "جبکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں' وہ رضی نہیں ہے۔"

سمیرا لمحہ بھر انہیں دیکھتی رہی۔ لیکن سمیرا کی نظروں سے نظریں ملتے ہی انہوں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ کسی خیال کے تحت اس نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس کی روم میٹ نے اسے کہا تھا کہ احمد حسن کے پروگرام نیٹ پر بھی موجود ہیں اور یہ کہ اس کی پوری لائف ہسٹری وہاں موجود ہے۔ اگر کوئی جاننا چاہے تو۔

وہ احمد حسن کی بہت بڑی فین تھی بلکہ ایک' دو بار اس نے سمیرا سے بھی کہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلے۔ ہر سنڈے کو وہاں طلبا اور دوسرے نوجوان لڑکوں کا خاصا بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ ایک بار پھر لیپ ٹاپ کھولے سرچ کر رہی تھی۔ لیکن کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے اپنی ساری تعلیم امریکہ میں حاصل کی۔ ابھی اس نے گریجویشن کیا تھا کہ امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ ہو گیا اور امریکہ نے افغانستان پر چڑھائی کر دی تو احمد حسن نے سوچا کہ اسے اپنے باپ کے ملک میں جانا چاہیے۔ وہ اپنے وطن پاکستان اور اسلام کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی پرورش اس کے باپ نے کی تھی۔ جبکہ اس کی اسپینش ماں اس کی کم عمری میں ہی اسے چھوڑ گئی تھی۔

"سمو... سمو! آ جاؤ... دیکھو پروگرام شروع ہو گیا ہے۔" زبیدہ کی آواز آئی۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور حسن رضا کی طرف دیکھا' جو کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گئے تھے۔

"ابو! آپ دیکھیں گے یہ پروگرام۔"

"نہیں۔۔۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ لیپ ٹاپ وہیں چھوڑ کر باہر لاؤنج میں آگئی۔ حسن رضا نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور ان کی بند آنکھوں میں نمی پھیلتی جارہی تھی۔ زبیدہ کو وہ ٹال سکتے تھے لیکن سمیرا کو نہیں۔ وہ ضرور احمد حسن سے ملنے کی ضد کرے گی۔ وہ یوں ہی آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔ شاید آدھا گھنٹہ یا پھر ایک گھنٹہ۔ بند آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی تھی۔

جب احمد رضا پیدا ہوا! جب اس نے پہلی بار اماں کہا۔ جب اس نے پہلا قدم اٹھایا۔ پھر دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ سمیرا تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سرخی تھی اور آنکھیں کوئی راز جان لینے کے انداز میں چمک رہی تھیں۔

"ابو! کیا آپ نے کبھی یہ پروگرام دیکھا؟"

"ایک بار زبیدہ نے بتایا تھا تو تھوڑا سا دیکھا تھا۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا تو ہے۔"

"ابو! آپ پورا پروگرام دیکھیں۔ رات میں پھر ریپیٹ ہوگا۔"

"اس سے کیا ہوگا سمیرا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ احمد رضا نہیں ہے۔"

"وہ ہو سکتا ہے ابو! بات کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں ایسا لگنے لگتا ہے کہ وہ رضی ہی ہے۔ اس کی صرف شکل ہی نہیں ملتی رضی سے۔ بلکہ اس کی کئی حرکات بھی ملتی ہیں اس سے۔ بات کرتے ہوئے سوچ کے وقفے کے دوران بالوں میں بایاں ہاتھ پھیرنا اور۔۔۔۔"

"سمیرا! وہ رضی نہیں ہے، وہ کبھی بھی رضی نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنے یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں ابو!" سمیرا نے بہت گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے سٹپٹا کر نگاہیں جھکالی تھیں۔

"یہ بات تو اتنے یقین سے صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو جانتا ہو کہ رضی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

آج کئی سالوں بعد اسے پھر گمان گزرا تھا کہ کہیں حسن رضا نے اسے مار تو نہیں دیا۔

"ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔"

"ابو۔۔۔!" سمیرا کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور آواز بلند تھی۔

"آپ بھلا ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ احمد رضا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

حسن رضا بیڈ سے اترے اور انہوں نے دروازہ لاک کردیا اور پھر اپنے والٹ سے اخبار کا وہ پرانا ٹکڑا نکالا اور سمیرا کی طرف بڑھایا۔ سمیرا اسی طرح ساکت بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ خبر میں نے اس روز دیکھی تھی جب تمہیں ہاسٹل چھوڑ کر واپس آرہا تھا۔" انہوں نے رک رک کر بات مکمل کی۔

وہ رخ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔ جیسے خبر پڑھتے ہوئے وہ سمیرا کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھنا چاہتے ہوں۔ اخبار کا ٹکڑا انہوں نے بیڈ پر رکھ دیا تھا۔ سمیرا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور پھر یک دم پیچھے کرلیا۔ کچھ دیر وہ خوف زدہ نظروں سے اخبار کے اس ٹکڑے کو دیکھتی رہی۔ پھر دل کڑا کرکے اسے اٹھالیا۔ بہت دیر بعد احمد رضا نے اپنا رخ پھیرا۔ سمیرا کے ہاتھ میں اخبار کا ٹکڑا تھا۔ لیکن نہ وہ رو رہی تھی نہ چیخ رہی تھی۔ بس خالی خالی ویران نظروں سے اخبار کے اس ٹکڑے کو دیکھ رہی تھی۔

"سمیرا۔۔۔" احمد رضا کے لبوں سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ سمیرا نے نگاہیں اٹھائیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں۔۔۔۔" اس کی آواز سرگوشی کی طرح اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ "یہ جھوٹ ہے غلط ہے۔"

"دو سال پہلے۔۔۔۔" انہوں نے سمیرا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اسے اپنے ساتھ لپٹائے حسن رضا

ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

"دو سال۔۔۔ دو سال سے یہ بوجھ دل پر اٹھائے پھر رہا ہوں۔۔۔ میری ہمت نہیں پڑی زبیدہ سے کچھ کہنے کی۔۔۔ میں اس کی امید توڑنا نہیں چاہتا۔ یہ امید ہی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میں تمہیں بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں تمہاری امید بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ لیکن تم۔۔۔ بیٹا تم بدگمان ہو رہی تھیں۔"

"ابو۔۔۔!" سمیرا اور زور سے رونے لگی۔

"سوری۔" بہت دیر وہ یوں ہی روتی رہی اور حسن رضا ہولے ہولے اسے تھپکتے رہے۔ پھر ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے حسن رضا کی طرف دیکھا۔

"ابو! یہ جھوٹی خبر بھی تو ہو سکتی ہے نا۔ کیا پتا ان لوگوں نے جھوٹی خبر چھپوادی ہو' تاکہ ہم اسے ڈھونڈیں نہ۔"

"کون لوگ سمیرا۔ اس کذاب کو تو کسی نے مار دیا تھا۔ پھر نام نہیں سنا اس کے پیروکاروں کا۔" "اس کے ماننے والے ہوں گے تو سہی' کیا پتا۔" وہ اپنے دل سے اس کے واپس آنے کی امید ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"شاید۔۔۔" حسن رضا اخبار کا وہ ٹکڑا والٹ میں رکھ رہے تھے۔ سمیرا کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس خبر کو سنبھال کر مت رکھیں۔ پھاڑ کر پھینک دیں۔ یہ جھوٹی خبر ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حسن رضا کو دیکھتی رہی۔

تب ہی باہر سے زبیدہ انہیں پکارتی ہوئی اندر آئیں۔

"آجائیں کھانا تیار ہو گیا ہے۔" انہوں نے سمیرا کے روئے روئے چہرے اور بھیگی پلکوں کو دیکھا اور پھر حسن رضا کی طرف

"جلدی آجاؤ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ رکی نہیں۔ تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ حسن رضا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تلقین کی کہ وہ زبیدہ کو کچھ نہ بتائے پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں آئے۔ جہاں ایک طرف کونے میں ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر پلیٹیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ سمیرا کچن کی طرف چلی گئی۔ زبیدہ کھانا نکال رہی تھیں۔

"امی! آپ چلیں۔۔۔ میں لے آتی ہوں۔"

زبیدہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "یہ سالن میں نے نکال دیا ہے۔ لے جاؤ۔ میں روٹی لے کر آتی ہوں۔"

سمیرا ڈونگا لے کر لاؤنج میں آگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ زبیدہ کے چہرے پر پہلے کی نسبت رونق تھی۔ آنکھوں میں وہ مایوسی کی کیفیت نہ تھی' جو احمد رضا کے جانے کے بعد مستقل ان کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ "تو کیا امی کو احمد حسن کے احمد رضا ہونے کا پورا یقین ہے؟" سمیرا نے سوچا اور ڈونگا میز پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ تینوں نے بہت کم کھایا تھا۔ زبیدہ پہلے اٹھی تھیں

"سمیرا! تم کھا کر برتن سمیٹ دینا۔ میں اب نماز پڑھ کر سو جاؤں گی۔"

"جی امی!" حسن رضا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سمیرا نے دیکھا' ان کی پلیٹ میں روٹی ایسے ہی پڑی تھی۔ انہوں نے صرف دو' تین نوالے لیے تھے ان دو سالوں میں وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور بوڑھے لگنے لگے تھے۔ دو سال سے وہ تنہا اس دکھ پر رو رہے تھے اکیلے۔

ایک گہرا سانس لے کر سمیرا نے برتن سمیٹے اور میز صاف کر کے لاؤنج میں آبیٹھی۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی اپنے موبائل پر تصویریں دیکھتی رہی۔ یہ سب تصویریں اس کی کلاس فیلوز کی تھیں۔ ان میں مرینہ کی بھی تصویر تھی۔

مرینہ اس کی واحد دوست تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ایک سال سینئر تھی۔ لیکن پھر بھی ان کے درمیان دوستی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ کے۔ای میں گئی تھی تو اپ سیٹ رہتی تھی۔ اس پر اس کی روم میٹ بھی عجیب مزاج کی تھی۔ پھر کالج میں ایک دن مرینہ سے ملاقات ہو گئی۔ اسے مرینہ دوسری لڑکیوں سے مختلف لگی تھی۔ سادہ' اپنے آپ میں مگن' مخلص سی لڑکی۔۔۔ لیکن مرینہ کے قریب آنے میں بھی اسے وقت لگا تھا۔ وہ بہت محتاط رہتی تھی۔ اسے دوسروں سے گھلتے ملتے ہوئے خوف آتا تھا۔

احمد رضا کے واقعے نے اسے سہما دیا تھا۔ احمد رضا جس طرح ان کی زندگیوں میں خلا پیدا کر گیا تھا' وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذات کبھی اس کے والدین کے لیے دکھ کا باعث بنے۔ وہ کبھی کسی لڑکی کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ شاپنگ کے لیے بھی بہت کم "مجبوراً" ہی جاتی تھی۔ ورنہ کسی نہ کسی سے اپنی ضرورت کی چیز منگوالیتی تھی۔ مرینہ کے گھر بھی وہ صرف ایک مرتبہ گئی تھی۔ وہ بھی مرینہ نے خود حسن رضا سے اجازت لی تھی۔ حسن رضا یا زبیدہ نے اسے لاہور جاتے ہوئے کچھ خاص نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ خود جانتی تھی کہ اسے یہاں کس طرح رہنا ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس روز بخار کی حالت میں بھی اس نے مرینہ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ مرینہ اریب فاطمہ کے ساتھ اسے لینے آئی تھی۔

"کیا تمہیں ہم پر اعتماد نہیں ہے سمیرا؟" مرینہ بہت افسردہ ہو گئی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے مرینہ! میں تمہارے خلوص کی دل سے قدر دان ہوں۔ لیکن پلیز! اس وقت مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرو۔"

تب مرینہ اسے ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اور ڈاکٹر کو دکھا کر اسے ہاسٹل چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بعد میں اسے افسوس بھی ہوا تھا۔ لیکن شاید اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ مرینہ اس سے خفا ہو گئی ہو گی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اگلے دو روز بھی مرینہ' اریب فاطمہ کے ساتھ اس کے پاس ہاسٹل آئی تھی اور گھر سے اس کے لیے سوپ وغیرہ بھی بنوا کر لائی تھی۔

اریب فاطمہ کو دیکھ کر اسے بار بار احساس ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی کبھی اس سے مل چکی ہے۔ لیکن اریب فاطمہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ پہلی بار لاہور آئی ہے۔ پہلے رحیم یار خان میں تھی۔ رحیم یار خان کا نام سن کر وہ چونکی تھی۔ اس کے اپنے ننھیالی اور ددھیالی عزیز رحیم یار خان' صادق آباد اور اردگرد رہتے تھے۔ آخری بار وہ رحیم یار خان تب گئی تھی۔ جب واپسی پر۔۔۔ اور اس بات کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ کبھی رحیم یار خان نہیں گئی تھی۔ حالانکہ پہلے حسن رضا اپنے عزیزوں کی ہر خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ پھر بھی چچازاد' خالہ زاد دور پار کے رشتہ دار وہ سب کے ساتھ ہی رابطے میں رہتے تھے۔

"ٹن ٹن۔۔۔" کلاک نے گیارہ بجائے تھے۔ اس نے چونک کر پاس پڑا ریموٹ اٹھایا۔ "کڑوا سچ" کا ریپیٹ پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ اس کی نظریں اسکرین پر تھیں۔ ایک' دو اشتہارات کے بعد احمد حسن اسکرین پر نظر آیا۔

"السلام علیکم ناظرین! "کڑوا سچ" پروگرام کے ساتھ احمد حسن حاضر ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور وہ بہت دھیان سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بولتے بولتے اس نے بایاں ہاتھ اونچا کر کے پیشانی پر آنے والے بالوں کو پیچھے کیا اور مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کے اوپر والے دو دانت لمحہ بھر کو نظر آئے اور اس لمحہ بھر کے عرصہ میں سمیرا نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ان سامنے والے دونوں دانتوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا۔ احمد رضا کے بھی اوپر والے دو دانتوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا اور اس کی مسکراہٹ بھی اتنی ہی خوب صورت تھی جتنی احمد حسن کی۔

"تو ناظرین! ہمیں اب فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں امریکا کی غلامی سے آزاد ہونا ہے یا ہمیشہ کے لیے غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا ہے۔"

اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنے دائیں کان کی لو کو پکڑا تھا اور پھر ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔ بالکل احمد رضا کی طرح۔ وہ بھی بات کرتے کرتے اکثر ایسا ہی کرتا تھا۔

اس نے احمد حسن کی باتیں کم سنی تھیں۔ اس کا سارا دھیان اس کی حرکات کی طرف تھا۔ وہ اس کی ایک ایک جنبش کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے موبائل اٹھایا اور تصویریں دیکھنے لگی۔ بہت دن پہلے اس نے احمد رضا کی ایک تصویر اسکین کر کے اپنے موبائل میں

محفوظ کی تھی۔ اب وہ تصویر اس کے سامنے تھی۔ کچھ دیر وہ تصویر کو دیکھتی رہی۔ احمد حسن اور احمد رضا میں کیا فرق تھا۔ صرف داڑھی کا یا کچھ اور بھی۔۔۔

ہاں! احمد رضا کا چہرہ دبلا تھا۔

جبکہ احمد حسن کا بھرا بھرا تھا۔ احمد رضا گلاسز نہیں لگاتا تھا، جبکہ احمد حسن نے عینک لگا رکھی تھی

شاید پانچ سالوں میں اس کی نظر کمزور ہو گئی ہو۔ اس کا چہرہ بھر گیا ہو۔

احمد رضا دبلا پتلا تھا، اسمارٹ سا۔ جبکہ احمد حسن تھوڑا صحت مند لگ رہا تھا۔ پانچ سالوں میں اتنی تبدیلی تو آسکتی ہے۔

اس کی انگلیاں مسلسل موبائل پر حرکت کر رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ فیس چینجنگ (Face changing) کے سوفٹ ویر کو دیکھتی رہی۔ اس کی انگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ احمد رضا کے چہرے پر داڑھی لگ چکی تھی۔

پروگرام اختتام کے قریب تھا۔ ایک بار پھر وہ احمد رضا اور احمد حسن کا موازنہ کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

طیب خان نے ٹی وی آف کیا اور گیسٹ روم سے باہر نکل آیا۔

"تو یہ ہے احمد حسن کمال، اس کا اتنا چرچا سننے کے باوجود میں نے آج تک اس کا کوئی پروگرام نہیں دیکھا۔ رچی کا باس بھی اس کی تعریف کر رہا تھا کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ ہمارے لیے کار آمد ثابت ہو رہا ہے۔ یہ احمد حسن اتنا جانا پہچانا کیوں لگ رہا تھا۔ حالانکہ میں نے پہلی بار اس کا پروگرام دیکھا ہے۔" وہ چونکا۔

"احمد حسن!" اس نے دہرایا اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ برآمدے میں لائٹیں جل رہی تھیں۔ یہ گیسٹ روم جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ جو رچی کے شاندار گھر سے ملحق ایک چھوٹے سے گھر میں تھا۔ اس گھر میں لائن سے چار کمرے تھے۔ آگے برآمدہ تھا اور پھر کھلا صحن۔ برآمدہ صحن سے تھوڑا اونچا تھا۔ غالباً رچی کچھ مہمانوں کو یہاں ٹھہراتا تھا۔ اس وقت گھر میں طیب خان کے سوا کوئی اور مہمان نہ تھا۔ ایک ملازم تھا جو غالباً سونے جا چکا تھا اور چوکیدار گیٹ کے پاس چارپائی بچھائے چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ طیب خان کچھ دیر برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملایا۔ دوسری طرف رچی تھا۔

"ہیلو! کیا ہوا طیب خان؟"

"میں نے ابھی ابھی احمد حسن کا پروگرام دیکھا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ ڈیڑھ سال سے یہ پروگرام کر رہا ہے اور میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔"

"ڈیڑھ سال نہیں طیب خان! چار ماہ۔ صرف چار ماہ سے وہ یہ پروگرام کر رہا ہے۔ ہاں! البتہ ڈیڑھ سال سے وہ اخبارات میں کالم لکھ رہا ہے اور اس نے اپنی جگہ بنالی ہے کچھ خاص حلقوں میں۔"

"ہوں۔۔۔ احمد حسن کیا احمد رضا ہی ہے؟"

"ے۔۔۔ یس۔" دوسری طرف رچی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ صوفے پر بیٹھے احمد رضا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" رچی نے پوچھا۔

"مجھے وہ احمد رضا ہی لگا۔ کافی مشابہت ہے۔ ہاں! ان پانچ سالوں میں اس کی شخصیت میں ٹھہراؤ سا آگیا ہے۔ پانچ سال پہلے وہ بہت مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا اور یہ بے چینی اور اضطراب اس کے پورے وجود سے جھلکتا تھا۔"

"ہاں! جب جنگل سے جانور پکڑ کر لاتے ہیں تو وہ بھی ابتدا میں یوں ہی بے چین اور مضطرب ہوتے ہیں۔"

"اگر یہ واقعی احمد رضا ہے تو تم نے خوب پالش کیا اسے۔ گفتگو کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ ویسے کیا احمد حسن میٹنگ میں شرکت کے لیے آگیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔" رچی نے احمد رضا کی طرف دیکھتے ہوئے دائیں آنکھ کا کونا دبایا۔ احمد رضا بے حد سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔

"میٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔ باس کو کسی بے حد ضروری کام سے لندن جانا پڑ گیا ہے۔ میں کل کسی وقت تمہیں بریفنگ دوں گا۔ آئندہ کے لیے اور پھر تم واپس جاسکتے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ احمد حسن سے ملاقات نہیں ہوگی۔"

"تمہارے علاوہ صرف نتاشا اور الوینا آئی ہوئی ہیں اور احمد حسن سے بہت جلد تمہاری ملاقات متوقع ہے۔ مستقبل قریب میں تم دونوں کو مل کر ہی کام کرنا ہے۔"

"کیا مجھے لاہور جانا پڑے گا؟" طیب کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"کیوں۔۔۔ کیا اپنے ہونے والی سسرال سے دور نہیں جانا چاہیے۔"

"رچی! تم بھی۔۔۔" طیب خان نے دانت پیسے اور رچی نے قہقہہ لگایا۔ "وہ صرف مجھے جہاد افغانستان کا مجاہد سمجھ کر ملتی ہے۔"

"اور تم؟ کیا تم بھی اسے کوئی مجاہدہ سمجھتے ہو؟" اب کے رچی کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

"اوکے۔۔۔ پھر ملتے ہیں صبح۔"

رچی نے فون بند کر دیا۔ طیب خان نے فون جیب میں ڈال لیا اور پھر ٹہلنے لگا۔ دوسری طرف رچی احمد رضا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو بے حد سنجیدہ سا ہاتھ گود میں دھرے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو احمد حسن؟" رچی نے بغور اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں! طیب کیا کہہ رہا تھا؟"

"پوچھ رہا تھا کہ احمد حسن ہی احمد رضا ہے۔"

"کیا پہچان لیا اس نے مجھے؟" احمد رضا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"شک ہے اسے۔۔۔ اور احمد حسن سے مل کر اس شک کو یقین میں بدلنا چاہتا ہے۔"

"اگر طیب نے مجھے پہچان لیا ہے جس کے ساتھ چند دن بھی نہیں گزارے میں نے۔۔۔ تو کیا انہوں نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔ جن کے ساتھ زندگی گزری؟" اس نے بے اختیار سوچا۔

"امی تو شاید نہیں، لیکن ابو اور سمیرا تو یہ پروگرام ضرور دیکھتے ہوں گے۔ سمیرا بے حد محب وطن لڑکی ہے۔ اسے یاد تھا ایک بار وہ انڈیا کی چوڑیاں لایا تھا تو اس نے انہیں پہننے سے انکار کر دیا تھا۔

"نہیں امی! میں دشمن ملک کی مصنوعات استعمال نہیں کر سکتی۔" احمد رضا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کیا سوچ رہے ہو احمد رضا؟" رچی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"یوں ہی خیال آگیا تھا کہ شاید میرے گھر والوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہوگا۔"

"نہیں شک تو ہوا ہوگا احمد رضا! اگر انہوں نے پروگرام دیکھا ہو کبھی۔۔۔ انہیں مشابہت بھی محسوس ہوئی ہوگی۔"

"تو پھر انہوں نے کبھی فون کیوں نہیں کیا؟ ابو نہ سہی، سمیرا تو کبھی کال کرتی۔۔۔ بلکہ ضرور کرتی۔ میں نے "چینل" کے آپریٹر سے کہہ رکھا ہے کہ اگر میرے لیے کوئی کال آئے تو وہ مجھ سے بات کرا دے یا میرا نمبر دے دے اسے۔"

"اس لیے کہ شک کے باوجود انہیں یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ تم ہی ہو۔" رچی اٹھا اور اس نے دیوار میں موجود لوہے کے بڑے لاکر سے ایک فائل نکالی۔ فائل پر مارکر سے موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ "اسماعیل خان۔"

اس نے فائل کھولی اور احمد رضا کے سامنے رکھ دی اور جھک کر اس میں موجود اخبار کی کٹنگ کو دیکھنے لگا۔ اس فائل میں اسماعیل خان کے حوالے سے چھپنے والی ہر خبر اور ہر مضمون اور کالم کی کٹنگ تھی۔ پھر ایک کٹنگ پر انگلی رکھتے ہوئے اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔

"اس خبر کو پڑھو احمد رضا!" اور خود پیچھے ہٹ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ احمد رضا 2003ء میں چھپنے والی اس خبر کو پڑھ رہا تھا، جو اس

کی موت کے متعلق تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ خبر کس نے چھپوائی ہے؟ یہ تو جھوٹ ہے بالکل۔" بے اختیار ہی احمد رضا کے لبوں سے نکلا۔

"میں نے۔" رچی نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"کیوں؟" احمد رضا نے پوچھا۔

"یہ ضروری تھا۔۔۔ تم یہاں کی پولیس کو مطلوب تھے اور دو سالوں میں لوگ اسماعیل خان اور اس کے "حواریوں" کو نہیں بھولے ہوں گے۔ بعض معاملات میں تم پاکستانیوں کی یادداشت بڑی تیز ہوتی ہے اور بعض میں بالکل زیرو۔ مثلاً "تم ہر سال ان ہی سیاست دانوں اور بندوں کو ووٹ دیتے ہو، جن کی کرپشن اور ظلم کے ہاتھوں نالاں ہوتے ہو۔۔۔ جو تم پر زندگی کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ لیکن تمہیں یاد نہیں رہتا۔ خیر!" اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی۔

"ضروری تھا کہ تم ایک نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ یہاں آتے۔"

احمد رضا کے اندر ابھی جو خوشی کا چراغ جلا تھا، اس کی لو ایک دم بھڑک کر بجھ گئی تھی۔

"ابو تو اخبار باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ میری موت کی خبر پڑھ کر کیا گزری ہو گی ان پر اور اب تک تو شاید صبر بھی آگیا ہو گا انہیں۔" اس نے مرے مرے ہاتھوں سے فائل بند کر کے رچی کی طرف بڑھا دی۔

رچی نے فائل لے کر میز پر رکھ دی۔

"یاد رکھو! تم اب احمد رضا نہیں، احمد حسن ہو۔ تمہیں یہاں کوئی نہیں پہچانتا۔ حتیٰ کہ طیب بھی متذبذب ہے۔ ان پانچ سالوں میں تم ایک نوجوان لڑکے سے مرد میں بدل چکے ہو۔ تم اگر اپنی پہچان سے مکر جاؤ تو کوئی بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اگر طیب مجھ سے پوچھے کہ میں احمد رضا ہوں تو میں انکار کر دوں۔"

"نہیں! میرا مطلب ہے، عام لوگوں کو تمہاری پہچان نہیں ہونی چاہیے۔ طیب فی الحال تو واپس جا رہا ہے۔ لیکن ہم ایک ٹیم کا حصہ ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ چھپا نہیں سکتے۔ جلد یا بدیر طیب سے تمہاری ملاقات ہو گی اور تم کو مل کر کام کرنا ہے۔ لیکن۔۔۔" وہ ہنسا۔ "مجھے یقین ہے طیب کا تجسس اس سے پہلے ہی اسے تم تک لے آئے گا۔"

"اور میں۔۔۔ کیا مجھے بھی کل واپس جانا ہے؟"

"نہیں! تم ابھی کچھ دن رکو یہاں۔ بہت سی باتیں سمجھنے والی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں وہ کرنا ہے جس کے لیے تم پاکستان آئے ہو۔"

"لیکن مجھے پہلے تو کچھ نہیں بتایا گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ تو۔۔۔"

"ہر چیز وقت آنے پر ہی معلوم ہوتی ہے۔ احمد رضا! آئی سی جی نے تم پر اتنا پیسہ خرچ کیا ہے تو ظاہر ہے وہ بدلے میں کچھ چاہیں گے بھی۔ تم ان کے ملازم ہو اب بھی۔ تمہیں یہاں بغیر کچھ کیے تنخواہ مل رہی ہے۔ ہر ماہ اس مد میں تمہارے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے جمع ہوتے ہیں۔"

احمد رضا الجھی نظروں سے رچی کو دیکھنے لگا۔

"پریشان مت ہو ڈیر! تمہیں کسی کو قتل کرنے کو نہیں کہا جائے گا۔ ہم سب تمہاری قدر کرتے ہیں۔ تم پڑھے لکھے ذہین آدمی ہو۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ تم ایک جھوٹے شخص کے جال میں پھنس گئے ہو۔ اس لیے میں نے تمہاری مدد کی تھی۔"

"لیکن تم۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ خود بھی تو اسماعیل خان کے ہاتھوں پر ایمان لائے تھے اور مجھے لگتا تھا، جیسے اسماعیل خان کے اس سرکل میں آپ سب سے زیادہ اہم تھے۔"

"سچ کی تلاش میں اس تک پہنچا تھا اور سمجھ ہی نہیں پایا۔ خیر! چھوڑو، رات بہت ہو گئی ہے۔ کل ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔ تم آج رات آرام کرو۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

"گڈ نائٹ۔" احمد رضا کمرے سے باہر نکل آیا۔

دو کمرے چھوڑ کر اس کا کمرا تھا۔ جب وہ آیا تھا تو رچی کے ملازم نے اس کا سامان اس کمرے میں رکھا تھا اور بتایا تھا کہ یہ کمرا اس کے لیے سیٹ کیا گیا ہے۔ گھر بہت شان دار تھا۔ وہ کچھ دیر کمرے سے باہر نکل کر بھی کھڑا رہا۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔

کوئی سوچ، کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ روم فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے کمرے میں گلاب رکھ دیے ہوں۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ جب جوتے اتار کر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تو حیران رہ گیا۔ دروازے سے ٹیک لگائے الوینا کھڑی تھی۔ وہ اتنی بے آواز اندر آئی تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے دو سالوں بعد اسے دیکھا تھا۔ دو سال پہلے جب وہ امریکا سے آرہا تھا تو وہ ایئرپورٹ پر اسے چھوڑنے آئی تھی۔

"تم۔۔۔!" وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

الوینا مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور گرم جوشی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیسے ہو؟"

"فائن!" احمد رضا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی بیٹھ گیا۔

"رچی نے بتایا تھا تم سوات میں ہو۔"

"ہاں۔۔۔ وہاں ہم خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"پتا نہیں، ان کی فلاح و بہبود کے لیے یا ان کی بربادی کے لیے۔" احمد رضا نے سوچا۔

"کیا بات ہے، تمہیں مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟ چپ چپ سے ہو۔"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس تھکاوٹ ہے۔ سونا چاہتا ہوں۔"

الوینا نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم خوش نہیں لگتے احمد رضا! حالانکہ تمہارے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔"

"زندگی میں دولت، ہر چیز کا مداوا نہیں ہوتی الوینا۔ کچھ اور ایسا بھی ہوتا ہے جو ان سب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر سوچنے لگا۔

"ہم ایک خوشی کی خاطر بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو چھوڑ دیتے ہیں، جو ہمیں لمحہ لمحہ مل رہی تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے لمحات، جو تب بالکل بے وقت اور بے معنی لگتے تھے۔ سمیرا سے چھین کر آئس کریم کھانا۔ اس سے بلاوجہ جھگڑنا اور اس کے چڑنے پر خوش ہونا۔ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹنا۔ ان کا بالوں میں ہاتھ پھیرنا۔ ان کے ہاتھ کے پکے قیمہ کریلے کھانا۔ ابو سے گپ شپ لگانا اور تو اور گلی میں بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنا یہ اور ان جیسے سارے چھوٹے چھوٹے لمحے دولت کے ان ڈھیروں سے زیادہ خوب صورت اور قیمتی تھے۔ پتا نہیں، وہ کون سا لمحہ تھا، جب میں نے دولت اور شہرت کی خواہش کی تھی۔ بس ایک خیال، ایک معمولی خواہش کی اتنی بڑی سزا۔"

"پھر سوچ میں گم ہو گئے ہو رضا؟" الوینا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

کبھی الوینا کا معمولی سا لمس بھی اسے ہیجان میں مبتلا کر دیتا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے دل میں الوینا کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کم از کم اس وقت۔۔۔ اس وقت اس کا دل بار بار اسے ان لوگوں کے درمیان لے جاتا تھا۔ جن سے بچھڑے پانچ سال ہو گئے تھے۔

"جب میری موت کی خبر انہوں نے پڑھی ہو گی تو کیا گزری ہو گی ان پر۔ لوگ ان کے پاس پرسہ دینے آئے ہوں شاید۔"

"تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے احمد رضا! مجھ سے شیئر نہیں کرو گے؟"

"کوئی بات نہیں ہے الوینا! بتایا تھا نا تمہیں، تھک گیا ہوں، سونا چاہتا ہوں۔"

"کیا رچی نے کچھ کہا؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے! پھر آرام کرو۔ صبح ملاقات ہو گی۔" اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"کچھ پیو گے؟" وہ جاتے جاتے پلٹی۔

لمحہ بھر احمد رضا اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہاں! کچھ پلا دو، کچھ ایسا کہ ذہن پر سکون ہو جائے۔"

دماغ کے اندر یہ جو ہلچل مچی ہے، یہ نہ رہے۔ بس گہری نیند سو جاؤں میں۔"

"ٹھیک ہے! میں لاتی ہوں۔" وہ لہراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

الوینا کون تھی۔ کیا تھی۔ اس نے کبھی جاننے کا تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر فدا تھا۔ اس کے ساتھ شادی پلان کر رہا تھا۔

لیکن سب کچھ خاک ہو گیا۔ اسماعیل خان پکڑا گیا اور اسے ملک چھوڑنا پڑا۔ جتنا عرصہ وہ انگلینڈ رہا' اسے الوینا بہت یاد آتی تھی۔ لیکن جب وہ امریکا گیا' الوینا سے ملا تو اسے لگا کہ الوینا محض ایک مہرہ ہے۔ اس سارے سیٹ اپ کا۔ یہ مہرہ اسے پٹانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور وہ پٹ گیا تھا۔ بہت ساری باتیں وہ سمجھتا تھا۔ جانتا تھا۔ لیکن اس جان لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کھیل کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ اب ان میں سے تھا اور اسے وہی کرنا تھا' جو وہ چاہتے تھے۔

کیا وہ کبھی ان سے دور جا سکے گا۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ پھر بے آواز کھلا تھا۔ الوینا کے ہاتھ میں بوتل اور گلاس تھے۔ اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر سامان رکھا تھا اور پھر دروازہ بند کر کے اس کے سامنے آ بیٹھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے جینز اور شرٹ میں تھی' لیکن اب وہ لباس بدل آئی تھی۔

اس کے جسم پر باریک نائٹی تھی اور اس میں سے اس کا خوب صورت جسم جھلک رہا تھا۔ احمد رضا اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے مردہ احساسات جاگ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے اسے ایک دم ہنسی آ گئی۔ اسے وہ مشروب یاد آ گیا تھا جو شربت طہور کے نام پر پیتا تھا۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟" الوینا نے پوچھا تو اس نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا یہ بھی شربت طہور ہے' جو خاص لوگوں کو پلایا جاتا ہے؟ سچ بتانا! وہ کیا تھا' جو تم پلاتی تھیں تو میں مدہوش ہو جاتا تھا؟"

"شربت طہور۔" الوینا ہنسی تو احمد رضا کو لگا جیسے اس کے چاروں اور جلترنگ بج رہا ہو۔

"اسماعیل خان۔۔۔ میرا مطلب حضرت جی سے ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ورنہ وہی بتا سکتا تھا کہ وہ کیا تھا۔"

احمد رضا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا تم۔۔۔ تم بھی الوینا یہ سمجھتی ہو کہ وہ جھوٹا تھا۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا؟"

"اس وقت تو وہ سچا ہی لگتا تھا۔" الوینا نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پھر بھر دیا۔

پھر پتا نہیں اس نے کتنے گلاس پیے تھے اور کب سویا تھا۔ الوینا کی رفاقت نے آج پھر اس کے اندر خوشی کے انوکھے رنگ بھر دیے تھے اور سونے سے پہلے وہ پانچ سال پہلے کی طرح سوچ رہا تھا کہ اسے الوینا سے شادی کر لینا چاہیے اور وہ اس سے کہنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن پھر نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔ پتا نہیں کہہ پایا یا نہیں۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو الوینا کھڑکیوں کے پردے ہٹا رہی تھی اور شیشوں سے آنے والی دھوپ نے پورا کمرا روشن کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی لیٹا چندھیائی آنکھوں سے الوینا کو پردے ہٹاتا دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ الوینا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔

"تم بہت سوئے۔۔۔ گیارہ بج رہے ہیں۔"

"بڑے عرصے بعد اس طرح سویا ہوں الوینا۔ ورنہ تو کروٹیں بدلتے رات گزر جاتی ہے۔ جانتی ہو پانچ سالوں سے میں پوری نیند سو نہیں پایا۔ کبھی آنکھ لگتی بھی ہے تو اچانک جاگ اٹھتا ہوں۔ شاید یہ تمہاری قربت اور رفاقت کا سحر ہے۔"

الوینا مسکرائی۔ "ناشتا کمرے میں ہی کرو گے یا ڈائننگ ٹیبل پر آؤ گے؟"

"رچی کہاں ہے؟" اس نے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکائے۔

"رچی تو کب کا ناشتا کر کے چلا گیا۔ اپنے مہمانوں کو ائیرپورٹ چھوڑنے۔"
"کون مہمان؟"
"کچھ عرب دوست تھے اس کے۔"
"اور طیب خان؟ کیا وہ بھی چلا گیا؟"
"میرے خیال میں۔۔۔" الوینا دروازے کی طرف بڑھی۔
"میں تمہارا ناشتا بھجوا دیتی ہوں۔ رچی نے کہا تھا۔ وہ واپسی پر تم سے ملاقات کرے گا۔"
بیڈ کے نیچے سے سلیپر نکالتے ہوئے احمد رضا نے سر ہلایا۔ الوینا باہر چلی گئی۔ وہ کچن میں ملازم کو ناشتے کا کہہ کر کمرے میں آئی ہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف رچی تھا۔
"تمہارے پروانے کا کیا حال ہے؟"
"جاگ گیا ہے۔"
"کچھ دیر میں ڈرائیور آئے گا۔ اس سے کہنا وہ تیار ہو کر اس کے ساتھ چلا جائے۔ میں بھی یہاں سے فارغ ہو کر وہاں ہی پہنچ جاؤں گا۔"
"کہاں سر؟"
"چک نمبر 151 میں۔"
"کیا وہاں کام شروع ہو گیا ہے؟"
"ہو جائے گا جلد۔ تم سے شاید کل ملاقات ہو۔ میری واپسی تک تمہیں یہیں رکنا ہے۔"
"او کے۔۔۔ لیکن کیا میرا احمد رضا سے ملنا ضروری تھا رچی؟ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ پرپوز کر رہا تھا مجھے۔"
"ضروری تھا الوینا۔۔۔ وہ پچھتا رہا تھا۔ گھر یاد آ رہا تھا اور اسے اپنی فیملی یاد آ رہی تھی۔ ہاں! اسے وہ منشور ضرور دکھا دینا۔ میں چاہتا ہوں جب اس سے بات کروں تو وہ پہلے سے جانتا ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔"
"رائٹ سر!"
الوینا نے فون بند کر دیا اور بیڈ پر سوئی ہوئی نتاشا کو دیکھنے لگی۔ نتاشا مقامی لڑکی تھی اور پچھلے دو سال سے اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اسے ہر دم متحرک رکھتا تھا۔

وہ ان کے خفیہ مقاصد سے قطعی بے خبر تھی۔ نتاشا کے چہرے سے نظریں ہٹا کر وہ احمد رضا کے متعلق سوچنے لگی۔ احمد رضا کے لیے اس کے دل میں ہمدردی کا ایک گوشہ موجود تھا۔ اسے بعض اوقات اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ خاص طور پر ان دنوں جب نائن الیون کے بعد وہ اس گندے علاقے میں رہ رہا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی آنکھوں سے اسے غلیظ عورتوں کے نرغے میں گھرے دیکھا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ تب اس نے رچی سے اسے وہاں بھجوانے کی وجہ پوچھی تھی تو اس نے کہا تھا۔
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ اس واقعے کے بعد امریکن مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے ہوں۔ وہ اس ماحول میں رہنے کا عادی نہیں ہے۔"
اور رچی نے شاید احمد رضا میں اس کی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔ اس کے بعد آج وہ احمد رضا کو دیکھ رہی تھی۔ "رچی ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ اسی لیے اس نے اسے اس سے دور کر دیا تھا۔"
اس نے سوچا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی فائل اٹھائی اور اسے کھولا۔
"مسلمانوں کی ثقافت کو تباہ کرنا۔
اسلام کو ریاست (State) سے خارج کرنا۔
انسانوں کے بنائے قوانین رائج کرنا۔
اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے کی تردید کرنا۔
جہاد اور جہادی لٹریچر چھاپنے والوں کے خلاف کارروائی۔ جہادی کیمپوں کا خاتمہ۔
دہشت گردی کا الزام مساجد اور مدرسوں پر پابندی لگانا۔
مذہبی افراد کو روشن خیال بنانا۔
بھارت سے دوستی۔
ایسے چینل قائم کرنا جو غیر مسلموں سے بھائی چارے کا سبق دیں۔ جہاں کم علم علما کو آگے لایا جایا جائے۔
عورت کا آزادئ نسواں کے نام پر استحصال۔"
کئی صفحات پر مشتمل فائل کو اس نے سرسری نظروں سے دیکھا اور پھر اس خفیہ فائل کو لاکر میں رکھ کر اس نے دوسری فائل اٹھائی۔ یہ وہ فائل تھی جو اسے احمد رضا کو دینا تھی۔ فائل کے باہر ایک کونے میں لکھا تھا۔
crisis group) I.C.G
(international
الوینا فائل لے کر باہر آئی تو احمد رضا لاؤنج میں بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔
"تم نے ناشتا کر لیا؟"
"نہیں! صرف چائے لی ہے۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔"
"کچھ کھا لیتے۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور آئے گا تمہیں لینے۔ رچی تمہیں وہیں ملے گا۔"
"جی نہیں چاہ رہا۔"
"اتنے میں یہ فائل دیکھ لو۔" احمد رضا نے فائل پکڑ لی۔
"کیا تم بھی I.C.G کی ممبر ہو۔" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔"
"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میڈیا کی نامور شخصیات پاکستان کی شہرت یافتہ خواتین مختلف ممالک کے وزراء، صدر وغیرہ بھی اس کے ممبر ہیں۔" احمد رضا نے اس کی طرف دیکھا۔
"پتا نہیں۔" الوینا نے کندھے اچکائے۔ "ہم تو صرف اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ دوسروں کے مسائل وغیرہ حل کرنے کا فلاحی کام۔"
الوینا بات کر کے وہاں رکی نہیں تھی۔ احمد رضا فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ چند صفحات پڑھ کر اس نے فائل بند کر دی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور اسے لینے کے لیے آ گیا۔ اس نے ملازم سے الوینا کے متعلق پوچھا تو پتا چلا وہ نتاشا کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی ہے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے حیرت ہوئی۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سر جھٹک کر باہر کی طرف چل پڑا۔
الوینا ایسی ہی تھی۔ کبھی ایک دم مہربان اور کبھی

ایک دم اجنبی۔۔۔ لیکن دو سالوں بعد آج اس کا دل پھر الوینا کے لیے دھڑک رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر بھی وہ مسلسل اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود اندر ایک خالی پن تھا۔ تنہائی تھی اور ویرانی۔ اسے کسی کی مستقل رفاقت کی ضرورت تھی۔ دوسراہٹ کی خواہش تھی۔ پچھلے چند ماہ سے یہ خواہش شدت اختیار کر گئی تھی۔ اندر کا خالی پن کسی کی ہمراہی سے بھرنا چاہتا تھا۔ ایک گھر۔۔۔ بچے۔

وہ گھر جو اس سے بچھڑ گیا تھا۔

وہ ایسے ہی کسی گھر کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا اور الوینا سے ملنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا۔ اگر الوینا اس کی خالی زندگی کا خلا بھر دے تو۔

الوینا اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی۔

الوینا، جسے وہ سمیرا سے ملانا چاہتا تھا۔ لیکن الوینا کو پتا نہیں کسی گھر کی خواہش تھی بھی یا نہیں۔

"صاحب! آپ طیب خان کے ساتھ آئے تھے؟"

ڈرائیور نے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں تو۔۔۔ میں لاہور سے آیا ہوں۔"

"اچھا اچھا! مجھے لگا جیسے آپ بھی افغانی ہوں۔"

"نہیں! میں افغانی نہیں ہوں۔"

ڈرائیور بہت باتونی تھا۔ راستہ بھر باتیں کرتا رہا۔ احمد رضا "ہوں ہاں" کرتا رہا۔ چک نمبر 151 میں داخل ہوتے ہوئے وہ چونکا۔ یہ جگہ اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ ڈسٹرکٹ رحیم یار خان کا چک نمبر 151۔ اسے یاد آیا ایک بار جب وہ میٹرک میں تھا تو ابو کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ رحیم یار خان سٹی میں تو وہ کبھی کبھار آتے جاتے رہتے تھے۔ وہاں ابو اور امی کے کافی عزیز تھے۔ لیکن یہاں اپنی یادداشت میں ایک بار ہی آیا تھا۔ حسن رضا کو یہاں کسی شخص سے ملنا تھا تو وہ رحیم یار خان سے ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ پھر وہ ان کے ساتھ ان کی کسی کزن کے گھر بھی گئے تھے۔ بڑی سی حویلی تھی۔ بڑا سا صحن تھا۔ ابو کی وہ کزن بہت نرمی اور حلیمی سے بات کرتی تھیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا وہیں کھلایا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود کوشش کے اسے نہ تو ابو کی اس کزن کا نام یاد آیا اور نہ ہی ان کے شوہر کا۔ لیکن پھر بھی وہ یہاں آکر خوشی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کہیں قریب کوئی اپنا ہو۔ ایک خوشگواریت کا احساس ہو رہا تھا اسے۔ ورنہ کچھ دیر پہلے تو انتہائی قنوطی ہو رہا تھا۔

رچی اس کا منتظر تھا۔ یہ ایک زیر تعمیر عمارت تھی۔ جس کی ایک منزل مکمل تھی۔ جبکہ دوسری پر کام ہو رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں رچی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ رباب حیدر بھی تھا۔ رچی اس وقت عربی لباس میں تھا اور بہت جچ رہا تھا۔ رچی غالباً" رباب حیدر کو اس کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اسے ملا۔ لیکن احمد رضا کے انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ وہ دل میں ان سب کے لیے کدورت رکھتا تھا رباب حیدر، طیب خان اور کبھی کبھی رچی کے لیے بھی۔ ان ہی کی وجہ سے وہ یہاں تھا۔ ورنہ اس وقت وہ انجینئر بن چکا ہوتا۔

"کیمو فلاح کے لیے اچھی جگہ تلاش کی ہے تم نے رچی۔" رباب حیدر کہہ رہا تھا۔ احمد رضا نے بیٹھتے ہوئے سنا۔ جواباً" رچی مسکرایا۔

"ہمارا مقصد صرف یہاں کی فلاح و بہبود ہے۔"

رباب حیدر یوں مسکرایا۔ جیسے وہ اصلیت سے باخبر ہو۔ تب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص نے اندر آکر رچی کو کچھ بتایا۔

"ہاں ہاں میاں صاحب! انہیں بلا لیجیے۔ میں تو خود ان کا منتظر ہوں۔"

وہ شخص چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد دو افراد اندر آئے۔

"مرحبا! مرحبا۔"

رچی نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

"وعلیکم السلام! آئیے، تشریف لائیے بیٹھیے۔"

دونوں افراد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"ہمیں آپ کے آنے کا پتا چلا تو ملنے آ گئے۔ بلکہ ہم آپ کو دعوت دینے آئے ہیں۔ کھانا ہمارے ہاں ہی کھائیے گا۔"

"نہیں، نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ ادھر لگ رہا ہے ہمارا۔"

"نہیں شیخ صاحب! انکار مت کیجیے گا۔ ابا کو بھی افسوس ہو گا۔"

نسبتاً" کم عمر فرد نے کہا۔ احمد رضا بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے وہ دونوں جانے پہچانے لگ رہے تھے۔

"یہ عظمت یار اور اسفندیار ہیں۔"

رچی نے احمد رضا سے ان کا تعارف کروایا۔

اب کے احمد رضا چونکا تھا۔ "یہ زمین ان کی ہی ہے، جس پر یہ مرکز بنایا جا رہا ہے اور ان کی نگرانی میں ہی سب ہو رہا تھا۔

"اور یہ احمد حسن ہیں۔"

دونوں نے باری باری احمد حسن سے ہاتھ ملایا۔ رباب حیدر کو غالباً" وہ پہلے سے جانتے تھے۔

"بس جناب! ہم اور ہمارے گاؤں والے شیخ عبدالعزیز صاحب کے بہت شکر گزار ہیں۔ یہاں عورتیں بہت خوش ہیں۔ کوئی پندرہ بیس عورتیں آ رہی ہیں مرکز میں۔"

"یہ رچی بھی بہروپیا ہے۔ اب شیخ عبدالعزیز بن بیٹھا ہے۔ پتا نہیں دل سے مسلمان بھی ہوا تھا یا نہیں۔" احمد رضا نے سوچا۔

"کچھ ایسی خواتین کا انتظام ہوا، جو نگرانی کر سکیں اور سارے معاملات کو ہینڈل کر سکیں؟ اچھی تنخواہ دیں گے ہم۔" رچی کہہ رہا تھا۔

"جی، جی! ایک دو لڑکیوں سے بات کی ہے۔ لیکن ابھی کوئی تیار نہیں ہوئی ہے۔"

"میرے خیال میں الوینا اور نتاشا کو فی الحال یہاں رکھ لیتے ہیں۔ ان کو تجربہ ہے کام کا۔ باقاعدہ کام اسٹارٹ ہو جائے گا تو خود ہی خواتین ادھر آئیں گی۔"

رچی نے رباب حیدر سے کہا تو رباب حیدر نے تائید کی۔

"ہاں! یہ مناسب رہے گا۔ بلکہ اخبار میں اشتہار بھی دے دیں گے تو لڑکیاں جاب کے لیے آ جائیں گی۔"

"ٹھیک ہے! تم اشتہار دے دینا اور یہ بھی لکھ دینا کہ باہر سے آنے والی لڑکیوں کے لیے رہائش کا انتظام بھی ہے۔"

"اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا جناب! بہت نیک کام کر رہے ہیں۔" عظمت یار نے کہا تو رچی مسکرا دیا۔

"اللہ ہمیں ہمارے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"ہماری ایک بہن بھی ہے۔ لاہور میں پڑھ رہی ہے۔ میں ابا سے کہوں گا اسے بلوا لیں۔ بلکہ ابا تو پہلے ہی کہہ رہے تھے اسے بلانے کو وہ بھی دیکھ لے گی سب کام۔ بہت سمجھ دار اور لائق ہے۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتی ہے۔ اسے فلاحی کام کرنے کا بھی شوق ہے۔" اسفندیار کے لہجے میں فخر تھا۔

"ہاں! ضرور۔۔۔ وہ آ جائے تو مسئلہ ہی کیا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ باہر کی لڑکیوں کی نسبت وہ اپنے گاؤں کی لڑکیوں کا زیادہ خیال رکھ سکے گی۔"

"جی بالکل! میں اسے جلدی لے آؤں گا۔ اریب فاطمہ نام ہے اس کا۔"

عظمت یار، اسفندیار، اریب فاطمہ، یہ تینوں نام ایک ساتھ اس نے کہاں سنے تھے۔ اس کے ذہن میں ایک دم جھماکا ہوا تھا۔

ابو کی وہ کزن۔ حویلی کا برآمدہ، جہاں موڑھے پر بیٹھی خاتون اپنے بچوں کا تعارف کروا رہی تھیں۔ اسفندیار۔۔۔ عظمت یار۔۔۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ جبکہ عظمت یار بھی بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

☼

(آخری قسط آئندہ ماہ)

نگہت عبداللہ

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایازاد، اجلال رازی سے ہوچکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

وہ اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خودسر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے، مگر وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کر لیتا ہے اور تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اریبہ' یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے' مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کر دیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی' اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی' توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ' ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی' اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔ تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہو جاتی ہے۔

یاسمین' اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتی ہے۔ مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کر دیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال' اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہو جاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں ثمیر سے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کر لیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہو جانے پر سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ اجلال' ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کر لے۔ اریبہ اجلال کو فون کرتی ہے' مگر وہ سرد مہری سے بات کرتا ہے تو اریبہ کچھ بتائے بغیر فون بند کر دیتی ہے۔ شمشیر علی نے ابراہیم نامی بچے سے اسکیچنگ سیکھ کر تاجور کی تصویر بنائی تو اریبہ اسے دیکھ کر فوراً" پہچان گئی۔ اس نے شمشیر کو بتایا کہ اریبہ اس کے گھر میں حفاظت سے ہے۔ شمشیر اب اریبہ کو واپس پہنچانا چاہتا تھا' لیکن اریبہ نہیں چاہتی ہے کوئی شمشیر علی کو مجرم سمجھے۔ وہ ایک منصوبہ بناتی ہے۔ جس کے تحت شمشیر علی اسے اسپتال میں داخل کرا کے توصیف احمد کو اطلاع کر دیتا ہے۔ توصیف احمد اس کے ساتھ اسپتال جاتے ہیں اور اریبہ کو گھر لے آتے ہیں۔

اریبہ کو دیکھ کر اجلال کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا مگر پھر ساجدہ بیگم سے سارہ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیتا ہے۔ وہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ ثنا' ثمیر کو فون پہ بتا دیتی ہے۔ وہ سارہ سے پوچھتا ہے' پھر جواب نہ پا کر اریبہ کو بتا دیتا ہے۔ اریبہ' سارہ سے ناراض ہو جاتی ہے۔ اریبہ اپنے والد کے دفتر میں اجلال سے اشاروں' کنایوں میں اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اجلال کے چہرے کے تاثرات سے اسے جواب مل جاتا ہے۔ سارہ حالات سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

۱۹

انیسویں قسط

"السلام علیکم!" اریبہ کو اس کی آنکھوں کی سرخی بہت کچھ یاد دلا گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! آیئے۔" وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ دونوں اندر آ گئیں تو دروازہ بند کر کے اس نے انہیں وہیں لاؤنج میں بیٹھنے کو کہا۔

"تاجور کہاں ہے؟" اریبہ نے بیٹھنے سے پہلے پوچھا تو وہ بے اختیار کہہ گیا۔

"وہ رو رہی ہے۔"

"رو رہی ہے کیوں؟"

"بس! وہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو وہ پریشان ہو گئی۔" اس کے یہ بتانے پر اریبہ نے بے اختیار پوچھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

وہ سٹپٹا کر سارہ کو دیکھنے لگا۔ تب اریبہ کو احساس ہوا کہ وہ احتیاط بھول گئی ہے۔

"سوری! میرا مطلب ہے۔ آپ تو واقعی بیمار لگ رہے ہیں۔ سارہ کو بلڈ دینے سے یہ حالت ہوئی ہے آپ کی؟" اریبہ نے کہتے ہوئے سارہ پر نظر ڈالی۔

"جی! جی نہیں۔"

"میں تاجور کو دیکھ لوں۔" سارہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اریبہ بھی اس کے ساتھ جانے لگی تھی کہ شمشیر علی نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"شام!" اریبہ اسے ٹوکنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑا۔

"میری بات سنو۔ اگر تاجور کی زندگی بن کر آئی ہو تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"کیا مطلب؟" اریبہ پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

"ہر بات کا مطلب نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو پوچھا نہیں جاتا۔ بس تم تاجور کو لے جاؤ۔ وہ یہاں رہی تو مر جائے گی۔ میں مار ڈالوں گا اسے اور خود بھی مر جاؤں گا۔" وہ انتہائی عاجز ہو کر بول رہا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ! ہوا کیا ہے؟" اریبہ ٹھٹھکی ضرور تھی۔

لیکن اسی پر بگڑ گئی۔

"بتاؤں گا۔ سب بتاؤں گا۔ ابھی تم بتاؤ۔ تاجور کو اپنے پاس رکھ سکتی ہو کہ نہیں؟" شمشیر علی کے ذہن پر بس ایک ہی بات سوار تھی۔

اریبہ فوراً" جواب نہیں دے سکی تو تاجور کے کمرے میں چلی گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی کو مشکل میں ڈال رہا ہے۔ یہ واقعی بھاری ذمہ داری تھی۔ پہلے کی بات اور تھی۔ تاجور بیمار تھی تو اس نے اپنی بہن کے طور پر اسے اپنے گھر رکھ لیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر والوں سے کیا کہے گی۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا کہ وہ لڑکی ہو کر ہر معاملہ سے خود نمٹ رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر بھی نہیں بتاتی تھی اور وہ کیا مرد تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتا تھا۔

"لیکن یہ ذرا سی بات نہیں ہے۔" وہ خود ہی اپنا دفاع بھی کرنے لگا۔ پھر کمرے کی طرف دیکھا۔ جہاں وہ دونوں بہنیں تاجور کی دلجوئی کر رہی تھیں۔

"تاج! مہمانوں کو چائے نہیں پلاؤ گی؟" اس نے وہیں سے پکار کر کہا۔ پھر بالکونی میں نکل آیا۔

شام ابھی نہیں اتری تھی۔ جب ہی کمپاؤنڈ سنسان تھا۔ اس کی نظریں سامنے والے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے بھی آگے کھلے دروازے سے اندر کچھ تلاش کرنے لگیں۔ لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ بس پردہ کسی کسی وقت لہرا جاتا تھا۔ جیسے کوئی وہاں آجا رہا ہو۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ بس یہ ہی دیکھ رہا تھا۔

"بھائی! چائے بن گئی ہے۔" عقب سے تاجور نے کہا تو وہ اندر آتے ہوئے بولا۔

"صرف چائے؟"

"ہاں! بس ہم چائے ہی پئیں گے۔ مزید کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" اریبہ نے کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ سارہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

"آپ کیسی ہیں سارہ؟" وہ بیٹھتے ہوئے سارہ سے پوچھنے لگا۔

"بہت اچھی اور بہت خوش۔" سارہ سے پہلے اریبہ بول پڑی۔ "خوش اس لیے ہے کہ اسے آپ کی صورت بڑا بھائی مل گیا ہے۔ بہت شوق تھا اسے کہ کوئی بڑا بھائی ہوتا۔ جسے بھائی جان کہتی۔ اسے بلڈدے کر آپ اس کے بھائی جان ہو گئے کہ نہیں؟"

"بالکل ہو گیا۔" وہ کتنے دنوں بعد مسکرایا تھا۔

"مبارک ہو سارہ!" وہ سارہ کے گھورنے پر بھی باز نہیں آئی تھی۔ "گھر جا کر مجھے مٹھائی، بلکہ سوئیٹ ڈش بنا کر کھلانا۔"

"ہاں! تم گھر تو چلو۔" سارہ نے دانت پیس کر کہا تو اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔ پھر یوں جیسے اچانک یاد آیا ہو، کہنے لگی۔

"ہاں شمشیر! اگر آپ اجازت دیں تو ہم تاجور کو اپنے ساتھ لے جائیں؟"

"جی!" شمشیر علی اس اچانک بات کے لیے تیار نہیں تھا۔

"یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تاجور یہاں اکیلی ہوتی ہے۔ وہاں سارہ اس کے ساتھ ہو گی۔ پھر سارہ اسے پڑھا بھی رہی تھی۔ کیوں تاجور! تمہیں سارہ کا پڑھایا ہوا یاد ہے یا بھول گئی ہو؟"

اریبہ نے توجیہہ پیش کرتے ہوئے تاجور سے پوچھا تو وہ فوراً" بولی۔

"سب یاد ہے باجی!"

"دیکھا! کتنی ذہین ہے تاجور۔ اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔" وہ پھر شمشیر علی سے مخاطب ہو گئی تھی۔

"ہاں! لیکن۔" وہ اسی قدر کہہ کر تاجور کو دیکھنے لگا۔ اریبہ سمجھ کر تاجور سے پوچھنے لگی۔

"چلو گی نا تاجور؟"

"جی! لیکن پھر جلدی آجاؤں گی۔ بھائی کے لیے کھانا پکانا ہوتا ہے ناں!" تاجور نے ہامی بھرے ہوئے کہا۔

"کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ خود پکا لیں گے یا باہر سے کھا لیں گے۔ تم بس اب پڑھنے پر دھیان دو۔"

"ہاں تاجور! یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تمہیں پڑھنا چاہیے۔"

شمشیر علی نے اریبہ کی تائید کرتے ہوئے گویا اسے تاجور کو لے جانے کا اشارہ بھی دے دیا تھا اور پھر ایک پل کو یوں آنکھیں بند کیں۔ جیسے بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ بیگم چاہتی تھیں اور انہوں نے رازی سے بھی کہا تھا کہ ثنا کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شادی بھی کریں گی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ رازی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا کہ وہ سارہ سے شادی کرے گا۔ جبکہ ادھر ثنا کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔ یوں ساجدہ بیگم نے فی الحال رازی کی شادی ملتوی کر دی کیونکہ وہ اگر رازی کی بات مان بھی لیتیں۔ تب بھی اس روز جو توصیف احمد کا رویہ انہوں نے دیکھا تھا اس سے وہ ابھی ان کے پاس سوالی بن کر نہیں جا سکتی تھیں اور ثنا کی شادی میں انہیں نظرانداز کرنا بھی ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں پر انہیں اپنی بردباری کا بھرم رکھنا تھا۔ اس لیے جس روز ثنا کے سسرال والے تاریخ رکھنے آنے والے تھے تو انہوں نے امینہ اور اس کے شوہر کے ساتھ توصیف احمد اور یاسمین کو بھی بلاوا دے دیا تھا۔ یاسمین تو نہیں آئی۔ لیکن توصیف احمد عین وقت پر خالدہ کے ساتھ آگئے تھے۔ شاید بھتیجی کا معاملہ تھا۔ اس لیے وہ خوش بھی نظر آرہے تھے اور انہوں نے ہی سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے کیے۔ پھر جاتے ہوئے ساجدہ بیگم اور رازی سے یہ بھی کہہ گئے تھے کہ کہیں بھی ان کی ضرورت پڑی تو بلاجھجک انہیں بلا لیں۔

"اس روز چچا جان سارہ کی وجہ سے پریشان تھے۔ جب ہی آپ کو ان کا رویہ عجیب سا لگا ہو گا۔" رات میں رازی، ساجدہ بیگم کے دل پر چھائی کدورتیں دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہو سکتا ہے۔" ساجدہ بیگم اب اس بات کو اہمیت نہیں دینا چاہتی تھیں۔

"اور امی! آپ کو یاسمین آنٹی کو گھر جا کر دعوت دینی چاہیے تھی۔ وہ شاید اس لیے نہیں آئیں کہ آپ نے انہیں بس فون کر دیا تھا۔" رازی اب اپنی غرض سے مغلوب ہو کر بول رہا تھا۔ ساجدہ بیگم خوب سمجھتی تھیں۔

"میں نے سب کو فون کیا تھا۔ کسی کو گھر جا کر دعوت نہیں دی۔"

"ہاں! لیکن یاسمین آنٹی۔۔۔"

"یاسمین آسمان سے اتری ہے کیا؟" ساجدہ بیگم بگڑ گئیں۔ "مجھے اس کے آنے نہ آنے سے فرق نہیں پڑتا۔ ہاں! اگر توصیف نہ آتے، تب میں ضرور سوچتی کہ شاید مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔"

رازی خاموش ہو گیا تو وہ کہنے لگیں۔

"اور یہ تم کیا باتیں لے بیٹھے ہو؟ تمہیں اب صرف ثنا کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔ سارے انتظام تم ہی کو کرنے ہیں۔"

"ہاں! بتا دیں۔ کیا کیا کرنا ہے۔ بلکہ ایسا کریں، لسٹ بنا دیں۔ لیکن کپڑے اور جیولری میرے کھاتے میں مت

ڈالیے گا۔ یہ عورتوں کے کام ہیں۔ البتہ فرنیچر کے لیے کل میں ثنا کو ساتھ لے جاؤں گا۔ وہ پسند کرلے گی۔"

رازی کو احساس ہوگیا تھا کہ اسے اصل کام پر توجہ دینی چاہیے۔

"ہاں! یہ تم نے ٹھیک کہا۔ پہلا کام فرنیچر ہی کا ہوجائے۔ کیونکہ وقت کم ہے۔" ساجدہ بیگم تائید کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ "باقی سامان کی میں صبح لسٹ بنادوں گی۔"

"پھر جیولری وغیرہ کا کیا کریں گی آپ؟ میرا مطلب ہے 'اکیلے تو آپ بھی کچھ نہیں کرسکتیں۔" رازی قدرے فکرمند ہوگیا۔

"اکیلی کیوں؟ ثنا ساتھ ہوگی۔ تم ڈرائیور بھیج دینا۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ پرسوچ انداز میں سرہلا کر بولا۔

"ہوں۔۔۔ پھر بھی امی! آپ خالدہ آنٹی کو بھی ساتھ لے لیجیے گا۔"

"کہہ دوں گی خالدہ سے۔ آجائے گی تو اچھی بات ہے۔ نہیں تو کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے! پھر آپ صبح لسٹ بنادیجیے گا۔" رازی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے بولا۔

"اور ہاں! ثنا سے کہہ دیجیے گا۔ کل دوپہر میں میں اسے فرنیچر کے لیے لے جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔"

رازی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ساجدہ بیگم اسی وقت اپنا زیور نکال کر دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼
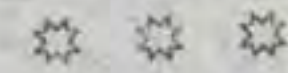
تاجور کو اپنے گھر رکھنے کا اب بھی اریبہ کے پاس ٹھوس جواز موجود تھا کہ وہ سارہ کی تنہائی کے خیال سے تاجور کو لائی ہے۔ سارہ اس کے ساتھ مصروف رہے گی تو اس کا دھیان بھی بٹا رہے گا۔ وہ خود بھی ان دنوں سارہ کا بہت خیال رکھتی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنی پڑھائی کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس لیے کہ اسے سارہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ کالج یا ہاسپٹل میں ایک دو ضروری لیکچرز اٹینڈ کرتی اور جلدی گھر آجاتی۔ پھر وہ سارہ کے ساتھ لگی رہتی۔ اسے آؤٹنگ پر بھی لے جاتی اور اب تو تاجور بھی ساتھ تھی۔ یوں کتنے دن گزر گئے۔ جب اسے سارہ کی طرف سے اطمینان ہوگیا کہ اب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گی۔ تب وہ شمشیر علی کے پاس آئی تھی۔

شمشیر علی اسے دیکھ کر محتاط انداز میں مسکرایا۔ پھر اس کے پیچھے دیکھنے لگا۔ اس کے خیال میں تاجور اور سارہ بھی آرہی ہوں گی۔

"کوئی نہیں ہے میرے ساتھ۔ میں اکیلی آئی ہوں۔" وہ اس کے دیکھنے سے سمجھ گئی۔

"اچھا!" وہ سامنے سے ہٹ گیا۔ اریبہ اندر آگئی۔ تب وہ دروازہ بند کرکے بولا۔

"تمہیں اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" اریبہ یہی سمجھی تھی کہ وہ تاجور کو نہ لانے پر خفا ہوگا۔ لیکن وہ نظریں چرا کر بولا۔

"کیونکہ میں اکیلا رہتا ہوں۔"

اریبہ ایک نظر اسے دیکھ کر آرام سے بیٹھ گئی۔ وہ جھنجلا گیا۔

"تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟ تم جاؤ یہاں سے۔"

"یہ تم میرے لیے کہہ رہے ہو یا اپنے لیے؟ میرا مطلب ہے 'مجھے تو تم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوسکتا۔ میں جب جس وقت چاہوں 'تمہارے پاس آسکتی ہوں۔" وہ بہت سیدھے سادے انداز میں بولی تھی۔ پھر بھی شمشیر علی کو لگا جیسے وہ اس پر کچھ جتا رہی ہے یا جتانے آئی ہے۔ جب ہی جزبز ہو کر بات بدل گیا۔

"چائے پیو گی؟"

"ہاں!" اس نے ہامی بھر کر میز سے میگزین اٹھالیا اور اس کے صفحے الٹنے لگی۔ یوں جیسے اب وہ چائے پینے کے بعد ہی کچھ کہے گی۔

شمشیر علی نے چند لمحے رک کر اسے دیکھا۔ پھر کچن میں چلا گیا۔

وہ آرام سے میگزین کے صفحے الٹتی رہی۔ جب شمشیر علی نے چائے کا مگ اسے متوجہ کرنے کی غرض سے آواز کے ساتھ میز پر رکھا۔ تب اس نے میگزین ایک طرف رکھ دیا اور چائے کا مگ اٹھا کر کہنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ شام! اور دیکھو 'مجھے کوئی کہانی گھڑ کر مت سنانا۔ سچ بتاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔"

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"میں تاجور کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ تم کیوں اسے اور خود کو مارنے کی بات کررہے تھے؟ کیا ہوا تھا؟"

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

شمشیر علی اس سے کچھ چھپا نہیں سکتا تھا اور بتاتے ہوئے بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اصل بات بتادی۔ جسے سن کر وہ بے اختیار گردن موڑ کر بالکونی کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سے کمپاؤنڈ کے دوسری طرف بنے اپارٹمنٹس کی بالکونیاں نظر آرہی تھیں۔

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں تاجور کو ابا کے پاس چھوڑ آؤں۔" شمشیر علی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"نہیں! وہ ہمارے گھر میں ٹھیک ہے۔۔۔ خوش ہے۔"

"ہاں! میری اس سے بات ہوتی ہے تو وہ یہ ہی کہتی ہے کہ اسے وہاں اچھا لگتا ہے۔ لیکن اریبہ! تمہارے گھر والے کیا سوچیں گے؟ تم نے کیا کہا ہے اپنے پیرنٹس سے؟" شمشیر علی نے پوچھا تو وہ قصداً" بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"کچھ نہیں! میرے پیرنٹس زیادہ سوال جواب نہیں کرتے۔"

"پھر بھی انہوں نے پوچھا تو ہوگا کہ یہ لڑکی دوبارہ کیسے آگئی؟"

"ہاں! پوچھا تھا اور میں نے کہہ دیا کہ میں اسے سارہ کی وجہ سے لے آئی ہوں۔ کیونکہ سارہ کا بھی اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ سارہ اور تاجور کی اچھی دوستی ہے۔" اریبہ نے اس موضوع کو ختم کرنا چاہا تو وہ بھی خاموش ہوگیا۔ پھر قدرے ٹھہر کر بولا۔

"اب میں تم سے کچھ پوچھوں؟"

"یہی پوچھو گے ناں کہ سارہ نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی؟" اریبہ نے فوراً" کہا تو وہ نفی میں سرہلانے لگا۔

"نہیں! بلکہ تم جو مجھے اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہی تھیں۔ تو کیوں؟ میں نے کیا کیا تھا؟" شمشیر علی اس پر نظریں جمائے پوچھ رہا تھا۔ جب ہی وہ مشکل سے بات بنا سکی تھی۔

"کچھ نہیں! میں اس وقت پریشان اور غصے میں تھی۔ پتا نہیں تم سے کیا کیا کہہ گئی تھی۔ تمہارا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور ہاں! تم تاجور کی طرف سے پریشان مت ہونا۔۔۔ اور نہ ہی اس معصوم لڑکی کے لیے تمہارے دل میں برا خیال آنا چاہیے۔ اصل میں ساری خرابی

اس معاشرے، اس ماحول کی ہے۔ اچھی بھلی سمجھ دار لڑکیاں بہک جاتی ہیں۔ تاجور تو پھر معصوم ہے۔"
"اس کی معصومیت سے ہی تو میں ڈر گیا تھا۔ اس روز اگر تم نہ آجاتیں تو جانے کیا ہو جاتا۔ میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں اریبہ! تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔" شمشیر علی نے احسان مندی سے مغلوب ہو کر کہا۔
"احسان تو تم نے بھی مجھ پر بہت کیے ہیں۔" وہ افسردگی سے مسکرائی۔
"طنز کر رہی ہو؟" شمشیر علی کو اس کی اچانک افسردگی اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔
"نہیں! یہ سب سے بڑا سچ ہے۔" وہ جانے لگی تھی کہ شمشیر علی قدم بڑھا کر اس کے سامنے آگیا۔
"تو پھر یہ بھی بتا دو کہ کیا ہماری ساری زندگی ایک دوسرے پر احسان کرنے میں گزر جائے گی؟"
وہ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان کھڑی اسے دیکھنے لگی۔
"کیا ہم ایک دوسرے کی ضرورت نہیں بن چکے...؟ تو پھر کیوں نہ احسان کا راستہ چھوڑ کر حقوق و فرائض کی راہ اپنا لیں؟" وہ اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر بولا پھر ایک دم اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اریبہ!"
اریبہ نے آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا تھا۔ لیکن اس نے گرفت مضبوط کرلی۔
"میں جانتا ہوں، میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم زندگی میں جن آسائشوں کی عادی ہو، شاید میں وہ بھی تمہیں نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں کوئی دعوا نہیں کروں گا۔ بس میں جو ہوں، جیسا ہوں، مجھے اپنا لو۔ مجھ پر، میری زندگی پر ترس کھاؤ اریبہ! میں اب تنہا نہیں چل سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ تمہارے بغیر نہیں چل سکتا۔" وہ اونچا پورا مرد اس کے سامنے بکھر رہا تھا۔
"تم صرف میری محبت ہی نہیں، میری زندگی بن چکی ہو۔ ایک بار کہہ دو کہ تم میری ہو۔ پھر چاہے انتظار کی سولی پہ چڑھا دو۔ میں ملن کی آس میں قیامت تک جی لوں گا۔ کہہ دو اریبہ! کہہ دو، تم میری ہو......"
اریبہ کے دل نے چپکے سے انگڑائی لی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ مگر پھر ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ کیونکہ اس کا ہاتھ شمشیر علی کی گرفت میں تھا۔
"میرا ہاتھ چھوڑو شام! مجھے جانے دو۔" اس نے کہا تو شمشیر علی اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑتے ہوئے مسکرایا تھا کہ اس نے ہمیشہ کی طرح جھٹکے سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا تھا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی اور انسان التجا وہاں کرتا ہے، جہاں بے بس ہو جاتا ہے۔ گویا اس کے جذبوں کے سامنے وہ ہار گئی تھی۔ جانے شمشیر علی خوش فہم ہو گیا تھا یا یہ ہی سچ تھا۔

☼ ☼ ☼

رات دھیرے دھیرے بھیگ رہی تھی۔ سارہ اور تاجور کے کمرے سے باتوں کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئی تھیں اور وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ ان آوازوں کے باعث وہ سو نہیں پا رہی تو ایسا نہیں تھا۔ بلکہ وہ جو مسلسل شمشیر علی کی نفی کرتی آرہی تھی، اس نے جیسے ایک دم خود کو منوانے کی ٹھان لی تھی یا اس کا اپنا دل "نہ، نہ" کی تکرار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔
"کیا ہم ایک دوسرے کی ضرورت نہیں بن چکے؟ تو پھر کیوں نہ احسان کا راستہ چھوڑ کر حقوق و فرائض کی راہ اپنا لیں؟ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اریبہ!"
"شادی۔" اس کے دل میں نئے سرے سے امنگیں سر ابھارنے لگیں۔

"اوہوں!" اس نے دل کو سرزنش کرنے کی کمزور سی سعی کی۔
"تم صرف میری محبت ہی نہیں، میری زندگی بن چکی ہو ایک بار کہہ دو کہ تم میری ہو۔ پھر چاہے انتظار کی سولی پر چڑھا دو۔ میں ملن کی آس میں قیامت تک جی لوں گا۔" وہ اس کی سماعتوں سے دل تک پورے استحقاق سے دستک دے رہا تھا۔
"شام!" اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔
محبت کی پہلی شرط یا پہلا تحفہ آنسو، جو اس کی آنکھوں سے دل تک کو غسل دے کر گزشتہ سارے نشان مٹا رہے تھے۔
اور اس رات کی سحر ہمیشہ سے زیادہ اجلی اور ایسے رنگوں سے سجی تھی۔ جسے صرف وہ محسوس کر سکتی تھی۔ وہ ان لمحوں کو اب کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جب ہی فجر کی نماز سے فارغ ہو کر لان میں نکل آئی۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ لان کے چکر لگاتے ہوئے اسے لگا۔ جیسے اس کے قدم بہک رہے ہیں۔ وہ پاؤں رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔ عجیب سرور کا عالم تھا۔ اس کا دل چاہا، کھلکھلا کر ہنسے اور وہ اس خواہش کو دبانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن سارہ کو آتے دیکھ کر اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ کھلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ جب ہی سارہ نے محظوظ اور مشکوک انداز میں ٹوکا تھا۔
"کیا بات ہے؟ نئی نئی لگ رہی ہو۔"
"میں بھی؟" اس نے بے اختیار پر شوق حیرت کا اظہار کیا۔ "میرا مطلب ہے، مجھے تو ہر شے نئی لگ رہی ہے۔"
"اس کا مطلب ہے، تم نے نئے آنے والے کے لیے دل کا دروازہ کھول دیا ہے۔" سارہ نے مسکرا کر کہا تو وہ سٹپٹا گئی۔
"کیا مطلب؟"
"مجھ سے مطلب پوچھنے کے بجائے تم بتاؤ! وہ کون ہے؟" سارہ نے اتنے یقین سے پوچھا کہ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ تم مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتیں۔ کیونکہ تمہارا چہرہ کھلی کتاب ہے۔ محبت، نفرت، پھر محبت...... ہے ناں؟" سارہ نے کہتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا ڈالی۔
"پاگل ہو تم۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اپنی جھینپ مٹانے کو بگڑ گئی۔
"اچھا! پھر میں بھائی جان سے کہہ دوں گی کہ اس لڑکی پر وقت ضائع نہ کریں۔" سارہ نے کہا تو فوراً" اسے یاد نہیں آیا۔
"کون بھائی جان؟"
ارے واہ! خود تم نے تو اسے میرا بھائی جان بنایا اور اب کون بھائی جان۔"
"اف سارہ! تم۔" وہ چکرا گئی۔
"جناب! میں اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔" سارہ کھلکھلائی۔ پھر اس کے تیور بھانپ کر بھاگ گئی۔
اریبہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ وہ جھنجلا گئی۔

☼ ☼ ☼

فطری بات تھی کہ اریبہ جب سے غائب ہوئی تھی تو اس کے بعد ہر گھائی ناگہانی کا ذمہ دار خود کو قرار دیتی تھی وہ یہ ہی سوچتی کہ اگر وہ شروع سے اچھی بیوی، اچھی ماں ہوتی تو اس کی اولاد کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔ ادھر جب سے ثنا کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی، یاسمین کا احساس جرم اور بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ ثنا سے پہلے اریبہ کو اس گھر کی بہو بننا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ ثنا کی شادی کا سن کر اسے تکلیف ہوئی تھی یا وہ حسد محسوس کر رہی تھی۔

_________ بس اسے احساس ہوتا تھا کہ اس نے اپنی اولاد کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ رشتوں کی اہمیت سمجھانے کے بجائے ہمیشہ انہیں متنفر کرتی رہی۔ جس کا خمیازہ اسے ہی نہیں، اس کی اولاد کو بھی بھگتنا پڑ رہا تھا۔ پہلے اریبہ کی منگنی ٹوٹی پھر اریبہ اور سارہ کے درمیان رنجش، اس کے بعد سارہ کی اپنی جان لینے کی کوشش نے یاسمین کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچتی، شاید اللہ نے اسے معاف نہیں کیا۔ ابھی وہ ایک صدمے سے سنبھلتی نہیں ہے کہ دوسرا دھچکا آن لگتا ہے اور گو کہ اب سب ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ سارہ پہلے کی طرح خوش اور تابعدار کے ساتھ مصروف نظر آتی تھی۔ اریبہ بھی زیادہ وقت گھر پر رہتی، دوسری طرف توصیف احمد نے بھی اپنی روٹین بنالی تھی کہ وہ روزانہ شام سات آٹھ بجے تک آجاتے، رات کا کھانا ہمیں سب کے ساتھ کھاتے پھر چائے پینے تک تینوں بچوں کے ساتھ ان کی دن بھر کی سرگرمیوں پر باتیں کرتے پھر چلے جاتے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول بن گیا تھا اور اب یاسمین کو توصیف احمد کا آنا کھلتا بھی نہیں تھا بلکہ جب تک وہ موجود رہتے، اس کے سارے ڈر خوف کہیں کرنے کھدروں میں جا چھپتے اور ان کے جاتے ہی وہ پھر خائف ہو جاتی تھی۔ عجیب بے سکونی تھی، وہ نماز میں پناہ لیتی اس کے سجدے طویل ہونے لگے۔ رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی اور اللہ تو ہے ہی مہربان۔ معاف کر دیتا ہے جب ہی معافی کے ساتھ اللہ نے یاسمین کو وہ کچھ یاد دلایا تھا، جس کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔

"اماں۔۔۔ ابا۔۔۔!" رات کے تیسرے پہر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی تو پھر تین دن اسے اپنے بستر پر لیٹنا نصیب نہیں ہوا۔ پوری پوری رات وہ کسی بھٹکی روح کی طرح چکراتی پھرتی تھی۔ سارے جرم معاف ہو گئے تھے لیکن اپنے ماں باپ کے ساتھ جو سلوک اس نے روا رکھا تھا، شاید اللہ کے ہاں اس کی معافی نہیں تھی۔ اس کے لیے پہلے اسے اپنے ماں باپ کو منانا تھا۔ اتنے برس بیت گئے تھے۔ جانے اب وہ کہاں کس حال میں تھے، اسے کچھ پتا نہیں تھا اور اس تمام عرصے میں اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ سے ضد کی پکی تھی۔ اس گھر سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے جو ماں سے کہا تھا کہ وہ کبھی پلٹ کر اس گھر کی طرف نہیں دیکھے گی، صرف اس لیے کہ ابا نے شہباز درانی کو مسترد کر کے اسے توصیف احمد کے ساتھ بیاہ دیا تھا، پھر اس نے نہ باپ کے فیصلے کو دل سے قبول کیا اور نہ ہی کبھی پلٹ کر اس گھر کی طرف۔۔۔ دیکھنا تو دور کی بات سوچا بھی نہیں اور اب پچھلے تین دنوں سے وہ صرف یہی سوچ رہی تھی کہ وہ کون سی گلی تھی، جس کے نکڑ پر ایک گھنا پیڑ تھا۔

ماضی خواہ کتنا بدصورت ہو، اپنے اندر ایسی کشش رکھتا ہے کہ انسان کو آسمانوں سے کھینچ لاتا ہے۔ وہ بے حد مضطرب ہو گئی تھی لیکن وقت اسے جس موڑ پر لے آیا تھا، اب وہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف اپنے دل کی نہیں مان سکتی تھی اور دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جائے۔

"یاسمین!" توصیف احمد نے اس کا اضطراب محسوس کرتے ہوئے اسے پکارا۔

"جی!" وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے، خاصی ڈسٹرب لگ رہی ہو۔ اریبہ بھی کہہ رہی تھی تم کچھ دنوں سے پریشان ہو۔ کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے، بچوں کی طرف سے۔" توصیف احمد نے رسان سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ اللہ کا شکر ہے، بچوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"پھر؟" توصیف احمد ہونٹوں سے سگار نکال کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

"بس وہ۔ میں کچھ دنوں کے لیے اپنے اماں ابا کے پاس جانا چاہ رہی ہوں، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا، کیسے جاؤں۔" اس نے کہا تو توصیف احمد کتنی دیر تک اسے دیکھتے رہ گئے غالباً" سوچ رہے تھے کہ اتنے برسوں بعد اسے اپنے والدین کا خیال کیسے آیا۔

"بچے تو کہ سمجھ دار ہیں۔ لیکن اب میرے اندر ڈر سا بیٹھ گیا ہے۔ میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی۔" وہ توصیف احمد کی نظروں سے جزبز ہو کر بولی تھی۔

"ہوں۔" توصیف احمد کتنی دیر تک پر سوچ انداز میں اثبات میں سر ہلاتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔

"بچوں کی فکر مت کرو۔ ان کے پاس میں ہوں۔ تم جانا چاہتی ہو ضرور جاؤ۔ بلکہ تمہیں ضرور جانا چاہیے۔"

"جی۔" توصیف احمد نے آخر میں جس طرح زور دے کر کہا، اس سے اس کا احساس جرم سوا ہو گیا تھا۔

"کب جانا چاہتی ہو؟" انہوں نے پوچھا تو وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"ابھی۔۔۔"

"ابھی۔ نہیں رات کا سفر ٹھیک نہیں ہے صبح فجر کے بعد نکلو تو دوپہر کے بعد پہنچ جاؤ گی اور اکیلے مت جانا، میں ڈرائیور بھیج دوں گا۔" توصیف احمد نے خود ہی اس کا پروگرام سیٹ کر دیا۔

"ٹھیک ہے، میں تیاری کر لیتی ہوں۔ اریبہ اور سارہ کو بھی بتا دوں۔" یاسمین اٹھ کھڑی ہوئی پھر ایک دم خیال آنے پر کہنے لگی۔ "اور ہاں ڈرائیور کو راستہ سمجھا دیجیے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ بچوں سے کہہ دینا۔ فکر نہ کریں۔ تم آرام سے جانا۔" توصیف احمد پھر اسے تسلی دے کر چلے گئے تو وہ سارہ کو پکارتے ہوئے اریبہ کے کمرے میں آگئی۔

"جی مما!" سارہ اس کے پیچھے آگئی تھی۔

"بیٹا!" وہ باری باری اریبہ اور سارہ کو دیکھ کر بولی۔ "میں صبح تمہاری نانو کے پاس جا رہی ہوں۔"

"نانو کے پاس؟" اریبہ اور سارہ دونوں حیران ہوئی تھیں۔

"ہاں بیٹا! میں نے غلط کہا تھا کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کسی کی نہیں ہوئی۔ یہ اس سے بڑا المیہ ہے کہ سب کے ہوتے ہوئے میں نے خود کو تنہا کر دیا۔" یاسمین اپنی غلط بیانی پر اب بہت نادم تھی۔

"نانو کہاں رہتی ہیں مما! یہیں کراچی میں؟" سارہ نے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں! ان کا گھر صادق آباد میں ہے۔ میں صبح نکلوں گی تو دوپہر تک وہاں پہنچوں گی۔"

"مما! ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں نا۔" سارہ نے اشتیاق سے کہا تو یاسمین اس کا گال چھو کر بولی۔

"ضرور چلنا بیٹا! ابھی میں ہو آؤں، پھر نیکسٹ ٹائم ساتھ چلیں گے، ٹھیک ہے اریبہ!"

"جی مما!" اریبہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا کیونکہ وہ بہت کچھ جان چکی تھی۔

"اچھا بیٹا! میں کچھ تیاری کر لوں پھر مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ ان شاء اللہ فجر پڑھتے ہی نکل جاؤں گی۔"

"کیسے جائیں گی مما؟" اریبہ نے پوچھا۔

"گاڑی سے۔ میرا مطلب ہے تمہارے ڈیڈی نے کہا ہے وہ ڈرائیور بھیج دیں گے۔ وہ لے جائے گا۔" یاسمین دونوں کو مطمئن کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

پریکٹیکل کے دوران ہی سمیر کی کال آنے لگی تھی۔ اس وقت تو اریبہ نے اپنا سیل فون آف کر دیا تھا پھر جب فارغ ہو کر اسپتال سے نکلی تب اس نے موبائل آن کیا تو سمیر کے تین چار ٹیکسٹ آئے ہوئے تھے۔ آخری ٹیکسٹ میں اس نے لکھا تھا کہ وہ سنڈریلا میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اریبہ نے کچھ سوچ کر گاڑی اسی راستے پر ڈال دی اور کچھ ہی دیر میں سمیر کے پاس پہنچ گئی۔

سمیر بے حد پریشان بیٹھا تھا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" اریبہ نے سمیر کی پریشان شکل دیکھتے ہی پوچھا۔

"کچھ نہیں اور کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔" سمیر نے کہا تو وہ قدرے چڑ کر بولی۔

"دیکھو میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ تمہیں جو بھی کہنا ہے صاف کہو۔"

"مجھے کہنا نہیں، پوچھنا ہے۔" سمیر اس کے مزاج سے واقف تھا، جب ہی فوراً" اصل بات پر آگیا۔

"تمہاری رازی بھائی سے بات ہوئی؟ میرا مطلب ہے وہ جو سارہ سے شادی کا کہہ رہے ہیں تو تم نے اس سلسلے میں کیا کیا؟"

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ الٹا سمیر سے پوچھنے لگی۔

"تم سارہ کو تو سمجھا سکتی ہو۔"

"سارہ خود سمجھ دار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مر تو سکتی ہے، لیکن رازی سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی اور شاید تم تک یہ بات نہیں پہنچی کہ سارہ اپنی جان لینے کی کوشش بھی کر چکی ہے۔" اس نے بتایا تو سمیر پریشان ہو گیا۔

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا کیا تھا سارہ نے؟"

"اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔" وہ جو بات سوچ کر آئی تھی، اسی طرف آگئی۔

"میرا پروگرام؟" سمیر کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"ہاں اگر سچ مچ سارہ سے محبت کرتے ہو، اس سے شادی کرنا چاہتے ہو تو آگے بڑھو۔ صرف باتیں کرنے سے تو شادی نہیں ہو جاتی۔" وہ اب سمیر کو جانچتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، میں نے امی سے بات کی ہے اور تمہیں تو پتا ہے امی سارہ کو کتنا چاہتی ہیں۔ وہ خوش ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ یاسمین آنٹی نہیں مانیں گی۔" سمیر نے درپردہ اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔ اریبہ فوراً" کچھ نہیں بولی تو وہ پوچھنے لگا۔

"تم کیا کہتی ہو۔ میں بھیجوں امی کو؟"

"نہیں، میرا خیال ہے پہلے مجھے مما سے بات کر لینے دو۔" اس نے کہا تو سمیر فوراً" بولا۔

"ہاں، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ پہلے تم یاسمین آنٹی کو کنوینس کرو پھر میں آگے بڑھوں۔"

"ٹھیک ہے مما آجائیں تو پھر میں ان سے بات کروں گی۔"

"آجائیں مطلب؟ یاسمین آنٹی کہاں ہیں؟"

"وہ آج صبح ہی صادق آباد کے لیے روانہ ہوئی ہیں۔ وہاں ان کا میکہ ہے۔" وہ بتا کر ٹائم دیکھنے لگی۔

"صادق آباد۔" سمیر نے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ نہیں جانتا۔

"ٹھیک ہے سمیر! پھر جو بھی بات ہوگی، میں تمہیں بتا دوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سنو۔۔۔ سارہ کیسی ہے؟" سمیر نے پوچھا تو وہ قدرے حیران ہوئی۔

"کیوں، تمہاری اس سے بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں! وہ میرا فون ہی ریسیو نہیں کرتی۔" وہ شاکی انداز میں بولا۔

"کوئی بات ہوئی ہے آئی مین! تم دونوں کے درمیان لڑائی جھگڑا؟"

"نہیں! بس اپنے آپ ہی وہ ناراض ہو جاتی ہے۔"

"ہاں! بس موڈی ہے۔ ویسے ابھی وہ ٹھیک ہے۔ میں اس سے کہوں گی تمہیں فون کر لے اوکے۔"

اس نے مسکرا کر سمیر کو جیسے سہارا دیا تھا پھر گھر آنے تک وہ سمیر اور سارہ کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ سمیر میں بظاہر کوئی برائی نہیں تھی، پھر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اب اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے خیال میں سارہ کے لیے نہایت موزوں تھا۔ وہ یاسمین کو اس رشتے کے حق میں ہموار کر سکتی تھی اور وہ ضرور کرے گی تاکہ رازی کا گھمنڈ توڑ سکے۔ وہ جو کہہ رہا تھا کہ مجھے سارہ سے شادی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

"ہونہہ۔۔۔!" رازی کی بات سوچ کر اس نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔ اس وقت وہ کاریڈور سے اندر داخل ہو چکی تھی اور سیدھی اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ لابی سے آتی سارہ کی آواز سن کر رک گئی۔ سارہ فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے سکون سے انتظار کیا۔ جب سارہ فون رکھ کر پلٹی تب پوچھنے لگی۔

"پہنچ گئیں مما؟"

"نہیں! کہہ رہی تھیں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گی۔" سارہ بتا کر کہنے لگی۔ "سچ اریبہ! مجھے تو بہت شوق ہو رہا ہے نانو سے ملنے کا۔ کاش! مما مجھے اپنے ساتھ لے جاتیں۔"

"لے جائیں گی۔ کہا تو ہے مما نے نیکسٹ ٹائم لے جائیں گی۔ چلو اب تم جلدی سے کھانا لگاؤ میں چینج کر کے آتی ہوں۔" وہ سارہ کا کندھا تھپک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼
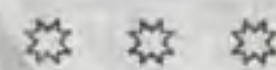
وسط مئی کی جھلسا دینے والی دوپہر تھی، جب ہی ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گو کہ بیس بائیس سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن راستے وہی تھے اور گلی کے نکڑ پر پیڑ بھی تھا۔ جسے دیکھتے ہی یاسمین سیدھی ہو بیٹھی اور جب ڈرائیور نے توصیف احمد کے بتائے ہوئے مکان کے سامنے گاڑی روکی تو یاسمین کی سانسیں بھی رک گئی تھیں۔ کاہی مائل سبز بوسیدہ دروازے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

"بیگم صاحبہ! گھر آگیا۔" ڈرائیور نے کہا لیکن اس نے سنا بھی نہیں۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ پھر ڈرائیور نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تب بھی اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ جیسے خواب کی حالت میں گاڑی سے اتر کر ادھ کھلے دروازے میں داخل ہوئی تھی مگر ڈیوڑھی میں ہی رک گئی۔ سامنے چھوٹا سا صحن جس میں چنی اینٹیں اپنی اصلی رنگت کھو چکی تھیں اور جو اس وقت براہ راست سورج کے نشانے پر تھا۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے بائیں جانب بنے کمرے کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔

"اماں!" اس نے گھبرا کر پکارا تھا۔

"کون ہے؟ اندر آجاؤ۔" اماں کی آواز نے جیسے اس کے اندر نئی روح پھونک دی تھی۔ پلک جھپکتے ہی وہ صحن پار کر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔

اماں کھردری چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں پنکھا بہت دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔

"اماں!" یاسمین نے تڑپ کر چارپائی کے پائنتی ننگی زمین پر گھٹنے ٹیکتے ہی اماں کے پاؤں پکڑ لیے اور اگلے پل وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"ارے کون ہے۔" اماں کو اٹھ کر بیٹھنے میں وقت لگا پھر اپنے پیروں سے لپٹی عورت ان کی پہچان میں نہیں آسکی۔
"ہائیں! یہ تو رو کیوں رہی ہے۔ کون ہے بتا تو؟"
"اماں! اپنی بیٹی کو نہیں پہچانتیں۔ میں ہوں یاسمین... یاسمین..." یاسمین نے اماں کے پیروں سے سر اوپر کیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔
"یاسمین!" فرط جذبات سے اماں کی آواز بھرا گئی۔ مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا تو اس کی طرف بانہیں پھیلا دیں۔
"اماں!" یاسمین فوراً" اٹھ کر ان کی بانہوں میں سما گئی۔ "اماں! مجھے معاف کردیں... مجھے معاف کردیں اماں! میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں۔"
"تو تو خوش ہے نا؟" اماں کی بات نے اس کا دل چیر کے رکھ دیا۔
"خوش؟" وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"بول نا تو خوش ہے نا میں اور تیرے ابا بھی اللہ سے بس ایک تیری خوشی ہی مانگتے رہے ہیں اور تو کچھ نہیں مانگا۔" اماں کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔
"کچھ اور مانگا ہوتا اماں! کچھ اور مانگا ہوتا۔" اس کے رونے میں شدت آگئی۔ "خوشیاں نصیب والوں کو راس آتی ہیں۔ مجھ جیسے بدنصیب سنبھال نہیں پاتے۔"
"یہ تو کیا کہہ رہی ہے بیٹی؟" اماں پریشان ہو گئیں تو وہ فوراً" ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ کر بولی۔
"کچھ نہیں۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "ابا کہاں ہیں؟"
"ابا!" اماں نے گہری آہ کھینچی۔ "تیرے ابا تو کب کے رخصت ہو گئے۔" اس کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔
"ہاں! آٹھ سال ہو گئے۔ بہت یاد کرتے تھے تجھے۔"
"یا اللہ!" اس نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔ "مجھے آنے میں اتنی دیر ہو گئی۔"
"تیرے بچے ٹھیک ہیں... بیٹیاں، بیٹا۔ تین بچے ہیں نا تیرے؟" اماں نے کہا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔
"آپ کو کیسے پتا اماں کہ میرے تین بچے ہیں؟"
"توصیف نے بتایا تھا۔" اماں کے سیدھے سادے جواب نے اسے ششدر کردیا۔
"توصیف نے...؟"
"ہاں پہلے تو بہت آتا تھا توصیف... پھر پتا نہیں کوئی بات بری لگی یا کیا ہوا۔ وہ بھی ادھر کا راستہ بھول گیا۔ خیر اللہ خوش رکھے۔ تیرے ساتھ تو اچھا ہے نا؟"
"جی!" وہ نظریں چرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"لے... میں نے یہ تو پوچھا نہیں کہ تو کس کے ساتھ آئی ہے۔" "نہیں اب یاد آیا" اور تجھے گرمی بھی لگ رہی ہوگی۔ چل بیٹھ میں تیرے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آتی ہوں۔"
"میں لے لوں گی پانی، آپ بیٹھی رہیں۔" اس نے اماں کو اٹھنے سے روک دیا پھر پوچھنے لگی۔
"آپ نے کھانا کیا کھایا؟"
"گرمی سے بھوک کہاں لگتی ہے۔ بس سویرے ناشتا کرکے بیٹھی ہوں۔" اماں کا جواب سنتے ہی وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" ڈیڑھ دو گھنٹے بعد یاسمین واپس آئی تو اس کے پیچھے بڑے بڑے شاپرز اٹھائے ڈرائیور کو آتے دیکھ کر اماں جو یاسمین کے اچانک چلے جانے سے پریشان بیٹھی تھیں نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگیں۔
یاسمین نے ڈرائیور سے ہی سب سامان رکھوایا پھر اسے جانے کا کہہ کر اپنی قمیص کے دامن سے خود کو ہوا دیتے ہوئے بولی۔
"توبہ اماں! یہاں اتنی گرمی پڑتی ہے۔"
"تو یہ سب کیا اٹھا لائی ہے؟" اماں ابھی تک حیران بیٹھی تھیں۔
"بس اب آپ یہاں نہیں رہیں گی۔ میرے ساتھ چلیں گی۔" جس طرح اماں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اسی طرح وہ بھی ان سنی کر گئی تھی۔
اماں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئیں۔
"میں پہلے نہالوں پھر کھانا کھاتے ہیں۔" یاسمین پسینے میں شرابور تھی۔ جلدی سے بیگ کھول کر اپنے کپڑے نکالے لیکن پھر رکھ دیے۔ اس بلا کی چبھتی ہوئی گرمی میں کاٹن لان پہننا محال تھا کہاں ریشمی۔ بیگ بند کرکے اس نے اماں کا ٹرنک کھول لیا جس میں گنتی کے تین جوڑے رکھے تھے۔ وہ ہلکا جوڑا نکال کر کمرے سے نکل آئی۔
دھوپ کی شدت میں اب کچھ کمی آگئی تھی۔ اس نے ہینڈ پمپ سے پانی کی بالٹی بھر تو لی لیکن پھر بالٹی باتھ روم تک لے جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔
"کیا مصیبت ہے۔"
وہ جھنجلائی، پھر بالٹی دھکیل کر کپڑوں سمیت وہیں ہینڈ پمپ کے نیچے بیٹھ گئی اور ٹھنڈا شفاف پانی سر پر ڈالتے ہی وہ اچانک بہت پیچھے چلی گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تیزی آگئی۔ پانی کے بھر بھر ڈول خود پر بہائے پھر ایک ہاتھ سے ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے کتنی دیر وہ پانی کی موٹی دھار کے نیچے بیٹھی رہی۔ روح تک میں ٹھنڈک اتر آئی تھی اور جب اس نے اماں کا جوڑا پہنا تو اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ٹخنوں سے کافی اونچی شلوار اور ایسے ہی اونچا ڈھیلا ڈھالا کرتا۔
"یاسمین!" اسے لگا جیسے ابا پکارتے ہوئے اندر آئے ہوں۔ یہی وقت تھا اور وہ اسی جگہ کھڑی تھی، جب ابا نے اندر آتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ ان کے پیچھے توصیف احمد تھے، جو اسے دیکھ کر ڈیوڑھی میں ہی رک گئے تھے۔ اس کی نظریں ڈیوڑھی کی طرف اٹھ گئیں اور دل نے شدت سے آرزو کی کہ کاش وہ وقت لوٹ آئے۔
"یاسمین!" اندر سے اماں نے پکارا تب وہ چونکنے کے ساتھ ہی تیزی سے اندر آئی تھی۔
"جی اماں..."
"پھر کہاں چلی گئی تھی؟"
"کہیں نہیں اماں! نہا رہی تھی۔" وہ کہہ کر پھر تیزی سے پلٹی اور کچن سے دو چار پلیٹیں اٹھا لائی۔ پھر ان کے پاس بیٹھ کر شاپر میں سے کھانا نکالا اور اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر انہیں کھلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"اماں! گھر کا راشن پانی کیسے چلتا ہے؟"
"اللہ دیتا ہے۔" اماں نے اطمینان سے کہا۔
"اللہ تو دیتا ہے لیکن وہ اوپر سے تو نہیں پھینکتا کوئی ذریعہ بناتا ہے۔ ابا کے بعد کون خیال کررہا ہے آپ کا؟" وہ بظاہر سیدھے سادے انداز میں پوچھ رہی تھی لیکن اس کے اندر عجیب پکڑ دھکڑ مچی تھی۔
"پتا نہیں بیٹی! مجھے تو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ڈاکیا چھ سات ہزار دے جاتا ہے۔ کہتا ہے اماں تمہارا منی آرڈر آیا

ہے اور پیسے تھما کر چلتا بنتا ہے۔" اماں نے بتایا تو وہ حیران ہو گئی۔
"کون بھیجتا ہے۔ آپ نے کبھی ڈاکیا سے پوچھا نہیں؟"
"لے۔۔۔ کتنا پوچھتی ہوں۔ کبھی کسی کا نام لیتا ہے کبھی کسی کا۔ میں تو جانتی بھی نہیں۔" اماں یوں بتا رہی تھیں جیسے اب ان کے لیے یہ بات کوئی معنی نہ رکھتی ہو جبکہ ابتدا میں وہ بھی اس طرح حیران ہوئی تھیں جیسے اب یاسمین بیٹھی تھی۔
"کوئی رسید وغیرہ۔ میرا مطلب ہے ڈاکیا نے کبھی آپ کو کوئی پرچی بھی دی؟"
"ہاں کبھی دیتا ہے کبھی نہیں دیتا۔ چل اب تو کھانا کھا کیا پڑتالیں کرنے بیٹھ گئی ہے۔" اماں نے ٹوکتے ہوئے یاسمین کے ہاتھ سے نوالہ لے کر اسی کے منہ میں ڈال دیا۔
"بس ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ پانی سے نوالہ نگل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے تربوز کاٹ کر پلیٹ اماں کے سامنے رکھی پھر لکڑی کا چھوٹا سا صندوق جس میں ابا کے ضروری کاغذات اور شاید اب اماں بھی کاغذ وغیرہ ڈالنے لگی تھیں کھول کر اس میں رسید تلاش کرنے لگی' اس کا تجسس فطری تھا۔ جلد ہی اس کے ہاتھ منی آرڈر کی رسید آگئی جس پر بھیجنے والے کا نام نعیم احمد لکھا تھا۔
"نعیم احمد۔۔۔!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ ذہن پر زور دینے لگی۔ نام کچھ سنا سنا لگ رہا تھا اور پھر ایک دم اسے یاد آگیا۔
نعیم احمد توصیف احمد کے آفس میں کیشئر تھا۔

☼ ☼ ☼

"سنو! بھائی جان آئے ہیں۔" سارہ نے اریبہ کے کمرے میں جھانک کر اسے اطلاع دی تو وہ چونک کر بولی۔
"شمشیر علی۔ وہ کیوں آیا ہے؟"
"کیونکہ یہاں اس کی بہن رہتی ہے بلکہ اب دو بہنیں۔ لیکن بہنوں کا تو سمجھو بہانہ ہے اصل میں وہ تم سے۔۔۔"
"سارہ!" اس کے ٹوکنے پر سارہ ہنسنے لگی۔
"جاؤ۔ تاجور کو ملوا دو اس سے۔" وہ انجان بننے کی کوشش میں ناکام ہونے لگی تو بیڈ کارنر کا دراز کھول کر اس میں ہاتھ مارنے لگی۔
"تاجور باتھ لے رہی ہے اور تمہیں پتا ہے۔ میں کسی سے بات نہیں کر سکتی لہٰذا اپنے مہمان کو تم ہی نبٹاؤ۔"
سارہ کہہ کر وہیں سے پلٹ گئی تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ شام اتر رہی تھی توصیف احمد کسی بھی وقت آسکتے تھے اور جانے شمشیر علی کو یہاں دیکھ کر وہ کیا سمجھیں۔۔۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی اور آتے ہی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔
شمشیر علی اور توصیف احمد ساتھ ساتھ اندر آرہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

یہی نہیں کہ زخمِ جاں کو چارہ جُو ملا نہیں
یہ حال تھا کہ دل کو اسمِ آرزو ملا نہیں

ابھی تلک جو خواب تھے، چراغ تھے، گلاب تھے
وہ رہگزر کوئی نہ تھی کہ جس پہ تُو ملا نہیں

تمام عمر کی مسافتوں کے بعد ہی کھُلا
کبھی کبھی وہ پاس تھا جو چار سُو ملا نہیں

وہ جیسے اک خیال تھا جو زندگی پہ چھا گیا
رفاقتیں تھیں اور یوں کہ روبرو ملا نہیں

تمام آئنوں میں عکس تھے مری نگاہ کے
بھرے نگر میں ایک بھی مجھے عدو ملا نہیں

وہ کیسی آس تھی ادا جو کُو بکُو لیے پھری
وہ کچھ تو تھا جو دل کو آج تک کبھو ملا نہیں

ادا جعفری

آندھیوں کے سفر میں شکستہ ہیں ہم
کون جوڑے ہمیں
کوئی اپنا مسیحا نہیں
جس کی زندہ صدا گرد آلود چہروں کو تازہ کر دے
کوئی ایسا شناسا نہیں
جس کا اک لمس ہی جسم و جاں کے اندھیرے
میں روشن ستارہ بنے
اک مدّت سے ہم
اپنے ہاتھوں پر حرفِ دُعا لکھ کے پیاسے
کھڑے ہیں
کہ بارش کے موسم
کہیں دُور صحرا میں گُم ہو گئے ہیں

جاذب قریشی

شگفتہ جاہ

رنگارنگ کھیل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے اُمّ المومنین ام سلمہؓ نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ نے جو زہریلی بکری کا گوشت کھایا تھا، اس کی وجہ سے آپؐ کو ہر سال تکلیف ہو جاتی ہے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے اس کی وجہ سے جو تکلیف پہنچی ہے، وہ تو اس وقت میری تقدیر میں لکھی جا چکی تھی جبکہ آدم علیہ السلام ابھی مٹی (کی شکل) میں تھے۔"

صحابہ کرام،

حضرت شیخ اکبر نے فرمایا۔

صحابہ کے کمال عقل کی ایک یہ بات ملاحظے کے قابل ہے کہ انہوں نے مختلف مقامات پر جتنی بھی مسجدیں بنائیں۔ سب کا قبلہ درست ہے حالانکہ اس وقت نہ ان کے پاس قطب نما تھا۔ نہ جغرافیہ، نہ وہ مہندس تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی نقشہ تھا۔ بڑے بڑے عقل دار ماہر انجینئر جو بعد کو پیدا ہوئے جن کا مشغلہ اور کوشش یہی ہے کہ اسلام میں کوئی نقص پیدا کریں اور اس کی کوئی خامی ڈھونڈیں وہ بھی ان میں کوئی عیب تلاش نہ کر پائے۔

(اشفاق احمد اقتباس بابا صاحبا)
نوال افضل گھمن۔ گجرات

یقین کامل،

اشفاق احمد کہتے ہیں۔

میرے پاس ایک بلی تھی۔ اس کو جب بھی بھوک لگتی تھی وہ میرے پیر چاٹتی تھی اور میں اس کو کھانا دیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے سوچا کہ یہ بلی مجھ سے ... ہے۔ اس کو پورا یقین ہے کہ اپنے مالک کے پاس ... اس کی طلب پوری ہوگی اور انسان کو یقین نہیں ... ہر فکر اپنے ذمے لے لیتا ہے، اُن کاموں میں بھی ... اس کے اختیار میں نہیں۔ اپنی ہر طلب اللہ سے مانگو ... قبولیت کا مکمل یقین رکھو۔

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

تین چیزیں،

دُنیا میں مردوں کو زندہ رہنے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

، دولت، بیوی اور بیوی سے چھٹکارا۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

ہم سنائیں دل کی کتاب،

، تجربات کا، لوگوں کا، حادثات کا کچھ طے نہیں ہے وہی تجربہ جو ایک شخص کو کندن بنا تا ہے، کسی دوسرے کو چکنا چور کر دیتا ہے۔

، اس دُنیا میں شاید آدمی اسی کا رشتہ دار ہوتا ہے جس کو وہ یاد کرے، کرتا رہے، کرتا ہی چلا جائے۔

، چیزیں خریدنے میں کتنی لذت ہوتی ہے چاہے وہ پرانی ہوں۔

، منزلوں کو پالینا بھی کتنی بڑی قیامت ہے۔ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے خود منزل بھی۔

، غصے اور نفرت کی انتہا ہو تو آدمی پر کٹے کبوتر کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ اُڑ سکتا ہے، نہ اُڑنے کی سوچ سکتا ہے۔ پھر اس کا غصہ نفرول اور

جملوں پر نکلتا ہے۔ وہ سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کبھی صرف دل میں کبھی دوسروں کے سامنے۔ پھر لفظ بھی دم توڑ دیتے ہیں۔ اٹھائے نہیں اُٹھتے دم دے دیتے ہیں۔

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

عائشہ۔ گوجرہ

التجا،

بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ سے لہجے میں کہا۔

"اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو ٹکر مارنا۔"

بھکاری،

بوعلی سینا جب گھر سے نکلا تو اسے بے ساختہ ہنسی آرہی تھی۔ کسی دوست نے پوچھا۔

"بوعلی! تمہیں ہنسی کیوں آرہی ہے؟"

بوعلی سینا نے جواب دیا۔ "آج میری چھوٹی بچی نے مجھ سے ایک درہم مانگا۔ میں نے معذرت کی اور کہا۔ میری جیب خالی ہے۔ اس لیے میں درہم نہیں دے سکتا۔ میری بیٹی بگڑ گئی اور غصے میں ماں سے کہا۔ "اماں! کیا دُنیا کے سارے امیر مر گئے تھے جو آپ نے اس بھکاری سے شادی کر لی۔"

مریم شہباز۔ کراچی

احمق،

ایک آدمی نے اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہوئے راستے میں دیکھا کہ ایک کم عمر لڑکا ایک ٹھیلے کو دھکیلتے ہوئے بڑی سی چڑھائی عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ازراہ ہمدردی آدمی نے لڑکے کے ساتھ مل کر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ دونوں کو ڈھلوان عبور کرنے میں دانتوں تلے پسینہ آگیا۔ دوسری طرف پہنچنے پر آدمی نے لڑکے سے پوچھا۔

"تمہیں اتنا وزن دے کر کس نے بھیجا ہے؟"

"میرے باپ نے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

آدمی نے کہا۔ "اس نے سوچا نہیں کہ وزن تمہاری بساط سے زیادہ ہے اور راستے میں بڑی سی چڑھائی بھی آتی ہے۔ تم اکیلے بھلا کیسے عبور کر سکتے تھے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "ابا نے کہا تھا کہ تم ٹھیلا لے کر روانہ ہو جاؤ، راستے میں ضرور کوئی احمق مل جائے گا جو تمہارے ساتھ لگ جائے گا۔"

سائرہ مہناز شاہد۔ بورے والا

موتی مالا،

- دریا عبور کرنے کے لیے کشتی ضرور سبب ہے لیکن گرداب سے نکلنے کے لیے دُعا کا سفینہ چاہیے۔
- اپنے اعمال کو دُعا کے سہارے سے محروم نہ ہونے دیا جائے۔
- ہمارے اعمال کیا اور نتیجے کیا۔ اُس کا فضل نہ ہو تو انسان کچھ بھی نہیں۔
- زندگی صرف اصول ہی نہیں۔ حسن بھی ہے، محبت بھی ہے، جلوہ بھی ہے۔
- خالق کا عمل زندگی میں شامل رہتا ہے اور خالق کا عمل کسی سبب کا محتاج نہیں۔
- حادثہ سبب کو نتیجے سے محروم کرنے والے واقعے کا نام ہے اور زندگی حادثات کی زد میں رہتی ہے۔
- سکون یا اطمینان محنت کا نتیجہ نہیں یہ نصیب کی عطا ہے۔
- بے عقیدہ انسان صرف سبب کو مانتا ہے اور صاحب عقیدہ انسان سبب پیدا کرنے والے پر ایمان رکھتا ہے۔
- جہاں سبب اور نتیجہ کی سائنس ختم ہوتی ہے وہاں سے رضا اور نصیب کی حد شروع ہوتی ہے۔
- اسباب و نتائج کا کھیل رضا اور قضا کی زد میں رہتا ہے۔
- کائنات کے بڑے مضامین میں نہ پڑو، بلکہ چھوٹی

چھوٹی باتوں پر توجہ دو۔ اس کو راضی رکھو جو ہم عمر ہو چاہے وہ ہم خیال نہ بھی ہو۔
توبہ منظور ہو جائے تو گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔
موت سے زیادہ خوفناک شے موت کا ڈر ہے۔

(واصف علی واصف)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

اقوال زریں،

- کتابیں انسان کی بہترین رفیق اور مونس ہیں۔
(ایمرسن)
- ہم دولت سے کتابیں حاصل کر سکتے ہیں علم نہیں۔
(بقراط)
- کتابیں نہ صرف ہمیں زندگی کی سیر کرا سکتی ہیں بلکہ گزری ہوئی باتیں بھی بتاتی ہیں۔
(حکیم محمد سعید)
- کپڑے چاہے پرانے پہنو لیکن نئی نئی کتابیں ضرور خریدو۔
(بائبل)

مدیحہ نورین۔ برنالی

ہیٹ،

ریگستان میں ایک بار ریت کا بہت بھیانک طوفان آیا ہوا تھا۔ ہفتہ بھر سے مسلسل ریتلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایک آدمی اونٹ پر سوار جا رہا تھا کہ اسے ریت پر ایک ہیٹ پڑا دکھائی دیا۔ اس نے ہیٹ اٹھایا تو نیچے ایک آدمی کا سر اور بال نظر آئے۔ آس پاس کی ریت جھاڑی تو منہ، ناک، کان بھی نظر آئے۔ تو پھر اس ہیٹ والے آدمی نے نرم لہجے میں کہا۔
"ہاتھ سے کام نہیں چلے گا، بھاوڑا لے کر ریت ہٹائیے کیونکہ میں ابھی آپ کی طرح اونٹ پر بیٹھا ہوں۔"

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران۔ گجرات

پہچانا ہی نہیں،

"بیگم! تمہیں یاد ہے، کالج کے دنوں میں ایک لڑکا حامد ہماری کلاس میں پڑھتا تھا۔ ادبی کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ وہی جو تم سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔" شوہر نے ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔
"ہاں مجھے یاد ہے۔ یہ تقریباً تیس سال پرانی بات ہے۔"
بیوی نے تائید کی تو شوہر نے حیرانی سے کہا۔
"آج اتفاق سے اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ تو اتنا موٹا، گنجا اور بدہیئت ہو گیا ہے کہ اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔"

جواب شکوہ،

"میں تم جیسے کتابی کیڑے سے شادی تو دور کی بات ہے، منگنی کا بھی تصور نہیں کر سکتی۔ تمہارے دل میں کوئی امنگ ہے نہ ترنگ۔ اس لیے برائے مہربانی تم میرے خطوط واپس کر دو۔" اردو کے پروفیسر کو اس کی محبوبہ نے چھیڑتے ہوئے کہا۔
"مجھے بھی تمہارے لکھے ہوئے خطوط اپنے پاس رکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اردو کی لکھائی بہت خراب ہے۔ تمہارا خط پڑھنے کے لیے کئی گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ اور خدا کی پناہ ..... تم ایک پیرے میں چھ سات غلطیاں کیسے کر لیتی ہو۔ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ میں تمہارے پیچیدہ خطوط پڑھوں۔ تم بے فکر رہو۔ میں ابھی گھر جا کر تمہارے تمام خطوط لے کر آتا ہوں۔" پروفیسر نے تنک کر جواب دیا۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

سرورق کی شخصیت

ماڈل	نیناں
ٹرانسپرنسی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

امت الصبور

یادوں کی ڈائری

سمیرا یوسف کی ڈائری سے

جناب فیض احمد فیض نے سانحہ مشرقی پاکستان پر ایک مایہ ناز نظم کہی تھی جو اس صوفی شاعر کے دل کی آواز اور فریاد تھی۔ خون کے یہ دھبے بڑھتے ہی جا رہے ہیں، پھیلتے جا رہے ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

فرحانہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی غزل آج کے حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ یقیناً آپ بھی متفق ہوں گے۔

قتل چھپتے تھے کبھی سنگ کے دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ

اپنی پوشاک کے چھن جانے پر افسوس نہ کر
سر سلامت نہیں رہتے یہاں دستار کے بیچ

سرخیاں امن کی تلقین میں مصروف رہیں
حرف بارود اگلتے رہے اخبار کے بیچ

جس کی چوٹی پہ بسایا تھا قبیلہ میں نے
زلزلے جاگ اٹھے ہیں اسی کہسار کے بیچ

کاش اس خواب کو تعبیر کی مہلت نہ ملے
شعلے اگلتے نظر آئے مجھے گلزار کے بیچ

رزق، ملبوس، مکاں، سانس، قرض، مرض، دوا
منقسم ہو گیا انسان انہی افکار کے بیچ

دیکھے جاتے نہ تھے آنسو مرے جس سے محسن
آج ہنستے ہوئے دیکھا اسے اغیار کے بیچ

فارحہ اقبال کی ڈائری سے

سعود عثمانی جن کے لیے اردو کے سب سے بڑے نقاد مشفق خواجہ مرحوم نے کہا تھا کہ "ایسا شاعر کہاں سے آ گیا جس نے غزل کے مستقبل سے میری مایوسی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔" انہوں نے دورِ آمریت میں آمر کی فطرت پر جو نظم کہی تھی، قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

بھیڑیے کی فطرت سے وحشتیں نہیں جاتیں
زور ٹوٹ جاتا ہے، عادتیں نہیں جاتیں
دانت جاتے رہنے سے خصلتیں نہیں جاتیں
شیر کی شریعت میں خوں بہانے والوں کو خوں بہا نہیں ملتا ہے

ایک شکار کرنے پر دوسرا بھی ملتا ہے
اژدہے کے مذہب میں بے اماں مکینوں پر آ بسی
تصرف کا حق ہمیشہ رہتا ہے
پرندوں کی آنکھوں میں عمر طولوی ہونے تک زرد حرص رہتی ہے
سانپ کی طبیعت پر ستم رسیدہ لوگوں کا کوئی غم نہیں ہوتا
سانپ کے لیے کوئی محترم نہیں ہوتا
کینچلی بدلنے سے زہر کم نہیں ہوتا

انیقہ انا کی ڈائری سے

اس میں کوئی شک نہیں کہ جان سے عزیز زبان اردو کا دامن غزل کے بیش بہا خزانوں سے بھرا ہے۔ مانا کہ جدید دور میں غزل کے لب و لہجے میں خوب تبدیلیاں آئیں مگر پھر بھی جو مزا کلاسیکی شاعری میں ہے، اس کی بات ہی الگ ہے نا۔ زبان کی چاشنی، الفاظ کا ترنم اور ردیف و قافیے... ایسی ہی ایک غزل، داغ دہلوی کے کلام سے (میری پسندیدہ)

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جاں صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

نہ مزہ ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں
کوئی غیر غیر ہوتا، کوئی یار، یار ہوتا

یہ مزہ تھا دل لگی کا، کہ برابر آگ لگتی
نہ تمہیں قرار ہوتا نہ ہمیں قرار ہوتا

تیرے وعدے پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

سعدیہ نازلی دعا کی ڈائری سے

پروین شاکر خوشبو، رنگوں، جگنوؤں، تتلیوں کی شاعرہ۔

ان کی نظم "بے یقینی کی ایک نظم" مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ سب کو بھی پسند آئے گی۔

نہ کوئی عہد، نہ پیمان، نہ وعدہ ایسا
نہ تیرا حسن ہی ایسا کوئی انگشت تراش
نہ میرے ہاتھ میں تاثیرِ زلیخائی ہے
رقص گہ ہے یہ جہاں اور نہ میں سنڈریلا ہوں
نہ تو شہزادہ ہے
ہم تو بس رزم گہِ ہستی میں
دو مبارزِ دل ہیں
اس تعلق کا کوئی رنگ اگر ہے تو حریفانہ ہے
ایک ہی تھال سے چننی ہے ہمیں نانِ جویں
ایک ہی سانپ کے منہ سے ہمیں من چھیننا ہے
اور اس کشمکشِ رزق میں موہوم کشائش کی کلید
جس قدر میری قناعت میں ہے
اتنی تیری فیاضی میں
میں تیری چھاؤں میں پروان چڑھوں
اپنی آنکھوں پہ ترے ہاتھ کا سایہ کر کے
تیرے ہمراہ میں سورج کی تمازت دیکھوں
اس سے آگے نہیں سوچا دل نے
پھر بھی احوال یہ ہے
اک بھروسا ہے کہ دل سبز کیے رکھتا ہے
ایک دھڑکا ہے کہ خوں سرد کیے رہتا ہے

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

شنگرف اعجاز ـــــــ کراچی

نہ اجنبی نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں
جو صدمے ہم پہ گزرتے ہیں، وہ تو گزریں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے، آپ تو جائیں

عینی سحر ـــــــ ہری پور ہزارہ

غرورِ جاں کو مرے یار بیچ دیتے ہیں
قبا کی حرص میں دستار بیچ دیتے ہیں
یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خواہشوں کے لیے
تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں

یاسمین ظفر ـــــــ لاہور

سرو صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں
جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جلتے ہیں

نمرہ، اقرأ ـــــــ کراچی

میں کیا بتاؤں کہ کیوں اس نے بے وفائی کی
مگر یہی کہ کچھ ایسا مزاج اس کا تھا
ہمیں بھی دکھ ہے دلِ زندہ دل کے مرنے کا
کسی کے پاس مگر کب علاج اس کا تھا

پرمہ بلوچ ـــــــ بدین

اسی عرصۂ شبِ تار میں
یونہی ایک عمر گزر گئی
کبھی روزِ وصل بھی دیکھتے
یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

وفا ان دنوں کی بات ہے فراز
جب لوگ سچے اور مکان کچے ہوا کرتے تھے

عاصمہ رمضان ـــــــ گجرات

کون پڑھتا ہے جھوٹی روشنائی سے لکھا ہوا سچ
آج قلم توڑ دیا، لکھنا چھوڑ دیا میں نے

زوباریہ خالد ـــــــ لاہور

سوچا تھا اس سے بچھڑیں گے تو مر جائیں گے
جان لیوا خوف تھا ہوا بھی کچھ نہیں اور ہا بھی کچھ نہیں

نیلم شہزادی ـــــــ سرگودھا

نہ سماعتوں میں تپش گھلے نہ نظر کو وقفِ عذاب کر
جو سنائی دے اسے چپ سکھا جو دکھائی دے اسے خواب کر
میرے صبر پہ کوئی اجر کیوں، میری دوپہر پہ کوئی ابر کیا
مجھے اوڑھنے دے اذیتیں، میری عادتیں نہ خراب کر

ارم احمد ـــــــ لاڑہ

ذرا دیکھو تو دروازے پہ دستک کون دیتا ہے
محبت ہو تو کہنا کہ یہاں اب ہم نہیں رہتے

سعدیہ کنول سعدی ـــــــ تونسہ شریف

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

نوال افضل گلمن ـــــــ گجرات

چلے ہو ساتھ تو ہمت نہ ہارنا واصف
کہ منزلوں کا تصور میرے سفر میں نہیں

انیقہ انا ـــــــ چکوال

یہ تیرے خط، تیری خوشبو، یہ تیرے خواب و خیال
متاعِ جاں ہیں ترے قول اور قسم کی طرح
گزشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح

مہک علی ـــــــ لاہور

وہ پاس نہیں احساس تو ہے، اک یاد تو ہے، اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو، تنکے کا سہارا کیسا ہے

ساجی عاصم ـــــــ ٹنڈو آدم

دو چار دن کی بات نہیں منصبِ جنوں
برسوں میں جا کے رابطۂ سنگ و سر ہوا

صومیہ نذیر ـــــــ ہری پور ہزارہ

میرا درد کیسے وہ جانتا، میری بات کیسے وہ مانتا
وہ تو خود فنا کے سفر میں تھا، اُسے روکنا بھی محال تھا
وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی، میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
اُسے میری چپ نے رلا دیا، جسے گفتگو میں کمال تھا

مصباح، مسکان، امینہ ـــــــ جہلم

جو پل ہیں میسر انہیں جی لو تم آج
ہے نہ پل کی خبر نہ کل کا بھروسا
جو اپنے ہیں پاس ان کی قدر کا کچھ احساس
ہے نہ سانس کی خبر نہ حالات کا بھروسا

مسکان شاہ ـــــــ گکھڑالی

ہم جو پاگل تھے تو بے وجہ نہیں تھے پاگل
ایک دنیا تھی مگر اس کی دِوانی لوگو
حیلہ جو ویسے بھی ہوتے ہیں زمانے والے
اس پہ آئی نہ نہیں بات چھپانی لوگو

آنسہ شبیر عطاریہ ـــــــ ڈوگہ

کیا اسی بھول کو کہتے ہیں محبت کا زوال
اب مجھے یاد نہیں سالگرہ بھی تیری
یونہی دو دن کی ملاقات پہ اترا نہ فراز
ہے کہیں یاد کی محفل میں جگہ بھی تیری

انیقہ انا ـــــــ چکوال

مل گئے ہو تو چلو رسمِ زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پرسشِ احوال سے کیا ہوتا ہے
ہاتھ پہ ہاتھ نہ رکھ، دل کی صداقت کو پرکھ
ورنہ پیمانِ رفاقت سے بھی کیا ہوتا ہے

اُم کلثوم ـــــــ رائے، اختر آباد

ہوئی جو شام تو پھر تیرے در پہ آ بیٹھا
میں شال اوڑھ کر اک مہربان اداسی کی
تمام شہر ہے اک کشمکش کے موسم میں
دلوں میں ٹھہر گئی ہے خزاں اداسی کی

نرمین لودھی ـــــــ سرگودھا

یہ دل جو تجھ کو بظاہر بھلا چکا بھی ہے
کبھی کبھی ترے بارے میں سوچتا بھی ہے

مناہل تبسم ـــــــ سرگودھا

زندگی کی گھپ اندھیری رات میں
یاد کی ایک پھلجھڑی اچھی لگی
شہرِ دل اور اتنے لوگوں کا ہجوم
وہ الگ سب سے کھڑی اچھی لگی

ثمینہ کوثر عطاری ـــــــ ڈوگہ

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے
اس کی وہ جانے، اسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

سیدہ حنا بخاری ـــــــ حیدر آباد

کہنا اسے کہ خواب کے دھارے اداس ہیں
اس رات میں ہیں جتنے ستارے اداس ہیں
اے کاش! کوئی آنکھ کا پانی اچھال دے
دریا کے پاس پیاس کے مارے اداس ہیں

عظمیٰ جبیں ـــــــ ٹنڈو جان محمد

کوئی ملگجی سی، عجیب سی کوئی چیز شاید زندگی
بڑی دور بھی، میرے پاس بھی کوئی چیز شاید زندگی

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

عذابِ جاں ہیں غلط فہمیاں محبت میں
نہ اب قرار سے وہ ہیں نہ اب قرار سے ہم

امبر گل ـــــــ جھڈو (سندھ)

ہم سے وعدہ کیا تھا اک سویرے کا
ہائے کب مکر گیا سورج
ڈوبتے وقت زرد تھا اتنا
لوگ سمجھے مر گیا سورج

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

کنول رانا۔۔۔ فیصل آباد

ہمیں شمارہ ذرا دیر سے ملتا ہے' اس لیے میں ہر ماہ کے شمارے پر تبصرہ نہیں کر سکتی۔ اس ماہ کا شمارہ بہت عمدہ تھا خاص کر "زمین کے آنسو" یہ ناول مجھے بہت پسند ہے۔ باقی سارا رسالہ بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس سے انسان کو ہر چیز ملتی ہے۔ آپی جی! میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر میں کچھ لکھ کر ارسال کروں تو کیا آپ شائع کر دیں گی؟

ج۔ پیاری کنول! ہمیں اندازہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر خواتین ڈائجسٹ بہت لیٹ پہنچتا ہے۔ جس کی بنا پر ہماری بہت سی قارئین شرکت سے محروم رہ جاتی ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ ہمیں کہانی لکھ کر بھجوادیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔

مہوش صفدر عباسی۔۔۔ گاؤں میراحسنال ایبٹ آباد

میرا خواتین سے تعلق گو کہ بہت پہلے سے ہے غالباً" تب سے جب میں 7th یا 8th میں تھی لیکن وہ تعلق مستقل بنیادوں پر نہ تھا۔ اب اس رسالے کی مسلسل قاری ہوں اور (ان شاء اللہ) اب رہوں گی بھی۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ اس رسالے نے مجھے ایک الگ شناخت' ایک الگ پہچان دی ہے تو غلط نہ ہو گا۔
یوں تو خواتین ڈائجسٹ میرے لیے ایک مکمل ادارے کی سی حیثیت رکھتا ہے اور میری زندگی کے تمام پہلوؤں پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میرے اٹھنے بیٹھنے' پہننے اوڑھنے اور عام بول چال کی طرز میں بھی اس ادارے کا خاص کردار ہے۔ تاہم میں اس رسالے کا اپنی زندگی پر اثر انداز ہونے والے صرف ایک پہلو کا ذکر خاص طور پر یہاں کرنا چاہوں گی۔
مجھے یاد ہے کہ بہت عرصہ پہلے غالباً" جب 10th میں تھی تو میں نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ہیروئن کے ڈائیلاگز تھے۔ ہیروئن اپنی دوست کی ایک بات پر کہہ رہی ہوتی ہے کہ
"میں جب کسی لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پر جانے یا اس کے ساتھ بیٹھنے کا تصور بھی کرتی ہوں تو فوراً" میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ کل جب اسی جگہ اسی طرح میری بیٹی کسی لڑکے کے ساتھ ہو گی تو پھر۔۔۔" ان الفاظ کی یہ ترتیب تو مجھے یاد نہیں رہی لیکن ان الفاظ کا مفہوم مجھے تب ہی بہت اچھی طرح ازبر ہو گیا تھا اور پھر کالج سے لے کر یونیورسٹی تک' یونیورسٹی کے بلاکس کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے۔ لان اور گراؤنڈز میں غرض ہر جگہ یہ مفہوم مجھے ہمیشہ یاد رہا اور ان شاء اللہ رہے گا' میں صرف اس ایک بات کے لیے اس میگزین کا احسان کبھی فراموش نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے ذاتی طور پر مووی یا ڈرامہ دیکھنے کی نسبت ڈائجسٹ وہ بھی خواتین جیسا معیاری ڈائجسٹ پڑھنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

ج۔ پیاری مہوش! آپ کا خط ہمارے لیے خوشی کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کا بھی باعث ہے۔ تحریروں کا انتخاب کرتے ہوئے جو پہلی بات ہمارے مدنظر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ ایسی تحریریں شائع نہ کی جائیں جو ہمارے مذہب' اخلاق' تہذیب' روایات اور اقدار کے منافی ہوں اور یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہماری مصنفین بھی بہت سمجھ دار ہیں اور اس بات کا خیال رکھتی ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ثمینہ کوثر عطاری۔۔۔ صیانو شاہی ڈوگہ گجرات

افسوس ہمارے اشعار شامل نہ تھے۔ رنگا رنگ پھول میں ہمارا ابھی شمار تھا ________
"زمین" کے آنسو پڑھا۔ زبردست' نگہت جی کی ناول پہ پہلے دن سے مضبوط گرفت ہے۔ جو ہر قسط کے ساتھ مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔ مجھے ایبک شاہ کا کردار اچھا لگتا ہے۔ اس کے بعد عنیزہ جی تو واقعی کمال ہیں۔ کھاری کو میں آپا رابعہ کا بھائی سمجھتی تھی اور یہاں وہ بن گیا داماد۔ بہرحال قیافے تو اپنی جگہ۔ او سوری سرورق بھی اچھا تھا۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا یہ ساری کہانیاں فرضی ہوتی ہیں یا پھر کچھ سچی داستانیں بھی ہیں؟ اس کے بعد "میرے خواب لوٹا دو" بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ افسانے سارے اچھے تھے اور ثنا میر سے ملاقات اچھی رہی' ایسی شخصیات سے ملاتے رہا کریں۔ آپی پلیز جگن کاظم اور ندا چوہدری کا انٹرویو شائع کریں۔

ج۔ ثمینہ!
خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی کہانیاں تو فرضی ہی ہوتی ہیں' لیکن واقعات اور حقائق چونکہ اسی ماحول اور معاشرے سے اخذ کیے جاتے ہیں تو انہیں مکمل طور پر فرضی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ کچھ حقیقت ہوتی ہے اور کچھ فسانہ۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ ویسے جگن کاظم کا انٹرویو ہم شائع کر چکے ہیں۔

امبر گل۔۔۔ جھڈو سندھ

ہمیشہ خوش ہیں۔ سب سے پہلی نظر ٹائٹل پر ہی پڑتی ہے۔ تو ٹائٹل اچھا لگا۔ سروے کے جوابات کو دیکھنے کے لیے جلدی جلدی صفحات پلٹے اور اینڈ میں جا کر اپنا نام دیکھ کر دل' مارے خوشی کے بلیوں اچھلنے لگا۔ پر جیسے ہی پڑھنا شروع کیا تو فوراً" ہی اندازہ ہو گیا' ماہدولت کو کہ بڑی لمبی چوڑی "کانٹ چھانٹ" کی گئی ہے۔ میں نے چار دن لگا دیے تھے اور آپ نے تو کاٹتے ہوئے یقیناً" چار منٹ بھی نہیں لگائے ہوں گے۔
سب سے پہلے اپنے فیورٹ ناول کو ہی پڑھا۔ یار سعد کا صرف ایک معنی خیز سا جملہ صرف ماہ نور کا بلکہ ہمارا بھی دل دھڑکاتا ہے۔ اور کھاری کی شادی والے سین پڑھ کر تو بہت مزا آیا اور کھاری کے ساتھ ساتھ میری بھی دندیاں نکل رہی تھیں۔ پڑھتے پڑھتے اور پھر بے ساختہ مجھے اپنی امی کی یاد آئی کہ میری عادت ہے کہ جب ہنسنے والے سین ہوتے ہیں تو پھر میری ہنسی نہیں رکتی۔ پڑھتے ہوئے اور دکھی سین پر رونا بھی بہت آتا ہے تو امی کا مجھے کہنا پاگل ہو گئی ہو کیا؟ بیٹھے بٹھائے دانت نکالنے لگ جاتی ہو' کبھی رونا شروع کر دیتی ہو' تو میں نے کہنا کہ آپ بھی پڑھو نا' فائزہ یا ثمرہ کی کہانیاں تو خود ہی دانت نکلیں گے آپ کے بھی اور پھر بصد اصرار انہیں پڑھوائی میں نے وہ تحریریں اور پھر آپس میں مل کر تبصرہ کرنا' کہاں سے لاؤں میں وہ وقت' کاش اے کاش!

رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کر آنے والے

مئی میں محمود ریاض اور شازیہ چوہدری کی بھی برسی ہوتی ہے میں جب جب اپنے پیاروں کو یاد کرتی ہوں یہ دونوں بھی اتنے ہی یاد آتے ہیں۔ اور اگر ہو سکے تو مکتبہ عمران ڈائجسٹ کے توسط سے ایک یا دو ایسی کتابیں شائع کر دی جائیں جس میں شازیہ کے لکھے ہوئے تمام ناولٹس اور افسانے شامل ہوں' بہت مہربانی ہو گی۔ اب بات ہو جائے سائرہ غلام نبی صاحبہ کی' تو ان کا افسانہ بہت پسند آیا اور اگر ہو سکے تو آپ شازیہ کا مکمل ناول "میں نے شام ہاری ہے" پلیز دوبارہ شائع کر دیں۔ مجھ سے وہ ڈائجسٹ مس ہو گیا ہے۔ آپ کا باورچی خانہ میں عاصمہ احمد علی خود بھی بہت اچھی لگیں اور ان کی باتیں اور ٹپس بھی اچھی تھیں اور اب میں اپنے پیارے خواتین کے توسط سے اپنی دوست اور پڑوسن انیلا باجی کو ان کے نکاح اور ان کے بھائی امتیاز بدر جٹ کی شادی کی مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔
21 مئی کو میری برتھ ڈے ہے تو میرے لیے دعا کیجئے گا کہ پروردگار مجھے ذہنی سکون عطا فرمائے۔

ج ۔ پیاری امبرا سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ (آمین) امبرا یہ سلسلہ مبارک بادی کے پیغامات کے لیے نہیں ہے۔ ہم اس سلسلے میں خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریروں پر قارئین کی رائے اور ان کے مشورے شامل کرتے ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ اگر تمام قارئین نے اپنے دوستوں' عزیز و اقارب کو مبارک باد دینے کے لیے یہ طریقہ اپنایا تو یہ سلسلہ صرف مبارک بادی کے پیغامات کے لیے مخصوص ہو کر رہ جائے گا۔ آپ کی فرمائش پر آپ کی پڑوسن اور دوست انیلا باجی کو ان سطور کے ذریعے مبارک باد پہنچائی جارہی ہے۔ شازیہ چوہدری کا ناولٹ میں نے شام ہاری ہے اور دیگر ناولٹ کتابی شکل میں آچکے ہیں۔ آپ مکتبہ عمران ڈائجسٹ سے منگوا سکتی ہیں۔

صالحہ عدیل' قصیٰ جاوید۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

ٹائٹل اچھا تھا۔ پچھلے ماہ مصروفیت کی بنا پر خط نہیں لکھ سکے۔ وجہ کیونکہ 23 مارچ کو صالحہ کی شادی تھی۔ اس ماہ کے دونوں ڈائجسٹ ہمارے بہنوئی نے لاکر دیے ہیں۔ ہمارے بہنوئی کو حضرت علیؓ کے بارے میں جاننے کا بہت اشتیاق ہے۔ آپ پلیز حضرت علیؓ کے بارے میں تفصیل سے لکھیں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ عنیزہ سید کا ناول "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" تو جناب اب تو ہمیں لگتا ہے کہ آپا رابعہ ہی شہناز ہے اور وہ سعد کی ماں ہے اور رضوان الحق کو جس کی یاد آتی ہے' وہ سارہ ہے۔ کھاری اور سعدیہ کو اسی طرح خوش رکھیے گا۔ "میرے خواب لوٹا دو" کی بھی یہ قسط شان دار رہی۔ آپی پلیز رازی کو سارہ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کو اریبہ کو نیچا دکھانے کا موقع مل جائے گا۔ رازی دونوں میں سے کسی کے بھی قابل نہیں ہے۔ "زمین کے آنسو" بھی اچھی رہی۔ آپی پلیز احمد رضا کو اس دفعہ تو اپنے گھر والوں سے ملوا دیجئے گا۔ نعیمہ ناز کا ناول تو اس دفعہ سب سے اچھا رہا۔ ماہم کو ذیشان کے ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔ نعیمہ جی نے پورے ناول میں الفاظ کی گرفت مضبوط رکھی اور کہیں بھی کوئی جھول محسوس نہیں ہوا۔ آمنہ ریاض کے ناولٹ کی شروعات اچھی ہوئی' تقی صاحب کا گھرانہ لگتا ہے کہ سماہر کے تایا ابو کا ہے۔ سمیرا حمید کا ناولٹ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ عاسل کو زینب کو سب کچھ پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ افسانوں میں آسیہ رازقی کا افسانہ پسند آیا۔ آسیہ کچھ مختلف انداز میں نظر آئیں' اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

ج ۔ صالحہ! آپ کو شادی کی مبارک باد اور دعائیں۔ زندگی کا یہ موڑ آپ کے لیے ڈھیر خوشیاں لے کر آئے آمین۔ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔ آپ نے جو اندازے لگائے ہیں۔ وہ کس حد تک درست ہیں' یہ تو آگے جاکر ہی پتا چلے گا۔ سمیرا حمید کے ناولٹ میں اگر عاسل پہلے ہی بتا دیتا تو ان کی شادی ہی نہ ہوتی۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

خواتین کا شمارہ ملا۔ سرورق بہت شان دار بلکہ بہت اعلا۔ خواتین بہت زبردست جارہا ہے۔ کرن کرن روشنی ایک اصلاحی اور خوب صورت سلسلہ ہے۔ عنیزہ سید کا ناول کافی اچھا ہے۔ "میرے خواب لوٹا دو" میں یاسمین کے اندر مثبت تبدیلی اچھی لگ رہی ہے۔ نعیمہ ناز کے ناول تخلیق میں ماہم کا کردار بہت یونیک سا لگا۔ اپنی خود غرضی کے ہاتھوں حمیدہ بانو کو اچھا سبق مل گیا اور سعدیہ عزیز آفریدی کا بس اک دعا' چھو لینے والی تحریر تھی۔ آج کل کے دور میں اتنا خلوص' شمسی کا اسپیشل کردار ویری نائس سعدیہ جی۔ اب آخر میں عنبرین اعجاز کا روشنی کے مسافر ویری گڈ عنبرین جی۔ سمیرا حمید کے ناولٹ نے بہت اداس کردیا۔ عاسل کے کردار نے کافی مایوس کیا۔ سمیرا جی آج کل کے پر آشوب دور میں جہاں پہلے اتنے دکھے ہوئے دل ہیں' آپ ایسی تحریروں کے بجائے کچھ ہلکا پھلکا لکھیں۔

ج ۔ عالیہ! آپ کا خط لیٹ ملنے کی وجہ سے شامل نہ ہوسکا۔ آپ کو مایوسی ہوئی۔ اس کے لیے معذرت۔ سمیرا حمید کی کہانی میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ آپ اداس ہوتیں۔ کہانی کا انجام بھی خوش گوار تھا۔ بہرحال سمیرا حمید تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فہمیدہ گل۔۔۔ لاڑکانہ

قریباً" بیس بائیس سال سے آپ کے رسالوں کی خاموش قاری ہوں۔ میرا اور ان کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ شاید دو فیملی ممبر بھی ایک دوسرے کے اتنے قریب نہ ہوں گے جتنی میں۔ اب آتی ہوں اس ماہ کے شاہکار کی طرف۔ واہ دل چاہتا ہے پورے اسٹاف' پورے ادارے کو اپنے سامنے کھڑا کرکے ایک وی آئی پی سا سلوٹ ماروں۔ کیونکہ ان سب نے ہمارے لیے ایک چھوٹی سی فیملی بنائی۔ مسز خواتین' مسز شعاع اور ان کی بیٹی مس کرن دونوں جہاں ان کے اندر سمائے ہوئے ہیں۔ جب میں پریشان ہوتی ہوں تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں دل کو ایک دم پرسکون کردیتی ہیں۔ ہماری پیاری رائٹر کی پیاری پیاری کہانیاں' شاعری' اف کیا کیا بتاؤں۔

ماڈل بہت پیاری تھی۔ "زمین کے آنسو" کی تعریف ممکن نہیں۔ احمد رضا کو اب پلیز اس کی فیملی سے ملا دیں۔ ان سے زیادہ میں پریشان ہوں۔ تخلیق میں حمیدہ بانو کا کردار پڑھا' بہت غصہ آیا۔ واقعی ایسی بھی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سمیرا احمد کا راہ یار اصل میں یہی وجہ ہے خط لکھنے کی سمیرا جی! کوئی کیسے اتنا اچھا لکھ سکتا ہے۔ ماہ تمام اور باقی سب افسانے بہت اچھے تھے۔

ج ۔ پیاری فہمیدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے دس ماہ پہلے جو خط لکھا' وہ شائع نہ ہوسکا۔ اچھی بہن! خط شائع نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ کبھی خط دیر سے موصول ہوتا ہے۔ اس بنا پر شامل نہیں ہوپاتا۔ کبھی صفحات کی کمی آڑے آجاتی ہے۔ اس لیے ایک بار شائع نہ ہونے پر خاموشی اختیار کرلینا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ اپنے شوہر کو بھی دکھا دیجئے گا' تاکہ وہ آئندہ آپ کو لکھنے سے منع نہ کریں۔ سمیرا حمید کا راہ یار آپ کو بہت پسند آیا۔ آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ سمیرا حمید نئی مصنفہ ہیں۔ لیکن ان کی تحریر میں کمال کی پختگی اور گہرائی ہے۔ اتنی کم عمری میں ان کا مشاہدہ اور تجزیہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ ہماری دعا ہے وہ اسی طرح لکھتی رہیں۔

سلمیٰ فیصل۔۔۔ فتح جنگ

ٹائٹل گرل بس ٹھیک تھی۔ سب پہلے عنیزہ سید کی "کوہ گراں تھے ہم" پڑھی۔ بلاشبہ ایک بہترین تحریر ہے۔ "زمین کے آنسو" بہت اچھی اسٹوری ہے۔ اللہ پاک ہمارے ایمان کو مضبوط کرے۔ احمد رضا جیسا کمزور ایمان کا شخص جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ایسے لوگوں سے اللہ پاک ہمارے ملک کی حفاظت فرمائے۔ (آمین) آمنہ ریاض کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی' ویلکم آمنہ جی! نعیمہ ناز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مگر اس دفعہ "تخلیق" مجھے کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔ افسانوں میں "بس اک دعا" بازی لے گیا۔ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس بات پہ ہمارا یقین ہونا چاہیے۔ سالگرہ نمبر کے حوالے سے کچھ کمی لگی۔ "ہمارے نام" بہت مختصر تھا۔ ثنا میر سے ملاقات اچھی رہی۔ سالگرہ کے حوالے سے سروے اچھا تھا۔ مستقل سلسلے بھی سب اچھے تھے۔ اس دفعہ "موسم کے پکوان" میں خالدہ جی سے یہ پوچھنا ہے کہ بیکنگ پاؤڈر یا بیکنگ سوڈا کے بغیر کیک کیسے بن گیا اور نہ ہی اس کے اندر گھی یا آئل وغیرہ ڈالا گیا۔ پلیز اس بات کو ضرور کلیر کیجئے گا۔

ج ۔ پیاری سلمیٰ! یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ نعیمہ کا ناول آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول تخلیق بلاشبہ بے حد خوب صورت تخلیق تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوب صورتی کردار نگاری تھی۔ حمیدہ بانو کے کردار میں اس کی منتقم مزاجی' موقع پرستی حسد اور جلن کی فطرت کو مصنفہ نے بہت خوب صورتی سے بیان کیا۔ یہ کچھ اس کی فطرت تھی اور کچھ اس کی ماں کی غلط تربیت' ایک ماں کس طرح اپنی اولاد کی تربیت میں اپنی فطرت کے رنگ بھرتی ہے۔ دوسری طرف فواد کو اپنی علمیت اور قابلیت پر بہت زیادہ زعم تھا۔ اپنی دانست میں وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے حمیدہ بانو کی شخصیت بدل دینا چاہتا تھا۔ لیکن ثابت ہوا کہ کوئی بھی چیز انسان کی بنیادی فطرت کو نہیں بدل سکتی۔ منفی سوچ اور فطرت رکھنے والے خواہ کتنی بھی تعلیم حاصل کرلیں۔ انہیں بدلا نہیں جاسکتا۔ کہانی میں ایسی کوئی بھی بات نہیں تھی جو سمجھ میں نہ آتی نعیمہ ناز بہت اچھا لکھنے والی ہیں اور ان کی یہ تحریر تو ہمیں بے حد اچھی لگی ہے۔

ج ۔ مکھن اور بیکنگ پاؤڈر ہر کیک میں شامل ہوتا ہے۔ سہوا" لکھا نہ جاسکا۔ ایک کپ میدہ میں آدھا کپ مکھن اور ایک چمچہ بیکنگ پاؤڈر شامل کرنا ہوتا ہے۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ دلہن بہت پیاری لگ رہی ہے۔ ویسے بھی جامنی رنگ میرا پسندیدہ رنگوں میں سے ایک ہے۔ سب سے پہلے "اپنا پن" کی بات ہو جائے۔ ہاہاہا ویل ڈن آسیہ رزاقی جی۔ مجھے تو پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ خاص طور پر ایک جملے پر جس میں بچی سفید ساڑھی پہن کر روز پوجا کرتی تھی۔ بہت اچھا لکھا۔ ویسے ہر مہینے ایک دو کہانی مزاحیہ ہونی چاہئیں۔ چار چاند لگ جاتے ہیں۔ خواتین ابھی پورا رسالہ تو نہیں پڑھا مگر کچھ پڑھ لیا ہے۔ "تخلیق" نعیمہ ناز ویل ڈن بہت اچھا لکھا۔ ویسے جو میں نے سوچا تھا اختتام ویسا نہیں ہوا، میں تو حمیدہ کو بڑا مظلوم سمجھ رہی تھی۔ مگر بھئی۔ وہ تو بڑی تیز نکلی۔۔۔ فواد کے متعلق ٹھیک سے نہیں بتایا۔ اس کا کیا ہوا۔ "میرے خواب لوٹا دو" ساجدہ بیگم نے تو ایک دم پینترا بدلا ہے۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ تب ہی تو ساجدہ بیگم بھی اپنی اولاد کے لیے ایسی ہو گئی ہیں۔ بہرحال کچھ مروت تو باقی ہے۔ "کوہ گراں تھے ہم" تجسس برقرار ہے، دیکھو اب آگے کیا ہوتا ہے۔ آپ کا باورچی خانہ میں عاصمہ کا انتخاب پسند آیا۔ خاص طور پر یہ بات پسند آئی کہ جب اپنا آپ منوانا ہو تو یہ میدان بھی کچھ کم نہیں، اپنی ذہانت یہاں آزمائیں، واہ عاصمہ! مجھے تو آپ کی اس بات سے بہت ہمت ملی ہے۔ ویسے ہمارے ایریا میں گرد و غبار بہت آتا ہے۔ ہمارے جیسے لوگ مسالوں کے ڈبے کس طرح بالکل صاف رکھ سکتے ہیں۔ کھلے کچن والے، گرمیوں میں تو ہمارا صحن سائرہ رضا کی سرسوں کے پھول کی ۔۔۔ آمنہ کا کچن ہوتا ہے۔ یاد کی جلتی شمعیں میں حسب روایت انیقہ انا اور امبر گل کے جوابات دلچسپ لگے۔ باقی بھی اچھے لگے۔ مگر سب سے پہلے میں انیقہ انا، امبر گل اور فوزیہ ثمر کو پڑھتی ہوں۔

سائرہ غلام نبی، بڑے دنوں کے بعد نظر آئیں۔

ج ۔ پیاری عائشہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مسالوں کے ڈبوں کو اچھی طرح بند کر کے رکھیں اور روزانہ ان کی گرد صاف کرلیں تو وہ خراب نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کوئی طریقہ کسی قاری بہن کو معلوم ہو تو ہمیں لکھ دیں۔ ہم شائع کردیں گے۔

اپنے پیارے سے بیٹے کو ہماری جانب سے بہت بہت پیار کیجئے گا۔

شاہدہ ظفر۔۔۔ گاؤں ڈیرہ مستی بھاول پور

افسانے سب ہی اچھے تھے۔ "جامن کا درخت" خود تو مطمئن ہو گیا اور اگلے صفحے پر دوبارہ وارد ہو کر ہمیں غیر مطمئن کر دیا۔ آمنہ ریاض صاحبہ بھی بضد۔ جی! مجھے پڑھو بار بار، تخلیق کو ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ "میرے خواب لوٹا دو" میں اریبہ اور سارہ کے درمیان بدگمانی دور ہو گئی۔ عنیزہ سید جی بھی بڑے بھاؤ سے کرداروں کی کڑیاں ملا رہی ہیں۔ "زمین کے آنسو" اللہ تعالیٰ نگہت سیما صاحبہ کے قلم کو اور طاقت دے۔ (آمین) بہت گہری حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہے۔ مختلف "این جی اوز" ہر شہر میں فلاح و بہبود کے کام کر رہی ہیں۔ لیکن پس پردہ یہی پلاننگ رجی اور طیب جیسے ناسور تو معاشرے میں ہیں ہی جو ایمان کو سلب کرنے کے ساتھ ساتھ عقائد و نظریات کو بگاڑ رہے ہیں۔ لیکن ہم خود بھی دین سے دور ہونے کے باعث خواہشات کی تکمیل میں صحیح غلط حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھے ہیں۔

ج پیاری شاہدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے شہر کا نام غلط شائع ہو گیا۔ تصحیح کی جا رہی ہے۔ شاید آپ کے پرچے کی بائنڈنگ میں کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی بنا پر جامن کا درخت دوبار شائع ہوا اور "تخلیق" آپ کو نہ مل سکا۔ ایسی صورت میں آپ پرچا اپنے بک اسٹال والے سے تبدیل کرا سکتی ہیں یا ہمیں فون کرلیں۔ ہم آپ کو صحیح پرچا بھجوا دیں گے۔

افشین فاروق۔۔۔ کراچی

تمام افسانے بہت اچھے تھے۔ "میرے خواب لوٹا دو" زبردست موڑ پر ہے۔ روشنی کے مسافر ایک دل سے نکلتی کہانی ہے اور بھی تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ میرے افسانے کیا آپ کو پسند آئے؟ امید کروں کہ چھپیں گے یا....

ج ۔ پیاری افشین! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ آپ کے افسانے پڑھ لیے ہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے افسانے شائع نہیں ہو سکتے۔ فی الحال آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔

مسز فوزیہ زبیر۔۔۔ چشتیاں

سرسری سی ورق گردانی کے بعد عنیزہ جی کے شاہکار کی جانب لپکے۔ واہ عنیزہ جی ایک دم شان دار قسط۔ کہانی کے سارے الجھے سرے اور گتھیاں ایک چھت کے نیچے جمع اور ایک دوسرے کی اصل سے بے خبر۔ اتنے پاس اور کتنے دور کی تفسیر نظر آئے۔ نگہت جی کے ناول کی قسط حسب معمول الجھی اور قدرے جمود کا شکار نظر آئی۔ مگر کہانی پر نگہت جی کی گرفت مضبوط رہی۔ رازی کی سوچ اس حد تک بھی پست ہو سکتی ہے۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ مگر سارہ اور رازی کے درمیان جو پراسرار، الجھا اور ان کہا سا تعلق ہے، وہ تو پاتال سے بھی گہری پستی کی جانب اشارہ کرتا ہے اور خدا کرے یہ محض ہمارا اندازہ ہی ہو۔ نعیمہ جی کی تخلیق ایک انتہائی متاثر کن شاہکار ثابت ہوئی۔ واقعی اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ حمیدہ بانو کی نیت کے کھوٹ اور دل کے لالچ نے اسے تہی دل اور تہی داماں کر دیا اور ماہم کو اس کی بے لوث اور بے غرض فطرت نے سرفراز کیا۔ سمیرا جی کا ناولٹ کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ ایک تو کہانی میں نیا پن نہیں تھا اور رہی سہی کسر باقی آئندہ نے پوری کر دی۔ آمنہ جی کا ماہ تمام ابھی پڑھا نہیں جا سکا۔ آسیہ جی کا روایتی انداز سے ہٹ کر لکھا۔ "اپنا پن" واقعی اپنائیت محبت اور ممتا کے رنگوں میں گھلی حقیقی رشتوں کی چاشنی تھا اور دل بے اختیار عش عش کر اٹھا۔ ایسی بھرپور اور مختصر تحریر پر آسیہ جی کو بہت بہت مبارک باد۔ بس اک دعا اور روشنی کے مسافر قابل تعریف تحریر تھیں۔ ان کا تذکرہ نہ کرنا زیادتی ہو گی اور بالخصوص بنٹی چاچو جیسے کردار ہمارے ابو جی کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہم نے بچپن سے آج تک انہیں دوسروں کے لیے بے غرض کام کرتے ہی دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ ریٹائرمنٹ کے وقت ملنے والا گریجویٹی فنڈ بھی اسی کی نذر ہو گیا۔ مگر ابو کا ایک ہی ازلی مسکراتا جواب کہ "جب مانگنے والے نے اپنی خودداری کو کچل کر دست سوال دراز کر ہی دیا تو کیا مجھے یہ زیب دیتا ہے کہ جو چیز میری دسترس اور دائرہ اختیار میں ہے، میں اس کے لیے انکار کردوں۔" مگر اب ہم نے خفا ہونا اور کڑھنا چھوڑ دیا ہے کہ یہ ہی چھوٹی چھوٹی نیکیاں کہیں زاد راہ بن جاتی ہیں تو کہیں دل سے نکلی دعاؤں کی صورت میں کثیر سرمایہ۔

ج ۔ فوزیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ تحریروں پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ سمیرا حمید کی کہانی تو مکمل تھی۔ آپ نے باقی آئندہ کہاں لکھا دیکھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ آمنہ ریاض کی کہانی کو سمیرا حمید کی کہانی سے گڈمڈ کر رہی ہوں۔ آپ کے ابو جیسے لوگ اس دھرتی کا حسن ہیں۔ بے لوث، بے غرض، صلہ رحمی کرنے والے۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندگی میں کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح دوسروں کی خدمت کرتے رہیں۔ (آمین)

بین اکبر۔۔۔ بورے والا

آپ کو خط لکھنے کی وجہ کوئی ایک کہانی نہیں یا کسی کا انٹرویو کرنے کی بھی فرمائش نہیں کروں گی۔ میں آپ کو خط آپ کے ادارے کی انتھک محنت اور لگن کو سراہتے ہوئے لکھ رہی ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ میں نے خواتین ڈائجسٹ کب پڑھنا شروع کیا تھا۔ تو یہ بات تب کی ہے جب میں چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی اور اب دس سال ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ دونوں رسالے پڑھتے ہوئے "خواتین ڈائجسٹ اور شعاع" آپ کی تمام رائٹرز بہت عمدہ لکھتی رہی ہیں اور ابھی بھی نہایت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپ کا ادارہ اپنی عمدہ تحریروں کے ذریعے بہت سی لڑکیوں کو باشعور بنانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ج ۔ بین! بے حد خوشی ہوئی آپ کا خط پڑھ کر۔ آپ کہانی لکھنا چاہتی ہیں تو ضرور لکھیں۔ صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس اسی طرح بھجوا دیں جس طرح یہ خط بھجوایا ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

عندلیب زہرا

کھانا پکانا ایک آرٹ ہے۔ فن ہے اردو والا بھی اور انگریزی والا بھی۔ آپ کسی عورت کی نفسیات سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا کچن دیکھیے۔ اس میں کتنا جمالیاتی ذوق ہے؟ وہ کتنی سلیقہ مند ہے؟
اور سب سے بڑھ کر اپنے گھر والوں سے کتنی محبت ہے؟ اور وہ اپنے خاندان کو کس حد تک جوڑ کر رکھ سکتی ہے؟

1۔ میں کھانا پکاتے ہوئے توازن، ردھم اور ہم آہنگی کی قائل ہوں۔ (کھانا پکانے کو آرٹ جو سمجھتی ہوں) صرف زبان کا ذائقہ ہو اور گھر والوں کی صحت کا خیال نہ ہو تو پھر ہمارے پکائے کھانے اور فائیو اسٹار ہوٹل کے کھانے میں کیا فرق رہ جائے گا۔

مجھے مہمان پسند ہیں۔ خاص طور پر وہ جو ہمارے دل اور روح سے قریب ہوں۔ اور وہ اچانک آجائیں تو دل کرتا ہے دنیا جہان کی نعمتیں دسترخوان پر سجادیں۔ بہرحال مہمان کی آمد پریشانی سے دوچار نہیں کرتی۔ آپ مہمان کو کولڈ ڈرنک سرو کریں ایک پرخلوص مسکراہٹ کے ساتھ۔ اگر کھانے کا ٹائم ہے تو مٹر پلاؤ، چکن پلاؤ بنالیں، مجھ سے یہ ڈشز جلدی تیار ہو جاتی ہیں۔ ساتھ رائتہ، سلاد وغیرہ ہاں چکن کڑاہی بھی تیار کر سکتی ہیں اور سوئٹ ڈش میں دودھ والی سویاں، فروٹ کسٹرڈ تیار کرلیں (ترکیبیں آپ کو معلوم تو ہیں)

2۔ کچھ مہمان چائے کے ٹائم پر آتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کولڈ ڈرنکس کے بعد کچھ دیر ان سے گپیں لگائیں۔ پھر چائے بنا کر اس کے ساتھ اسنیکس سرو کریں۔

اگر گھر میں تیار ہیں تو ٹھیک ورنہ بیکری زندہ باد۔ اپنی ایک پسندیدہ ڈش کی ترکیب لکھ رہی ہوں وہ جلدی تو نہیں بنتی لیکن مزے دار ضرور ہوتی ہے۔

کڑھی

اشیاء :

دہی	آدھا کلو
بیسن	آدھا کلو
لہسن ادرک کا پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ضرورت
سرخ مرچ	حسب ضرورت
ثابت دھنیا	1 چائے کا چمچہ
پیاز	2 عدد درمیانی
ٹماٹر کا پیسٹ	3 کھانے کے چمچے
سفید زیرہ	آدھا چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دہی کی لسی بنالیں۔ زیرہ تیل میں ہلکا براؤن کرلیں۔ اب ٹماٹر کا پیسٹ اور تمام مسالے ڈال کر گریوی بنائیں۔ بیسن کے آٹھ کھانے کے چمچے پیسٹ بنا کر گریوی میں ڈالیں اور بھون لیں۔ جب مسالا اور بیسن بھن جائے تو دہی کی لسی آہستہ آہستہ ڈال دیں اور ساتھ ساتھ چمچ ہلاتی جائیں تاکہ پھٹکیاں نہ بنیں۔ درمیانی آنچ پر چولہا رکھیں اور چمچ ہلاتی جائیں جب ابال آجائے تو پکنے کو چھوڑ دیں۔ کڑھی گاڑھی ہوجائے تو اتار لیں۔
پکوڑوں کے لیے باقی بیسن۔ نیز چوپ کی ہوئی پیاز، ہری مرچ کٹی ہوئی مرچ اور نمک ڈال کر آمیزہ تیار کرلیں اور پکوڑے تل کر کڑاہی میں ڈال دیں۔ گھی میں سفید زیرہ اور گول لال مرچ ڈال کر بگھار لگائیں۔ اوپر سے گرم مسالا چھڑک دیں۔ مزے دار کڑاہی تیار ہے۔

ویسے میں اس بات کی قائل ہوں کہ کھانا چاہے سادہ ہو لیکن اسے محبت، سلیقے اور ذہانت سے پیش کیا جائے تو مہمان کے دل کو خوشی کا احساس دیتا ہے۔ چیزوں سے زیادہ اہم رویے ہوتے ہیں جو دیرپا ہوتے ہیں۔ اور یاد رہتے ہیں۔
مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب ہم اپنی نانو کے گھر جاتے تو وہ ہمارے لیے مٹر پلاؤ بناتیں۔ شام کو چائے، سموسے اور چٹنی تیار کرتیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈا میٹھا روح افزا، لیکن ان کی محبت اور اپنائیت کا احساس اس سادہ سی دعوت کو بھی شاندار ضیافت بنا دیتا۔

3۔ میں اس بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ صرف عورت کا سلیقہ ہی نہیں، اس کی نفسیات، تخلیقی صلاحیتیں، رشتوں سے محبت غرضیکہ پوری شخصیت کا اظہار گھر کے اس حصے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ میں کچن کی ہر چیز صاف رکھتی ہوں۔ خواہ وہ مسالوں کے ڈبے ہوں، شیلف ہوں یا الماریاں، حتیٰ کہ توے کی صفائی کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ فریج صاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔ ہر چیز کام کے دوران ٹھکانے پر پہنچاتی ہوں۔ مجھے میلے برتن شیلف پر بہت برے لگتے ہیں۔ چولہا، سنک اور دیواریں سب صاف رکھنا ضروری ہے۔ میرے نزدیک اگر گھر ایک ریاست ہے تو کچن اس کا دارالحکومت، جسے ترقی یافتہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ میں نے کچن میں پھلوں اور سبزیوں کی تصویریں آویزاں کر رکھی ہیں اور سبز بیلیں بھی، تاکہ جمالیاتی ذوق کا اظہار ہو سکے۔

4۔ ناشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور عموماً" بڑی بہن اور امی بناتی ہیں۔ کبھی کبھار میں بھی بنا لیتی ہوں۔ ناشتے میں ورائٹی ہوتی ہے۔ روزانہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ میری امی کے پراٹھے سارے خاندان میں مشہور ہیں۔ ایک ڈش کی ترکیب جو آپ صبح ناشتے میں بھی کھا سکتے ہیں اور شام کی چائے کے ساتھ بھی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

لائم جوس

اجزا :

لیچی	آٹھ عدد
لیمن سوڈا	ایک گلاس
چینی	دو چائے کے چمچے

ترکیب :

لیمن سوڈا میں چینی ڈال کر گرائنڈ کریں۔ لیچیوں کو چھیل کر بیج نکال لیں اور لیمن سوڈا میں ڈال کر ایک بار پھر خوب گرائنڈ کرلیں۔ برف ڈال کر ٹھنڈا کریں اور پیش کریں۔

دہی کا میٹھا

اجزا :

دہی	ایک پاؤ
سیب	ایک عدد
خربوزہ	ایک عدد
کیلے	چھ عدد
آڑو	تین عدد
فریش کریم	آدھا کپ
جیلی	آدھا کپ
چینی	چار کھانے کے چمچے
اسپگیٹھی	آدھا پیکٹ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

اسپگیٹھی کو نمک اور تیل والے پانی میں ابال کر ٹھنڈے پانی سے گزار کر چھان لیں۔ تمام پھلوں کو چوکور کاٹ لیں۔ دو رنگ کی جیلی الگ الگ جما کر چوکور کاٹ کر رکھ لیں۔ دہی میں فریش کریم' دو چٹکی نمک اور چینی ڈال کر خوب پھینٹ لیں۔ کٹے ہوئے پھل ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں۔ جیلی سے سجاوٹ کر کے فریج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

روشن حرف وہ سارے

مدیحہ فردوس صدیقی

1 ۔ ادبی ذوق تو ہم نے ورثے میں پایا ہے۔ گھر میں اکثر بیت بازی کا دور چلتا ہے۔ گھر میں سب کو فی البدیہہ شاعری میں بھی کمال حاصل ہے۔ حوادثات زمانہ کے باعث جو شعر اکثر لبوں پر رہتا ہے' وہ یہ ہے۔

میرے واقعات وفا ہیں وہ' کہ جہان سارا سمجھ گیا
میرا نام "مصلحت" اگر سر داستان نہ ہوا تو کیا!

اور میرے بھائی عبدالباسط کا یہ شعر۔

ہم پیاس سے نڈھال انہیں دیکھتے رہے
اور جام دے کے غیر کو وہ مسکرا دیے

2 ۔ بڑے بھائی جان کی ڈائری میں ایک شعر پڑھا تو سیدھا دل میں اتر گیا۔

کسی کے ظرف سے بڑھ کے نہ کر مہر و وفا ہرگز
کہ اس بے جا شرافت سے بہت نقصان ہوتا ہے

یہ اشعار اقبال عظیم صاحب سے تعارف کی بنیاد بنے اور پسندیدگی کی بھی۔

جب گھر کو ہمارے آگ لگی' سامان بچا کچھ جلنے سے
سو وہ بھی ان کے ہاتھ لگا' جو آگ بجھانے آئے تھے

جو لوگ شریک سازش تھے' ہم نام بھی ان کا کیسے لیں
کچھ ان میں دوست پرانے تھے' کچھ باعزت ہمسائے تھے

اقبال عظیم صاحب کی ایک اور غزل۔

مجھے زہر عشق قبول ہے' جو میری وفا کا زیاں نہ ہو
مجھے اپنی آن عزیز ہے' میری جان اتنی اہم نہیں

یہ جو شکوے تم کو وطن سے ہیں' یہ بجا سہی میرے دوستو!
مگر ایک بات نہ بھولنا! یہ تمہارا گھر ہے' ارم نہیں

میں خطاب کرتا ہوں دوبدو' میری بات ہوتی ہے روبرو
میرے سامعین کی خیر ہو' مجھے احتیاج قلم نہیں

3 ۔ میرے زیادہ ہنسنے پر بھابھی نے ایک مرتبہ چوٹ کی۔

ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کردے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

تو میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

ہجوم غم میری فطرت بدل نہیں سکتا
کروں میں کیا! مجھے عادت ہے مسکرانے کی

4 ۔ میں اکثر مہدی حسن' نصرت فتح علی خان اور عابدہ پروین کی غزلیں سنتی ہوں۔ نصرت فتح علی کی گائی غزل پیش خدمت ہے' جو اکثر میرے شریک حیات مجھے سناتے ہیں۔

غم ہے یا خوشی ہے تو' میری زندگی ہے تو
آفتوں کے دور میں' چین کی گھڑی ہے تو
میں خزاں کی شام ہوں' رت بہار کی ہے تو
میری رات کا چراغ' میری نیند بھی ہے تو

5 ۔ کلاسیکی شاعری تو میرا جنون ہے۔ کسی ایک غزل کا انتخاب بہت مشکل کام ہے' بہرحال ساغر صدیقی کی ایک غزل پیش خدمت ہے۔

وہ بلائیں تو کیا تماشا ہو
ہم نہ جائیں تو کیا تماشا ہو
تیری صورت جو اتفاق سے ہم
بھول جائیں تو کیا تماشا ہو
یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

کراچی کا شاید ہی کوئی فنکار بچا ہو۔ فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ۔۔۔۔

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

شاید ہمایوں سعید کے لیے بھی یہ فلم کسی عشق کی بازی سے کم نہیں، جب ہی تو مبینہ اطلاعات کے مطابق اس فلم پر انہوں نے اپنا تمام تر جمع جتھا لگا ڈالا ہے۔ مگر جناب! یہ کمرشل دور ہے اور ہمایوں سعید اتنے بھی نادان نہیں کہ اس عشق کی بازی میں احساسات و جذبات کے سکے لٹانے کے بجائے اپنے سارے سکے رائج الوقت لٹانے کے بعد یہ سوچ کر سکون و اطمینان سے بیٹھ جائیں کہ ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ سو وہ فلم کو کامیاب بنانے کے ہزار جتن کر رہے ہیں۔

خبر گیا و بس

تبصیر نشاط

آئٹم نمبر

معروف کرکٹر شاہد آفریدی پر بننے والی فلم کاؤنٹا فلم کی ریلیز ہونے سے کافی پہلے ہی زور و شور سے بجایا جارہا ہے۔ (خود شاہد آفریدی کی دھواں دھار بیٹنگ کی شہرت سے بھی زیادہ۔) ایک عرصے سے فلم کی تیاریوں اور پھر فلم بننے کے مراحل کے چرچے ہیں۔ (اتنا وقت تو شاہد آفریدی نے شاید کرکٹر بننے کی جدوجہد میں بھی نہیں لیا ہوگا' جتنا وقت یہ فلم بننے میں لے رہی ہے۔) آئے دن اس فلم کے حوالے سے کوئی نہ کوئی انوکھی بات سامنے آجاتی ہے۔ پہلے سننے میں آیا کہ اس فلم میں اتنے فنکار اکٹھے کرلیے گئے ہیں کہ

اب خبر آئی ہے کہ اس فلم کے ڈائریکٹر عثمان علی رضا نے اس فلم میں ایک عدد "آئٹم سونگ" بھی شامل کیا ہے۔ جس پر پرفارمنس کوئی اور نہیں "اپنی ماہ نور بلوچ دے رہی ہیں اور گانے کے بول ہیں۔ "چڑھتی جوانی" (ایں! گانے کے یہ بول ماہ نور بلوچ کے لیے مناسب ہیں کیا' جو خود جوان جہان بچوں کی ماں ہیں؟ یہ آئٹم سونگ فلم کو کامیاب بنانے کے لیے ڈالا گیا ہے یا اس کا مذاق بنانے کے لیے۔۔۔۔)

فیشن ماڈلنگ

معروف اداکارہ صائمہ کو اس وقت فلم انڈسٹری کی سب سے مقبول ہیروئن کہا جائے تو شاید یہ غلط نہ ہو۔

گزشتہ دنوں ان کی معروف فلم "مجاجن" نے مسلسل چھ سال تک کامیابی سے چلنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ لاہور کے ایک مقامی سنیما میں اس فلم کی ٹیم کے اعزاز میں ایک تقریب پذیرائی کا اہتمام بھی کیا گیا۔ صائمہ اور سید نور نے اس تقریب میں بے حد خوشی خوشی شرکت کی۔ مگر شاید صائمہ کو اپنی بڑھتی ہوئی (بلکہ بڑھی ہوئی) عمر کا احساس ہو چلا ہے۔ جب ہی تو انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ اب ریمپ پر چلیں گی۔ (اس سے پہلے ہواؤں میں اڑ رہی تھیں کیا) صائمہ نے سوچا ہوگا کہ مجاجن تو چھ سال پہلے بنی تھی۔ اس وقت کی صائمہ کو فلم بین اب تک قبول کر رہے ہیں۔ لیکن اگر آج کی صائمہ کو فلم بینوں نے قبول نہ کیا تو۔۔۔؟ بس اسی سوچ نے انہیں خوف زدہ کردیا ہوگا۔ (صائمہ جی! اس میں اتنا خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ جنہوں نے آپ کو قبول کرنا تھا' وہ تو کر چکے۔ اپنا ٹیگ بھی آپ پر لگا دیا۔ اب آپ کو کس بات کی فکر؟)

صائمہ سے قبل جب کسی فلمی اداکارہ نے اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کی۔ تاہم کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ارادہ کیا تو اکثریت نے فلموں کی ہدایت کاری کی طرف توجہ کی' یا پھر اپنا بیوٹی پارلر یا بوتیک کھولا۔ لیکن صائمہ کو شاید اپنی مقبولیت کا احساس ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے فیشن ماڈلنگ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (ہاں! مگر صائمہ یہ بھول گئیں شاید کہ ہمارے ہاں دبلی پتلی (بلکہ کسی حد تک فاقہ زدہ) فیشن ماڈلز کا رواج ہے تو ریمپ کے لیے اسٹیج بھی ان ہی کے وزن کی مناسبت سے بنائے جاتے ہوں گے نا۔)

فلموں میں کام کرنے کے لیے تو صائمہ نے بے حد محنت کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ فیشن شوز میں ماڈلنگ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے وزن میں کس حد تک کمی کرتی ہیں۔ (لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتیں تو ہو سکتا ہے کہ فیشن شائقین انہیں ان کے فلمی کیریر کی وجہ سے قبول کر ہی لیں۔ مگر ریمپ اسٹیج قبول نہ

کرے شاید۔)

پہلی غلطی

نوشین شاہ اپنے نام سے اتنی معروف نہیں، جتنی کام کے حوالے سے ہیں۔ روتے دھوتے کرداروں سے لے کر مزاحیہ اداکاری تک ہر طرح کی اداکاری کرتو لیتی ہیں۔ تاہم انہیں دیکھ کر پتا چل رہا ہوتا ہے کہ وہ اداکاری کر رہی ہیں۔۔۔ عجیب مشینی اور پروفیشنل سے انداز میں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نوشین شاہ خاصے پروفیشنل اور مشینی انداز میں کام کرتی ہیں۔

ایک نجی چینل نے اپنی ٹیلی فلم کے لیے نوشین شاہ سے رجوع کیا۔ پہلے تو نوشین راضی نہیں ہوئیں۔ خیر! کافی مشکلوں سے چار دن میں کام ختم کرنے کے وعدے پر ہامی بھرلی۔ لیکن ساتھ ہی نوشین نے ایک شرط بھی عائد کردی کہ انہیں وقت پر بلایا جائے گا۔ وہ اپنا کام ختم کرکے فوراً" چلی جائیں گی۔ نوشین کی یہ شرط منظور کرلی گئی۔ پہلے دن نوشین شوٹ پر آئیں اور

سکون سے کام کرکے چلی گئیں۔ تاہم اگلے دن پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی بدقسمتی کہ عین موقع پر کسی وجہ سے لوکیشن تبدیل کرنا پڑ گئی۔ جس کی وجہ سے دو، تین گھنٹے ضائع ہوگئے اور ایک بھگدڑ الگ مچی رہی۔ نوشین اپنے وقت پر آگئی تھیں۔ وہ خاصی برہمی سے تمام افراتفری دیکھتی رہیں۔ پہلے تو منہ ہی منہ میں بڑبڑا بڑبڑا کے بار بار گھڑی دیکھتی رہیں۔ آخر کار جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو ڈائریکٹر پر پھٹ پڑیں۔ نہ ہی ڈائریکٹر کی عمر اور سینیارٹی کا لحاظ کیا اور نہ ہی عین موقع پر درپیش آنے والی مجبوری کا۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کو خوب ہی سنائیں۔ ان کی منت سماجت کرکے انہیں اس دن کام کرنے پر آمادہ کیا گیا۔

اگلے دن جب شوٹنگ کے وقت نوشین نہ پہنچیں تو انہیں فون کیا گیا۔ کہنے لگیں کہ ابھی سو رہی ہوں۔ بارہ بجے مجھے لینے کے لیے گاڑی بھیج دیجیے گا۔ ڈائریکٹر نے مقررہ وقت پر انہیں کال کی تو اس مرتبہ نوشین نے فون ریسیو ہی نہیں کیا۔ چار بجے کے قریب نوشین نے فون ریسیو کیا اور کہا کہ چھ بجے گاڑی بھیج دیجیے گا۔ چھ بجے گاڑی بھیجی گئی تو نوشین تیار نہیں تھیں۔ آٹھ بجے وہ شوٹ پر پہنچیں اور رات ایک بجے تک اپنا کام مکمل کرا ہی دیا۔ (بھئی! پہلی غلطی ڈائریکٹر صاحب نے کاسٹ کرکے کی تھی نا! اب خود کردہ را علاج نیست)

یہ بیان کالمانہ

☆ تین عشروں میں کراچی نے کئی رنگ بدلے ہیں، ہر رنگ میں نیرنگی ہے۔ شیش محل کا منظر ہے جس میں ایک ہی تصویر شیشے کے سو ٹکڑوں میں دکھائی دیتی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ایک میں بھی تنہا تھے، سو میں بھی اکیلے ہیں۔ پچاس ساٹھ برس کی اوسط عمر میں کراچی کے مکین ہزار بار جیتے اور مرتے ہیں۔ سانسوں کا تسلسل برقرار ہے۔ لوگ جی رہے ہیں۔ مگر زندگی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

(ایم ابراہیم خان۔ روزنامہ دنیا)

☆ شیرون اسٹون ہالی ووڈ کی اداکارہ تھی۔ اسے کامیابی ملی تو پورا ہالی ووڈ اس کے پیچھے تھا۔ ایک ناکام اداکار گیری میگوائر سے اس کی ملاقات ہوئی اور شیرون اپنے بس میں نہ رہی۔ شیرون اسٹون سے پوچھا گیا کہ "کہاں آپ جیسی کامیاب اداکارہ اور کہاں یہ شکست خوردہ معمولی شادی شدہ شخص۔" شیرون نے جواب میں ایک فقرہ کہا۔ "یہ پانچ ہفتوں کا ایک معاشقہ تھا، جو آٹھ طلاقوں پر منتج ہوا۔" تب دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ گیری میگوائر اور اس کی بیوی کو سمجھانے کے لیے جانے والے شیرون کے مختلف دوستوں میں سے آٹھ دوستوں کو ایک دوسرے کے شکوک میں اپنی اپنی بیویوں سے طلاقیں لینی پڑیں۔

کچھ یہی معاملہ مشرف اور امریکا کے معاشقے میں پاکستان کے ساتھ ہوا۔ پاکستان کے تمام ادارے اس معاشقے کو کنارے لگاتے لگاتے خود اپنی ہی عزت اور اپنے ہی گھر کو گنوا بیٹھے۔

(محمد طاہر۔ جسارت)

خاموشی کو بیاں ملے

امت الصبور

صفیہ عباس۔۔۔۔ کروڑ لعل عین (لیہ)

آج تو دل کی بات کہنے دو
آج کی شام تو ہماری ہے

1۔ تعارف: میرا نام صفیہ عباس ہے۔ تاریخ پیدائش 21 جنوری اور اسٹار دلو ہے۔ ایم اے کر چکی ہوں۔ اور میرا پسندیدہ مشغلہ مختلف کتابیں پڑھنا ہے۔ جن میں شاعری، ڈائجسٹ اور مذہبی کتابیں شامل ہیں۔ اور اب سے آپ کے ڈائجسٹ میں شرکت کرنا بھی اہم مشغلہ ہے۔ ڈائری لکھنا بھی پسند ہے۔

2۔ خوبیاں اور خامیاں: جو لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں بہت مخلص اور کیئرنگ ہوں اور جو مجھے ٹھیک سے نہیں جانتے، وہ مجھے مغرور کہتے ہیں۔ کیونکہ میں بہت کم دوست بناتی ہوں مگر جو بناتی ہوں ان سے نبھاتی بھی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میری سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ میں بہت زیادہ حساس ہوں۔ ایک بات کو کئی کئی دن سوچنا میری عادت ہے اور دوسری خامی یہ ہے کہ میں دوسروں پر بہت جلد بھروسا کرلیتی ہوں اور پھر دھوکا بھی کھاتی ہوں۔ میں اپنا خیال رکھنے کے معاملے میں بہت لاپروا ہوں۔

3۔ خواتین سے وابستگی: خواتین سے تعلق پرانا ہے۔ 8th کلاس میں تھی جب سے پڑھ رہی ہوں اور ڈائجسٹ پڑھنا وہ واحد چیز ہے جس سے میں کبھی بور نہیں ہوتی۔ فرق یہ ہے کہ پہلے بھائی سے چھپ کر ڈائجسٹ پڑھتی تھی کیونکہ وہ لے کر پھاڑ دیتے تھے یا اپنے بریف کیس میں رکھ کے لاک کر دیتے مگر ہم بہنیں اس میں سائیڈ سے ہاتھ گھسا کے ڈائجسٹ نکال لیتیں۔ مگر اب بھائی کے سامنے بھی پڑھیں تو بھائی کچھ نہیں کہتے۔ مجھے بہت کم ناول یا اسٹوریاں متاثر کرتی ہیں پہلا ناول جو میں نے مکمل پڑھا وہ "پیر کامل" ہے اس کے بعد "جنت کے پتے" اور "زمین کے آنسو" مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ مجھے خود کہانی لکھنے کا شوق ہے مگر ابھی تک ہمت نہیں کی۔

4۔ سالگرہ: گھر میں بہن بھائیوں کی تعداد ماشاء اللہ زیادہ ہے تو امی جان کو یاد نہیں کہ کون کب آیا تھا اور تو اور میری سالگرہ کا بھی پتا نہیں (یہ تو یاد رکھنا چاہیے تھی نا؟) اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق یوم پیدائش 21 جنوری ہے۔ پہلے تو کبھی نہیں منائی تھی مگر 2012ء اور جنوری 2013ء میں میری فرینڈز اور اسٹوڈنٹس نے میری سالگرہ منائی تو بہت اچھا لگا۔ ویسے میں سمجھتی ہوں، سالگرہ منانا اتنا ضروری نہیں بس کوئی وش کردے تو اچھا لگتا ہے کہ کسی کے لیے ہم اتنے اہم ہیں کہ اسے ہماری سالگرہ یاد ہے۔

5۔ پسندیدہ اقتباس: خوبصورت تعلق کو کوئی نہ کوئی نام دے دینا چاہیے۔ بے معنی رشتوں کی وقعت وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوجاتی ہے۔

6۔ پسندیدہ شعر: شاعری مجھے بہت پسند ہے اور اس سے دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ شعر تو بہت سارے پسندیدہ ہیں مثلاً"

تمام رات میری خواب گاہ روشن تھی
کسی نے خواب میں اک پھول دے دیا تھا مجھے

وصال و ہجر یکساں ہیں، وہ منزل ہے اب چاہت میں
میں آنکھیں بند کرکے تجھ کو اکثر دیکھ سکتی ہوں

بن مانگے ہی مل جاتی ہیں تعبیریں کسی کو فراز
کوئی خالی ہاتھ رہ جاتا ہے ہزاروں دعاؤں کے بعد

امید ہے کہ آپ کو میرا تعارف پسند آیا ہوگا اور میرے خط کو طویل جان کر نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔

عدنان

نفسیاتی و ذہنی الجھنیں

مجھے خوشی ہے کہ بہنیں میری باتیں سنتی ہیں' پڑھتی ہیں۔ ان پر عمل کرتی ہیں اور اپنے لیے زندگی کے سیدھے راستے اختیار کرتی ہیں۔

کچھ ذہنی اور نفسیاتی مریض فرار کی سستی راہیں اختیار کرتے ہیں اور اپنے غموں' ناکامیوں اور پریشانیوں کا علاج تمباکو نوشی' شراب' چرس' ہیروئن یا سکون آور گولیوں میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ شراب کے جام چڑھا کر سگریٹ کے چند پیکٹ پھونک کر اپنا علاج تلاش کرتے ہیں حالانکہ یہ اعصابی' ذہنی اور جسمانی کینسر کی حد تک بیماریوں کو اپنا محنت کا پیسہ خرچ کر کے دعوت دیتے ہیں۔

اگر آپ کسی ذہنی یا نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں تو اس کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ چند سال پہلے مجھے ایک اسپتال میں ایسے مریض دیکھنے کو ملے۔ اگرچہ اسپتال کا ماحول اچھا نہیں تھا' گندگی بھی تھی لیکن طریقہ' علاج درست تھا۔ اس میں ہر طرح کا نشہ کرنے والے مریض' مرد اور عورتیں تھیں۔ ایسے اسپتالوں کا ماحول اچھا ہی نہیں' بہت اچھا ہونا چاہیے۔ صاحب توفیق لوگوں کو اس طرف خرچ کرنے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ چاہے زکوۃ خیرات ہی میں سے کریں۔ اس سے بہت سے گھروں کے چشم و چراغ' بیویوں کے شوہر اور بچوں کے باپ بچ سکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ہر ماہ ایک بڑی تعداد ایسے خطوط کی ہوتی ہے' جس میں عورتیں شکایت کرتی ہیں کہ ان کے شوہر دوسری عورتوں میں دلچسپی لیتے ہیں یا ان کی ذات میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ عموماً" اس میں قصور مردوں کا ہوتا ہے۔ بہت سے مرد فطرتاً" اچھے نہیں ہوتے اور انہیں نت نئی دلچسپیوں کی تلاش رہتی ہے' لیکن میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ بہت حد تک ان حالات میں بیوی بھی قصوروار ہوتی ہے۔

جو مرد عام طور پر جذباتی اور حساس ہوتے ہیں' وہ محبت کے شیدائی ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی ان سے اسی گرمجوشی کا برتاؤ کرے' جس کے وہ متوقع ہیں' لیکن ہوتا یہ ہے کہ شادی کے بعد لڑکیاں یہ سمجھ لیتی ہیں کہ اب انہیں اپنی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اپنی ذات اور اپنے سنگھار سے بے پروا ہو جاتی ہیں۔ گھرداری میں لگ کر سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گھر کے کام کاج میں اتنی فرصت نہیں ہوتی' لیکن خود کو بھولنے کی صورت میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شوہر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی کو میری پروا نہیں۔ وہ بھی باہر دلچسپیاں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ صورت حال مزید تازیانہ ثابت ہوتی ہے' چنانچہ وہ اور کڑھ کڑھ کر اپنی صحت کو گھن لگا لیتی ہے۔

بیوی سوچتی ہے کہ میں کھانا پکاتی ہوں' کپڑے دھوتی ہوں' گھربار دیکھتی ہوں' بچوں کی پرورش کرتی ہوں' لیکن اس کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں؟

درحقیقت یہ سب باتیں اپنی جگہ اہم ہیں' لیکن محبت کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شوہر کو اتنی اہمیت' اتنی محبت دیجیے کہ وہ آپ کے علاوہ کہیں بھی مطمئن نہ ہو سکے۔

عروج......

میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے غصہ بہت آتا ہے' ہر بات جو محض ذرا سی ناگواری کا باعث بنتی ہو' مجھے اس پر شدید غصہ آجاتا ہے۔ میں خود پر کنٹرول نہیں رکھ پاتی۔ امی سمیت اکثر گھر کے بڑوں سے لڑ پڑتی ہوں۔ پھر بہت روتی ہوں' ارادہ باندھتی ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گی مگر پھر..... عدنان بھائی! میرا ایسا رویہ صرف میرے گھر والوں کے ساتھ ایسا ہے۔ گھر سے باہر مجھے بہت بااخلاق سمجھا جاتا ہے۔ میں دیگر لوگوں کی اچھی خاصی ناقابل برداشت باتیں سہ جاتی ہوں۔ مگر پتا نہیں کیوں..... میں گھر والوں کی کوئی بات برداشت نہیں کر پاتی۔ ویسے میری بات ناجائز نہیں ہوتی۔ میرے بھائی بہت تعلیم یافتہ ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے میرے انداز میں تہذیب جھلکتی ہے۔ جبکہ میرے گھر کی خواتین ناخواندہ ہیں۔ میں انہیں چغلیاں کرنے سے روکتی ہوں تو وہ مجھے گستاخ کہتی ہیں۔ یہیں مجھے غصہ آجاتا ہے اور میں خود پر قابو نہیں رکھ پاتی۔

ج۔ اچھا انسان وہی ہے جو اپنے غصے پر قابو پالے۔ جس نے اپنے غصے کو کنٹرول کیا' گویا اس نے دنیا فتح کرلی۔ آپ تو ابھی بہت چھوٹی ہیں۔ آپ کو جب بھی غصہ آئے' آپ دو تین گھونٹ پانی پی لیا کریں۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر پندرہ سے بیس منٹ میں گلاس خالی کریں۔ آپ کا تمام غصہ پانی کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔

ص۔ م

یہ تو عجیب بات ہوئی کہ جب جی چاہا ہاں کردی' اور جب جی چاہا نہ کردی۔ اور پھر کسی بات پر مچل گئے۔ یہ تو تلون مزاجی ہے۔ کسی ذی شعور آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس قسم کی باتیں کرے' محبت تو ایک مقدس جذبہ ہے' جن سے انسان محبت کرتا ہے' ان سے سخت یا تلخ گفتگو نہیں کرتا۔ نہ دھمکی دیتا ہے اور نہ انتقام کی باتیں کرتا ہے۔ بلکہ ان کی دل سے قدر کرتا ہے' ان کے لیے ہمیشہ اچھے انداز میں سوچتا ہے۔ ان کی خیروعافیت اور اچھی زندگی کے لیے دعائیں کرتا ہے۔

اس کو سمجھائیں کہ وہ اپنے سوچنے اور کرنے کے انداز کو محبت کے انداز میں ڈھالے۔ اگر کوئی مل جائے تو خدا کا شکر ادا کرے' نہ ملنے کی صورت میں اس کے لیے نیک دعائیں کرے' بس اسی کا نام زندگی ہے۔

"میں بچپن سے نفسیاتی مریضہ ہوں۔" آپ کے خط کا آغاز اس جملہ سے ہوا ہے' پہلی بات تو یہ کہ آپ کو بچپن میں اس بات کا علم کیسے ہوا کہ آپ نفسیاتی مریضہ ہیں اگر کسی کو بہت زیادہ غصہ آتا ہے یا کسی قسم کے دورے پڑتے ہیں تو اس کا لازمی سبب یہ نہیں ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ کیا آپ نے کبھی کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیا؟ کوئی دوائیں استعمال کیں؟

یہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ آپ کی بہن کو کس قسم کے دورے پڑتے ہیں اور یہ کوئی لاعلاج بیماری بھی نہیں ہے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔

جہاں تک بددعا کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ آپ نے اپنی بہن کو غصہ میں بددعا دی تھی جبکہ دل سے آپ اس کا برا نہیں چاہتی تھیں' یہ بات دل سے نکال دیں کہ یہ جو بھی ہوا ہے' آپ کی بددعا کی وجہ سے ہوا اور اگر بددعا سے ہوا بھی ہے تو آپ اب کے لیے دعا بھی تو کر رہی ہیں کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس کی شادی ہو جائے۔

—— آپ اگر خود کو مریض سمجھتی ہیں تو کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا اور اپنی بہن کا علاج کرائیں۔ اپنی بہن کی پرسنالٹی پر توجہ دیں۔ مناسب لباس اور اچھے انداز و اطوار سے شخصیت میں کشش پیدا کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے آپ کی بہن ٹھیک ہو جائے تو وہ لڑکا رشتہ نہ توڑے ویسے بھی اس کے گھر والے اس رشتہ کو توڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ آپ کی بہن کا علاج کرایا جائے۔ ورنہ آگے مزید پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں۔

شاہدہ پروین.... کراچی

س - میرا کام ایسا ہے کہ مجھے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ گرمیوں میں دھوپ میں چل چل کر میری جلد بری طرح جھلس جاتی ہے۔ چہرا گردن اور کلائیاں کالی پڑ گئی ہیں جبکہ پہلے میرا رنگ بہت صاف تھا۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے میرا رنگ صاف ہوجائے۔

ج - شہد بہترین جراثیم کش ہے۔ نیوزی لینڈ میں نوجوان طلبہ پر تجربہ کیا گیا جن کے چہرے پر کیل مہاسے تھے۔ ان کے چہرے پر شہد کی کریم جب چہرے کے ایک طرف لگائی گئی تو پتا چلا کہ جس طرف شہد لگایا گیا تھا۔ اس طرف کی جلد دانوں اور مہاسوں سے صاف ہو گئی۔ زخم پر شہد لگانے سے بھی زخم جلد مندمل ہوجاتا ہے۔

دھوپ کی شدت سے مرجھائی اور جھلسی ہوئی جلد کے لیے شہد کا ماسک اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ماسک ہر قسم کی جلد کی حامل خواتین استعمال کرسکتی ہیں۔

شہد اور بیسن ہم وزن ایک پیالے میں لیں اور اچھی طرح مکس کریں' تاکہ یہ آمیزہ کریم کی طرح گاڑھا ہوجائے۔ اب اسے چہرے اور گردن اور بازوؤں پر لگائیں۔ تقریباً" بیس منٹ لگا رہنے دیں۔ پھر ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ یہ عمل دہرائیں۔

ایک بہن.... کراچی

س - ویسے تو میں مجسم مسائل ہوں۔ لیکن میرا سب سے بڑا مسئلہ موٹاپا ہے۔ میری عمر اٹھارہ سال ہے اور وزن اپنی عمر کے حساب سے دوگنا ہے۔ میں کالج میں پڑھتی ہوں اور موٹاپے کی وجہ سے مجھے ہر جگہ بہت شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ ڈائٹنگ تو میں ویسے بھی کرتی ہوں' کوئی ایسی ورزش بتائیے کہ جب میں دوبارہ کالج جاؤں تو سب کو نمایاں فرق محسوس ہو۔

میرا دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میری گردن' ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیانی جوڑ اور کہنیاں بہت کالی ہیں۔ پلیز انہیں صاف کرنے کے لیے کوئی طریقہ بتادیں۔ باجی میرے بال بہت ہلکے' روکھے اور بے جان ہیں۔ بالوں میں خشکی بھی ہے۔ بالوں کو لمبے اور گھنے کرنے کا کوئی طریقہ بتادیں۔

باجی میرا رنگ گہرا سانولا ہے اور میرے اوپر والے ہونٹ کے اوپر رواں بھی ہے جسے میں تھریڈنگ وغیرہ کے ذریعے صاف نہیں کرنا چاہتی' اس کے لیے اور رنگ گورا کرنے کے لیے کوئی گھریلو ٹوٹکا بتائیں۔

ج - موٹاپا کم کرنے کے لیے کھانے پینے میں احتیاط کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ سب سے پہلے تو کیک پیسٹری اور بیکری کی اشیا کھانا کم کریں۔ کھانے سے پہلے پیٹ بھر کر سلاد کھائیں اور سب سے ضروری بات قبض نہ ہونے دیں اور دن میں کم از کم چوبیس بار سیڑھیاں چڑھیں اور اتریں۔ اس سے آپ ایک ماہ میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

کہنیوں اور انگلیوں کے جوڑوں پر آپ لیموں کے چھلکے سے مساج کریں' صاف ہوجائیں گے۔

بالوں کے لیے آپ ہفتے میں صرف ایک بار شیمپو کریں۔ باقاعدگی سے تیل لگائیں اور روزانہ ایک سیب چھلکوں سمیت کھائیں' بال خوب صورت اور جان دار ہوجائیں گے۔ چہرے کا رواں صاف کرنے کے لیے ابٹن کو پانی میں گھول کر لگائیں۔ جب سوکھ جائے تو رگڑ کر اتار دیں۔ رنگ گورا ہوجائے گا اور بال بھی کم ہوجائیں گے۔